

یہ کہہ کر ڈوب گیا آفتابِ عاشورہ، تاحشر رہے گی روشنی حسینؑ کی

اکتوبر 2015ء

اردو ڈائجسٹ

www.urdu Digest.pk urdu Digest.com

سیکڑوں مسلمانوں کا سفاک قاتل
سوامی اسیم آندرہا ہو جائے گا؟
صفحہ ۲۵

ترکی کی جیل میں قید
پاکستانی نوجوان کا
درد بھرا خط
صفحہ ۲۳

در درز بھٹکنے والی اکھوں تباہ حال
پناہ گزینوں کو یورپ
میں سہارا مل سکے گا؟
صفحہ ۱۱۲



اکتوبر 2015ء

اردو ڈائجسٹ

قیمت: 100 روپے

رجسٹرڈ نمبری پی ایل 32

سمندری نمک

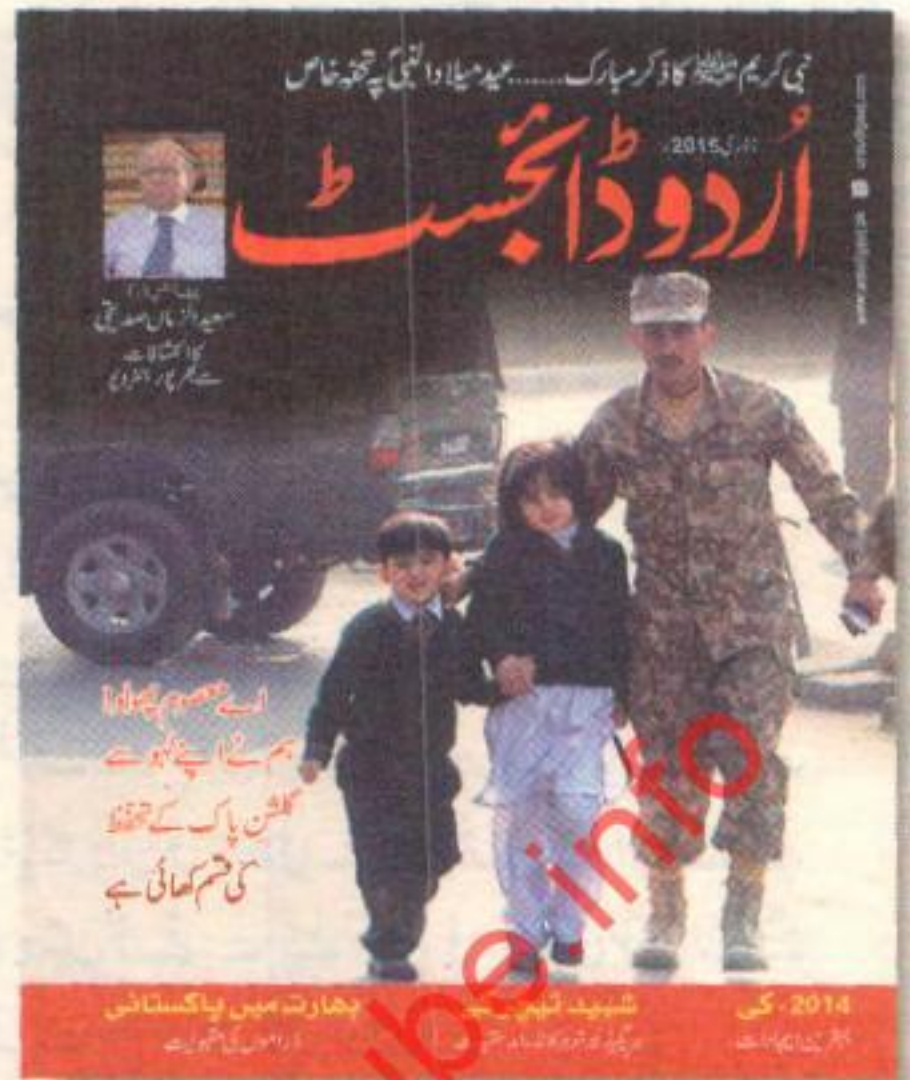
شرارتی جاوید میاں داد

ایک دہریہ اور خدا

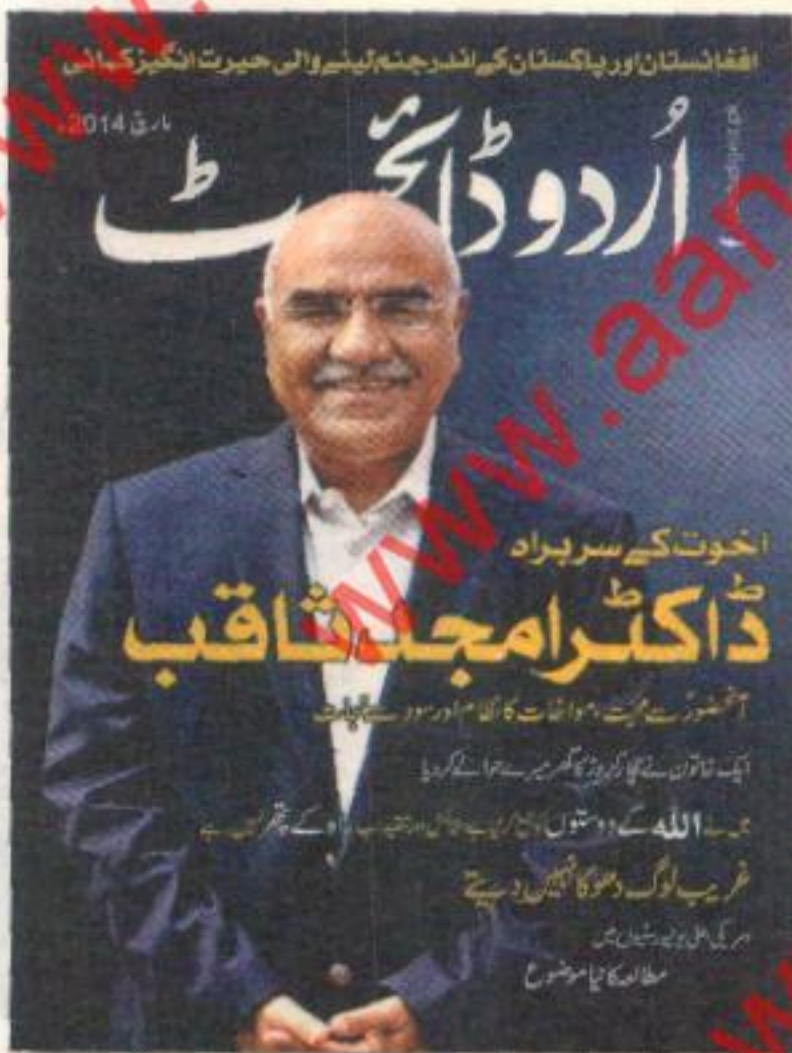
۳۱۸ موڈی پیاریوں کا تیرہ ہدف علاج

۳۷ ممتاز آسٹریلوی کھلاڑی، آئن چیمپل کی دلچسپ یادیں

۳۹ پہاڑوں پر رونما ہوئے عجوبے کی پڑاثر کہانی



اپنے بچوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو ادب سے روشناس کرائیے، آپ گزشتہ شمارے اپنے دوستوں کو تحفہً بھی بھیجوا سکتے ہیں، یہ سہولت اندرون و بیرون ملک دونوں کے لیے میسر ہے۔



۶۰۰ روپے	۱۲ شمارے
۱۰۰۰ روپے	۲۴ شمارے
۱۵۰۰ روپے	۳۶ شمارے
ڈاک خرچ یا کوریئر چارج اس کے علاوہ ہوں گے	

نوٹ: یہ پیش کش صرف گزشتہ 3 سال کے شماروں کے لیے ہے

اردو سے محبت کریں
اردو ڈائجسٹ پڑھیں

اشاک محمود
پہلے آئیے
پہلے پائیے

325 G-III جوہر ٹاؤن لاہور فون: 042-37589957, 35290738

اکتوبر 2015ء

اردو ڈائجسٹ 05

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اللہ کا قرآن

جو فساد کرنے کو دوڑتے ہیں

”جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے لڑائی کرتے ہیں (ان کے احکامات سے بغاوت کرتے ہیں) اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے ہیں اُن کی سزا یہی ہے کہ اُن کو قتل کر دیا جائے یا سولی چڑھا دیے جائیں یا ایک طرف کے ہاتھ اور ایک طرف کے پاؤں (داہنا ہاتھ اور بائیں پاؤں) کاٹ دیے جائیں یا ملک سے نکال دیے جائیں، یہ دنیا میں اُن کی رسوائی ہے اور آخرت میں اُن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ ہاں جن لوگوں نے تمہارے قابو میں آنے سے پہلے توبہ کر لی، تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“ (گرفتاری کے بعد توبہ کرنے سے سزا معاف نہیں ہوگی)

(سورۃ مائدہ آیت ۳۲-۳۳)

رسولؐ کا فرمان

اللہ کے ناپسندیدہ تین لوگ

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”تین شخص ایسے ہیں کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ نہ اُن کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھے گا اور نہ اُن کو گناہوں سے پاک کرے گا اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ایک وہ شخص جس کے پاس بحالت سفر اپنی ضرورت سے زائد پانی موجود ہو اور وہ دوسرے مسافر کو دینے سے انکار کر دے۔ دوسرا وہ شخص جس نے امام کی بیعت محض دنیاوی اغراض و مفادات کی خاطر کی ہو۔ تیسرا وہ شخص جو بعد از عصر اپنا سامان تجارت لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور جھوٹ کہتا ہے: اُس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے یہ مال اتنے داموں میں خریدا ہے اور لوگ اسے سچا سمجھ لیتے ہیں۔ پھر آپؐ نے سورۃ آل عمران کی آیت تلاوت فرمائی۔ وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ قیامت کے روز ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا بلکہ ان کے لیے سخت دردناک عذاب ہوگا۔“

(روایت حضرت ابو ہریرہؓ۔ بخاری کتاب ۳۲ باب ۵ مسلم کتاب الایمان، باب ۴۴)



ریٹیل کاروبار آسان!



ریٹیل سافٹ ویئر

لیومن سافٹ ٹیکنالوجیز کا تیار کردہ سافٹ ویئر کیسٹڈا سنگل اور چین سٹور میں مارکیٹ کیسٹڈا مانتا جاتا ہے۔ کیسٹڈا پاکستان کے 88 شہروں میں 3500 سے زائد مقامات پر کامیابی سے چل رہا ہے۔ چین سٹور والے 150 سے زائد ادارے کیسٹڈا کی مدد سے ملک کے طول و عرض میں پھیلی اپنے ادارے کی شاخوں کا انتظام چلا رہے ہیں۔ کیسٹڈا کی مدد سے سینہ ادارے کم از کم انویسٹمنٹ اور سٹاک رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کر رہے ہیں۔

گارمنٹس، جوتوں، گرامری، شیشری، فارمیسی اور ہر قسم کے کاروبار کے لئے یکساں کارآمد سنگل اور چین سٹور کے لئے

خصوصی ڈسکاؤنٹ
1000/-
رہے

اس اشتہار کو ساتھ لے کر کمپنی کے لئے



ISO 9001:2008
Certified



- مکمل بار کوڈ سسٹم
- سیل، پرچیز اور سٹاک کی مکمل رپورٹس
- گاہک اور سپلائر کے کھاتوں کا مکمل حساب
- سٹاک اور کیش کی پڑتال کرنا اور چوری روکنا
- دکاندار کا کمپیوٹر ماہر ہونا ضروری نہیں



Lumensoft Technologies (Pvt.) Ltd.
Mobile: 0321-4220123

042-111-290-290

www.lumensoft.biz



ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

عراق، یمن، لیبیا اور شام کی مسلسل بگڑتی صورت حال نے قریباً ساڑھے چار کروڑ افراد کو بے گھر کر دیا ہے۔ خطے کے حالات دن بدن پیچیدہ اور خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ دنیا بھر کی طاقتیں بشمول اسلامی ممالک پنجہ آزمائی میں

مصروف ہیں۔ تازہ انٹری روسی صدر پوٹن کی ہے جنہوں نے شام کے مسئلے پر اسرائیلی قیادت سے ملاقات کر کے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ لاکھوں مسلمان پناہ گزین اپنا وطن چھوڑنے اور محفوظ مقام تک پہنچنے کے لیے یورپ کا رخ کرنے پر مجبور ہیں۔ راستے کی تکالیف اور سرحدوں پر کھڑے سکیورٹی عملے کے بے رحمانہ طرز عمل کی وجہ سے ان گنت معصوم اور قیمتی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔

جنگ عظیم اول کے بعد یہ سب سے بڑی ہجرت ہے۔ مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر ہر دل پریشان اور خون کے آنسو رو رہا ہے۔ دوسری طرف فریضہ حج کے دوران اوپر تلے رونما ہونے والے افسوس ناک سانحات نے مسلم اُمہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہوٹل میں آگ لگنے، گرین کرنے اور بھگدڑ کے نتیجے میں جہاں احرام میں ملبوس ہزاروں حجاج کرام کی قیمتی جانوں کا ضیاع ہوا، وہیں منیٰ اور حرمین شریف جیسے مقدس مقامات کی حرمت کو بھی نقصان پہنچا۔

ایک دوست کو فون ملا، تو پتا چلا کہ وہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے مدینہ منورہ میں ہیں۔ انھیں ادائیگی حج کی مبارکباد دینے سے پہلے ان کی خیریت دریافت کی تو انھوں نے بتایا کہ وہ منیٰ میں بھگدڑ کے وقت بالائی منزل پر تھے اور انھوں نے سارا منظر دیکھا۔ ان کے مطابق یہ سانحہ پروٹوکول کی وجہ سے پیش آیا۔ ”شیطان“ تک پہنچنے کے لیے طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے جس پر سائبان نام کی کوئی چیز نہیں۔ سورج کی تپش اور بے پناہ ہجوم کی وجہ سے حجاج کرام سخت آزمائش سے گزرتے ہوئے شیطان تک پہنچنے کی کوششوں میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک ہجوم کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا۔ جوں جوں وقت گزرا، گرمی اور دم گھٹنے کی وجہ سے حجاج میں اضطراب اور بے چینی بڑھتی گئی۔ کچھ حجاج کرام صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے اور دائیں بائیں نکلنے کی کوشش کرنے لگے جبکہ بقیہ نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ یہی عمل

اکتوبر 2015ء

ذوالحجہ 1436ھ

جلد نمبر 55 شمارہ نمبر 10

urdudigest.com www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی

ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی

اسٹنٹ ایڈیٹر: عاصم محمود

سب ایڈیٹر: محمد اسلم اودھی، غلام سجاد

مجلس تحریر: حافظ افروغ حسن، نوید اسلام صدیقی، سلٹی اعوان

مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی

انچارج کمیونیکیشن: افغان کامران قریشی

پروف خواں: خالد محی الدین

ڈیزائنر و کمپوزر: عبدالرحمن، اشرف سکندر

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com

مینجر ایڈورٹائزمنٹ: 0300-4005579

لاہور: ندیم حامد

سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ

subscription@urdu-digest.com خریداری کے لیے رابطہ

19/21 ایکٹر سکیم، سمن آباد، لاہور فون: 92 42 37589957

پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں اردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

بیرون ملک 60 امریکی ڈالر

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ

درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380

Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)

Branch Code No. 110

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

ادارتی آفس

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731

ای میل: editor@urdu-digest.com

قیمت: 100 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24 سیکرٹریٹ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

در در بھٹکتے لاکھوں تباہ حال

پناہ گزینوں کو یورپ
میں سہارا مل سکے گا؟

114

سید عاصم محمود



بھگدڑ کی سب سے بڑی وجہ ثابت ہوا۔
ایسے سنگین حادثات کے رونما ہونے کے بعد ابتدائی طبی امداد دینے
اور ریسکیو عملے کی غفلت، بے پرواہی اور لواحقین تک اطلاعات کی رسائی
کے نظام کے ناکام ہونے کے باعث سعودی حکومت کی کارکردگی پر
سوالیہ نشان لگ چکے ہیں۔

مدینے میں موجود حاجی دوست نے بتایا کہ حجاج کو ایک وی آئی پی
شخصیت کو پروٹوکول دینے کی خاطر روکا گیا تھا۔ میری دعا ہے کہ یہ بات
درست نہ ہو، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے مسلمان
حکمران پروٹوکول کے بھوکے ہیں۔ ہم اپنے ملک میں سڑکوں، ہوائی
اڈوں اور ہر تقریب کے موقع پر اس پروٹوکول کی اذیت آج تک بھگت
رہے ہیں۔ تمام سرکاری اور سیاسی شخصیات اپنے اختیارات اور خواہش
کے مطابق جیسے چاہیں ”پروٹوکول“ کے نام پر عوام کی زندگی اجیرن کر دیتی
ہیں۔ ٹریفک گھنٹوں کی رہتی ہے چاہے کسی مریض کو اسپتال پہنچانا ہو یا
کسی کو کوئی بھی ہنگامی صورت پیش ہو۔ جب تک بادشاہ سلامت کی شاہی
سواری بحفاظت گزر نہ جائے، ٹریفک نہیں کھولی جاتی۔ اس دوران عوام کا
غصہ اور اضطراب بددعاؤں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور حکمرانوں کے لیے
نفرت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس دوران اموات ہو جانا بھی معمول بن چکا۔
سعودی حکومت اربوں ڈالر کے کثیر سرمایہ سے حرمین شریف کی
توسیع اور ٹرین کے نظام کے ذریعے حجاج کرام کے لیے سفر میں آسانی کی
کوششیں کر رہی ہے جو یقیناً قابل تحسین ہے۔ لیکن سعودی سوشل میڈیا پر
شہزادوں اور حکمرانوں کو پروٹوکول دینے کے کلپس سیکڑوں شہداء کے لواحقین
کے زخموں پر نمک پاشی کا کام دے رہے ہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں
اپنے حکمرانوں کے لیے نفرت بڑھ رہی ہے۔

یہ وقت آپس میں اختلافات کو ہوا دینے کا نہیں بلکہ متحد ہو کر تمام
چیلنجز کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ماہرین اور علما کی کمیٹی بنا کر ان حادثات کی تیزی
سے تحقیقات کر کے مستقبل میں حادثات سے بچنے کی تدابیر کرنا ہوں گی۔
حج اور عمرہ کے ذریعے ناجائز منافع کمانے والے تاجروں اور کرپٹ متعلقہ
افراد کا سختی سے محاسبہ لازم ہو چکا۔ ہمارا دین تو امیر اور غریب، کمزور اور طاقتور
کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتا۔ ہمارے پیارے نبی کی تعلیمات تو ہرگز ایسی
نہیں۔ بڑی بڑی گاڑیاں، محلات اور پروٹوکول آخرت میں کامیابی کی
ضمانت نہیں، بلکہ دنیا میں ذلت کا باعث بن سکتی ہیں۔ آخر ہمارے حکمران
کب یہ سچائی جان پائیں گے؟..... بقول: علامہ اقبالؒ

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی

ثریا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا

طیب! مساجد فرسینہ

پڑھے، پڑھا لے، سیکھے اور لطف اٹھائے

کچھ اپنی زبان میں

قومی حکمت کے خلاف ایک غیر ضروری بحث

اسلامی زندگی

15 الطاف حسن قریشی

17 جب امام عالی مقام شہید ہوئے..... اور انصاف و حق کا اجلاد امن داغ دار ہو گیا

41 اعتدال..... افراط و تفریط سے بچانے والی اللہ پاک کی محبوب بشری صفت

43 تواضع..... انسانوں پر خوشگوار زندگی کا راز عیاں کرنے والی چشم کشا تحریر

جرم و سزا

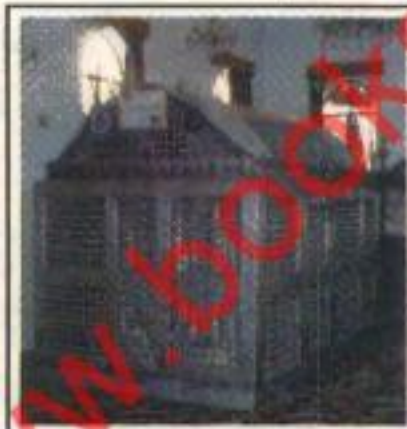
61 قسمت..... وہ قیمتی دولت جسے دنیا کا شاطر ترین چور بھی نہیں چرا سکتا

71 ٹھیلے والا شہزادہ..... جاہ و شہرت سے غربت تک کے کٹھن سفر کا عبرت نامہ

یاد رفتگان

29 نو جوانوں کا ناقابل فراموش محسن..... آغا افضل حسین کی یاد میں

47 ظہور نظر فن اور شخصیت..... مشہور شاعر پر ایک منفرد کتاب کا تبصرہ



حضرت جنید بغدادیؒ

ممتاز صوفی بزرگ کی داستان حیات
کلیم چغتائی

37

مکتوب حضرت علیؓ

حکمرانوں کو راہ حق دکھانے
والی تاریخی دستاویز

33



162 مجازی خدا..... مرحوم شوہر کو بیوی کا جذبات و احساسات سے بھرپور خراج تحسین

191 جنہیں پہلا نشان حیدر ملا..... شہید کے مقام پر خوش قسمت لوگ ہی پہنچ پاتے ہیں

عالمی منظر نامہ

25 سیکڑوں مسلمانوں کا قاتل، سوامی اسیم آنند..... کیا یہ سفاک قاتل رہا ہو جائے گا

123 پاکستانی نو جوان کا درد بھرا خط..... دیار غیر جانے والے نو جوانوں کے لیے عبرت نامہ



مٹی میں چراغ رکھ دیا

والدہ کے حضور بیٹے کا نذرانہ عقیدت
محمد توفیق

55

جاوید میاں داد

مشہور آسٹریلوی کپتان کی نظر میں

87

آئن چیپل





ماں کی جیت

ایک غریب علم دوست گھرانے
کی سبق آموز داستان

خالد ارشاد صوفی

91

مجھے کوئی

شام ادھار دو

نئی نسل کے پسندیدہ شاعر کا پُر اثر کلام

164

ایم اے لودھی



معاشرتی کہانیاں

- ظالموں کی حمایت..... انسانی حقوق کی علمبردار تنظیموں سے ایک منصف کا سوال
متاع بے بہا..... ایک گناہ گار لڑکی کی قصہ عبرت جس نے خودکشی کر لی
جیسی کرنی ویسی بھرنی..... مال کی ہوس نے انھیں دنیاوی نعمتوں سے دور کر دیا
لندن کی راجندر کور..... انگلستان میں مقیم ایک سکھنی کی دلدوز کتھا
جینے کی دعوت..... زندگی اور محبت اتنی ہی بڑھتی ہے جتنا ہم خرچ کرتے ہیں
بٹی کی فریاد..... مصیبت کی ماری ماں کا ماجراجے غصیلی بہو ٹکرا گئی
- 23 جسٹس (ر) بن یامین
45 جویریہ شریف
147 ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل
157 ذکیہ علی بیگ
167 شبانہ یونس
197 خدیجہ ارشاد



سمندری نمک

معدنیات کا خزانہ اور کئی بیماریوں کا علاج

ڈاکٹر خورشید انور

218

سرکاری اسپتال کے

اذیت خانے میں

چشم کشاد داستان

109

سجاد قادر



قبول اسلام

- اقبال حسین علیم بننے تک..... ایک تعلیم یافتہ اور امیر سکھ کی مسلمان بننے کی ایمان افروز کہانی
دلچسپ معلومات
کونج..... ایک خوب صورت پرندے کا ماجراجو پاکستان میں ملتا ہے
کسی پنوں..... غریب دھوبن اور نو جوان شہزادے کے عشق کی لافانی سرگزشت
عالمی ادب
آزمائش..... جب ایک بیوہ نے اپنے محبت کرنے والے شوہر کا کٹھن امتحان لیا
- 150 ریاض احمد پروانہ
169 غلام مصطفیٰ سولنگی
185 اشیر عبدالقادر شاہوانی
154 کرٹ مالمود



دھیمے مزاج

کا آدمی

انسان دوست شاعر کی شگفتہ یادیں

آغا ناصر

97

اودھے پور کا

خونی تیندوا

چالاک خونخوار حیوان کی سنسنی خیز کہانی

131

مقبول جہانگیر





انگریزنی جب ساس بنی

ایک پاکستانی بہو کا دلچسپ ماجرا

نوید اسلام صدیقی

80

مان نہ مان میں تیرا مہمان

بن بلائے مہمان کا شگفتہ تذکرہ

77

حبیب اشرف صبوحی



مزاح

- 64 بے چارا خاوند..... بیویوں سے تنگ انگریز خاوندوں نے تحریک چلا دی
- 129 حضرت نامی گرامی..... دور حاضر کے نقاد اعظم کا چٹ پٹا خاکہ
- 207 چچ کا راج..... باورچی خانے میں ملنے والی معمولی چیز کے کمالات پڑھیں اور دنگ رہیں

خاکہ

- 188 علان بالغذا کے بانی..... حکیم دوست محمد صابر ملتانی کی زندگی کے دلچسپ واقعات
- 200 بیگ صاحب..... مشکلات میں مثبت رویہ اپنانے والی رحم دل شخصیت کی دلچسپ داستان



ہیلو یاہ

ایک امریکی کی ناقابل فراموش داستان

آغا گل

49

چمن میں کھلا نیارا پھول

پوتی کی محبت سے سرشار وادے کے جذبات

محمد اسلم لودھی

67



اردو ادب

- 177 صفر..... انسانی جذبات و احساسات عیاں کرتی ایک کرب ناک کتھا

آپ بیتی

- 194 بچے ہمارے عہد کے..... دور جدید میں سرعت سے جنم لیتی تبدیلیوں کا شگفتہ روپ

تعمیرات

- 216 چنیوٹ کی گلزار منزل..... زمین بوس ہوتی تاریخی عمارت کا نوحہ

مستقل سلسلے 210 تبصرہ کتب 229 بوجھ تو جانیں 235 قصہ کوئز 237 چمن خیال



میری بیگم سیاست کی بھینٹ چڑھ گئی

عمران ظہور غازی

143

کیلاش کی طلسماتی وادی

جو دکھوں سے بھر گئی

118

ڈاکٹر آصف محمود جاہ



۲۰۱۴ء کی صبح درندہ صفت دہشت گردوں نے آرمی پبلک اسکول پشاور میں پھول جیسے بچوں اور مرد و خواتین کی زندگی کے چراغ گل کر کے جو قیامت صغریٰ برپا کی تھی اس نے پوری قوم کے اندر اتحاد و وحدت کا زبردست جذبہ بیدار کیا۔ تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین اور عسکری قیادت کے راہنما سر جوڑ کر بیٹھے اور انھوں نے بہت غور و خوض کے بعد ایک بیس نکاتی قومی ایکشن پلان مرتب کیا۔ اس پر عمل درآمد کے لیے مرکزی اور صوبائی سطح پر اسپیکس کمیٹیاں قائم ہوئیں جس میں ہمارے سپہ سالار، جنرل راحیل شریف وزیراعظم کی زیر صدارت باقاعدگی سے شرکت کرتے رہے۔ مختلف اداروں کے مابین بہتر رابطوں اور اعلیٰ ترین سطح سے راہنمائی میسر آنے کی بدولت فوج کو آپریشن ضرب عضب میں زبردست کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ فانا میں دہشت گردوں کا نیٹ ورک ٹوٹ گیا، ان کے اسلحہ خانے اور کمیونیکیشن سسٹم درہم برہم ہوئے، کراچی کا امن بڑی حد تک بحال ہوا اور ہمارے گلی کوچے، بازار اور عبادت گاہیں پہلے کے مقابلے میں اب محفوظ ہیں۔ عالمی زعماء اس حقیقت کا برملا اظہار کر رہے ہیں کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بیش بہا قربانیاں دے رہا ہے اور اس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ قیام امن میں پیش پیش ہے اور اس کے ایٹمی اثاثے پوری طرح محفوظ ہیں۔

اس عظیم الشان کامیابی میں سیاسی اور عسکری قیادت کے مابین پائی جانے والی ہم آہنگی نے کلیدی کردار ادا کیا ہے اور جنرل راحیل شریف اپنی عظیم الشان خاندانی روایات کے تناظر میں ایک قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اس مرحلے پر بعض حلقوں کی طرف سے یہ آواز اٹھائی جا رہی ہے کہ ان کی ملازمت میں توسیع کا آج ہی اعلان کر دیا جائے۔ مطالبہ کرنے والوں میں جنرل پرویز مشرف اور برطانوی جریدہ اکانومسٹ بھی شامل ہیں۔ عوام کے جذبات بھی اپنی جگہ ہیں۔ ہماری نظر میں یہ غیر ضروری بحث ہے جس سے قومی حکمت اور یک جہتی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آئین میں فوجی سربراہان کے تقرر کا ایک نظام کارفرما ہے۔ اس کے مطابق جنرل راحیل شریف کی ریٹائرمنٹ میں تقریباً چودہ ماہ باقی ہیں۔ اسپیکس کمیٹی وقت آنے پر مشاورت سے طے کر سکتی ہے کہ قومی ایکشن پلان کی تکمیل کے مزید تقاضے کیا ہیں۔ آج پاکستان کے ۸۵ فی صد شہری آپریشن ضرب عضب کے حامی اور فوج کی عظیم الشان قربانیوں کے ثنا خواں ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ سارا کام آئین کے دائرے میں ہو رہا ہے اور جنرل راحیل شریف نے اب تک کامل بے نفسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہمارے تجزیے کے مطابق وہ اپنی ملازمت میں توسیع سے ممکن حد تک اجتناب کریں گے کہ اس سے فوج کے اندر بے دلی پھیلتی اور اس کا اسٹرکچر متاثر ہوتا ہے۔ انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ جنرل کیانی کی مدت میں توسیع کے بعد انہیں بڑے بڑے بئرانوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اچھا قائد وہی ہوتا ہے جو اپنے اچھے جاں نشین تیار کرتا ہے۔

الطاف حسن قسری

www.urdudigest.pk • 325-G-III
 +92 42 35291731 • +92 42 35291738
 www.urdudigest.pk • advertisement@urdu-digest.com

Full Classification: ALL PAKISTAN + OVERSEAS 100,000*

BACK COVER TITLE	50,000 MONTHLY
BACK COVER INSIDE	35,000 MONTHLY
TITLE INSIDE	35,000 MONTHLY
FULL PAGE COLOR INSIDE	25,000 MONTHLY
FULL PAGE	15,000 MONTHLY
HALF PAGE	7,500 MONTHLY
TITLE BANNER	25,000 MONTHLY
SIDE BANNER	30,000 MONTHLY
PDP UP	20,000 MONTHLY

Govt Rate applied, approved by PID
 * Print Plus Digital

Technical Data

FULL PAGE
18 x 14 CM
HALF PAGE
9 x 14 CM
COLUMN
3

Mode of Payment

Payment By Cash/TT or Bank Draft in favour of Urdu Digest
 Through Bank of Punjab Branch
 Saminabad Branch code 0110
 Account No 110-800380
 or Online payment on mentioned account detail

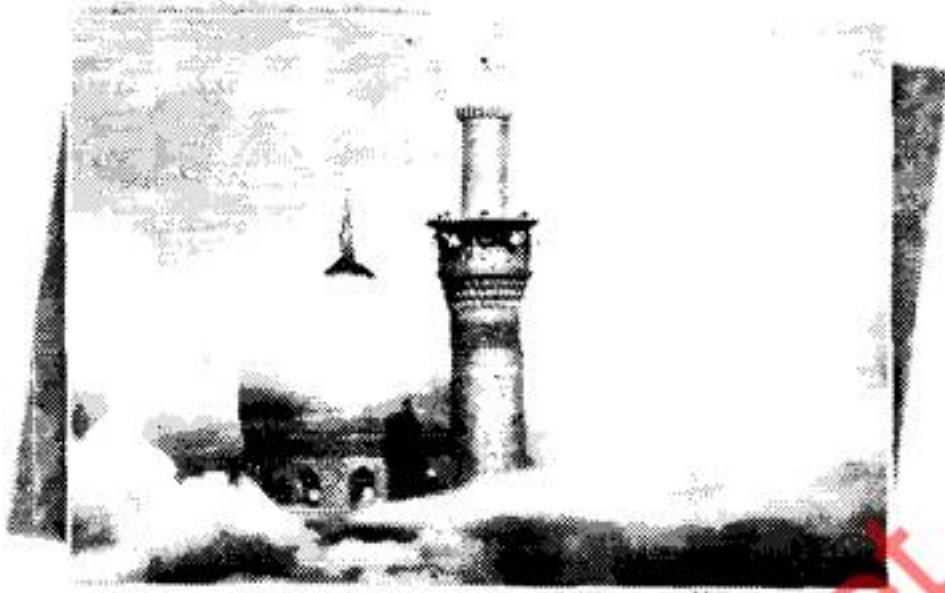
For more Information Contact us Any time: +92 42 35291731

Note: Ads Should be Delivered before 18th of every month

جب امام عالی مقام شہید ہوئے

دشمن نے نواسہ رسولؐ کے لہو سے ہاتھ رنگ کر
حق و انصاف کا اُجلادامن داغدار کر ڈالا

عمر ابو النصر



عقیل بن عون بن عبد اللہ بن جعفر، محمد بن عبد اللہ بن جعفر،
عبدالرحمن بن عقیل اور جعفر بن عقیل بن ابی طالب میدان
کارزار میں نکلے اور شہید ہوئے۔

ان کے بعد قاسم بن حسن بن علیؑ ہاتھ میں تلوار لے کر
میدان میں آئے۔ وہ اس قدر حسینؑ تھے کہ ان کا چہرہ چاند کا ٹکڑا
معلوم ہوتا۔ عمرو بن سعد بن مقبل اسدی نے ان کی گردن پر تلوار
ماری۔ قاسم چلائے ”اے چچا الوداع“ اور زمین پر گر پڑے۔

یہ آواز سنتے ہی حضرت حسینؑ باز کی طرح جھپٹے اور شیر کی
طرح حملہ کر کے عمرو کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ عمرو کی چیخ پکار سن کر
کوئی سوار اسے بچانے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ لیکن گھبراہٹ
میں بجائے بچانے کے اسے اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے
روند ڈالا اور وہ اسی وقت ہلاک ہو گیا۔ جب غبار چھٹا، تو
لوگوں نے دیکھا کہ حضرت حسینؑ قاسم کی لاش کے سر ہانے
کھڑے فرما رہے ہیں:

”اس قوم کے لیے ہلاکت ہو جس نے تجھے قتل کیا۔

قیامت کے دن یہ لوگ تیرے نانا کو کیا جواب دیں گے؟“

اس کے بعد فرمایا ”واللہ تیرے چچا کے لیے یہ سخت

حسرت کا مقام ہے کہ تو اسے پکارے اور وہ تجھے جواب نہ دے

سکے اور نہ تیری کوئی مدد کر سکے۔ افسوس آج تیرے چچا کے دشمن

بہت ہو گئے اور مددگار کوئی بھی نہ رہا۔“ یہ کہہ کر اسے اٹھایا اور

نثار ان حسینؑ ایک ایک کر کے سب شہید ہو چکے

جاں تھے۔ اب صرف خاندان بنی ہاشم کے افراد باقی
رہ گئے تھے۔ وہ بھی دل و جان سے آپؐ پر فدا

ہونے کے لیے تیار تھے۔ سب سے پہلے حضرت حسینؑ کے
بیٹے، علی اکبر (علی بن حسینؑ) میدان میں آئے۔ وہ انیس
برس کے خوب رو اور وجیہہ نو جوان تھے۔ انھوں نے دشمن کے
لشکر پر حملہ کیا۔ حملے کے وقت یہ رجز پڑھتے جاتے:

ترجمہ: ”میں علی بن حسینؑ بن علیؑ ہوں۔ خانہ کعبہ کے
رب کی قسم! ہم نبیؐ کے قرب کے زیادہ مستحق ہیں۔ واللہ
نامعلوم باپ کا بیٹا ہم پر حکومت نہیں کر سکے گا۔“

وہ بجلی کی طرح دشمنوں کی صفوں میں ادھر ادھر پھرتے

شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ آخر مرہ بن منذر عبری نے

نیزے کا وار کر کے انھیں زمین پر گرا دیا۔ ان کا گرنا تھا کہ چاروں

طرف سے دشمن خونخوار بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور

تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہ دل گداز منظر دیکھ کر ان

کی پھوپھی زینبؑ تڑپ کر خیمے سے باہر آئیں اور ”اے میرے

بھتیجے“ کہہ کر علی اکبر کی لاش کے ٹکڑوں پر گر پڑیں۔ حضرت

حسینؑ نے انھیں زبردستی خیمے میں واپس بھیجا اور بیٹے کی لاش

کے ٹکڑے بیٹوں کی مدد سے اٹھوا کر خیمے کے سامنے ڈال دیے۔

علی اکبر کے بعد یکے بعد دیگرے عبد اللہ بن مسلم بن

اپنے بیٹے علی اکبر اور دیگر اہل بیت کی لاشوں کے پاس لٹا دیا۔ اس کے بعد حضرت حسینؑ اپنے خیمے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ عین اس وقت آپ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اسے آپ کے پاس لایا گیا اور آپ اس کے کان میں اذان دینے لگے۔ فوراً ہی بنی سعد کے ایک بد بخت نے ایسا تیر مارا جو بچے کے حلق میں پیوست ہو گیا اور اس کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ حضرت حسینؑ نے اپنے چلو میں اس کا خون بھرا اور اسے زمین پر گرا دیا۔ بعد ازاں اسے بھی دوسرے شہیدوں کے پاس لاکر لٹا دیا۔

اسی دوران عبداللہ بن عقبہ نے ابو بکر بن حسن بن علیؑ کو تیر مار کر شہید کر دیا۔ جب حضرت عباسؑ علمدارؑ نے دیکھا کہ خاندان کے تمام لوگ ایک ایک کر کے فدا ہو گئے، تو انھوں نے اپنے سوتیلے بھائیوں عبداللہ بن علیؑ، جعفر بن علیؑ اور عثمان بن علیؑ سے کہا ”اب تمھارے قربان ہونے کا وقت آ گیا ہے، آگے بڑھو اور اللہ کے راستے میں جانیں دے دو۔“ چنانچہ سب سے پہلے عبداللہ بن علیؑ آگے بڑھے اور شدید لڑائی کے بعد جام شہادت نوش کیا۔ ان کے بعد جعفر بن علیؑ بڑھے، وہ بھی شہید ہوئے۔ ان کے بعد عثمان بن علیؑ میدان میں نکلے، ان پر بنو ابان کے ایک شخص نے حملہ کیا اور ان کا سرتن سے جدا کر دیا۔ بنو ابان ہی کے ایک شخص نے محمد بن علیؑ بن ابی طالب پر حملہ کیا اور انھیں شہید کر دیا۔

اسی دوران اہل بیت کے خیموں میں سے ایک ننھا بچہ نکلا اور خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہانی بن ثویب حضری نے آگے بڑھ کر اسے بھی شہید کر دیا۔

حضرت حسینؑ زخموں سے چور چور ہو چکے تھے اور آپ کو شدید پیاس لگی ہوئی تھی۔ آپ اپنے بھائی عباسؑ کو لے کر دریائے فرات کی طرف چلے۔ دشمن کے سواروں نے آپ کو روکنا چاہا، مگر آپ لڑتے بھڑتے کنارے تک پہنچ ہی گئے۔ برتن میں پانی لے کر پینا ہی چاہتے تھے کہ حصین بن نمیر نے

تیر مارا جو آپ کے گلے میں پیوست ہو گیا۔ آپ نے تیر کھینچا اور اپنے ہاتھ منہ کی طرف اٹھائے، تو دونوں چلو خون سے بھر گئے۔ آپ نے خون آسمان کی طرف پھینکا اور فرمایا:

”اے اللہ! میں تجھی سے شکوہ کرتا ہوں۔ دیکھ، تیرے رسولؐ کے نواسے کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔“

یہ کہہ کر اسی تشنگی کی حالت میں واپس چلے۔ دشمنوں نے نزعہ کر کے عباس بن علیؑ کو آپ سے علیحدہ کر دیا۔ عباس بن علیؑ تن تنہا ان سے لڑنے لگے، مگر کب تک؟ آخر زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر پڑے اور اپنی جان اللہ کے سپرد کر دی۔

حضرت حسینؑ اپنے خیمے کی طرف لوٹ آئے، تو ثمر بن ذی الجوشن کئی سواروں کو لے کر، جن میں ابو الجنوب عبدالرحمن الجعفی، قشعم بن عمرو بن یزید الجعفی، صالح بن وہب الیزنی، سنان بن انس النخعی اور خولی بن یزید الاسجعی شامل تھے، آپ کی جانب بڑھا اور انھیں آپ کے خلاف برا بیچتے کرنے لگا۔ آپ بھی آگے بڑھ کر تلوار کے جوہر دکھانے لگے جس کی تاب نہ لا کر وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے لیکن تھوڑی دیر میں پھر جمع ہو گئے اور آپ کا محاصرہ کر لیا۔

قبیلہ کنده کے ایک شخص، مالک بن بشر نے تلوار سے آپ کے سر پر وار کیا۔ آپ ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ تلوار ٹوپی کو چیرتی ہوئی سر میں جا لگی۔ سر سے خون جاری ہو گیا اور ساری ٹوپی خون سے بھر گئی۔ آپ نے ٹوپی اتاری، سر پر پٹی باندھی اور دوسری ٹوپی اوڑھ کر اس پر عمامہ باندھ لیا۔

خیمے کے اندر سے نو عمر عبداللہ بن حسن بن علیؑ نے جب آپ کو دشمنوں کے نزعے میں گھرا ہوا دیکھا، تو وہ جوش سے بے قابو ہو گیا اور ایک لکڑی لے کر آپ کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ اسی وقت ابن کعب نے حضرت حسینؑ پر تلوار سے ایک اور حملہ کیا۔ عبداللہ بن حسنؑ نے چلا کر کہا: ”اے خبیث! میرے چچا کو قتل کرے گا۔“

یہ سن کر ابن کعب نے بچے پر تلوار چلائی۔ بچے نے اپنے

نے یہ دیکھا، تو پیدل فوج کے پیچھے سوار لا کر کھڑے کر دیے اور تیر اندازوں کو حکم دیا کہ وہ تیر چلائیں۔ ساتھ ہی چلا کر کہا: ”تمہارا برا ہوا تم کس کا انتظار کر رہے ہو؟ حسینؑ کو قتل کیوں نہیں کر چکتے؟“

”چناں چہ چاروں طرف سے آپؑ پر حملہ کر دیا گیا۔ زرعہ بن شریک تمیمی نے آپؑ کے بائیں بازو پر تلوار ماری اور اسے الگ کر دیا۔ پھر آپؑ کے شانے پر تلوار ماری۔ آپؑ لڑکھڑائے۔ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن سنان بن انس نے آگے بڑھ کر آپؑ کے نیزہ مارا۔ آپؑ زمین پر گر پڑے۔ خولی بن یزید الاصبہی آپؑ کا سر کاٹنے آگے بڑھا، لیکن ہمت نہ پڑی۔ یہ دیکھ کر سنان نے کہا:

”اللہ تیرے اعضا کو شل کر ڈالے!“ یہ کہہ کر خود گھوڑے سے اتر کر آپؑ کو ذبح کیا۔ ”مفید“ میں لکھا ہے کہ آپؑ کا سر خود شمر بن ذی الجوشن نے کاٹ کر خولی بن یزید کے حوالے کیا تھا۔ شہادت کے بعد دیکھا گیا، تو معلوم ہوا کہ آپؑ کے جسم پر تیروں کے زخموں کے تینتیس اور تلوار کے چونتیس زخم تھے۔

شہید کرنے کے بعد کوفیوں نے آپؑ کے کپڑے تک اتار لیے۔ حضرت حسینؑ کے ساتھیوں میں سے ایک سیودہ بن ابی المطاع ابھی تک زندہ اور مقتولوں کے درمیان پڑے دم توڑ رہے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو کہتے ہوئے سنا کہ حسینؑ قتل کر دیے گئے۔ وہ یہ سن کر اسی جانکنی کی حالت میں اٹھے اور قریب پڑی ہوئی ایک چھری لے کر دشمن کی طرف بڑھے، لیکن تلوار کی ایک ہی ضرب سے ان کا کام تمام کر دیا گیا۔ قافلہ حسینؑ میں وہ سب سے آخری شہید تھے۔

اب کوفی خیموں کی طرف بڑھے اور اہل بیت کا سارا سامان لوٹ لیا۔ اس کے بعد وہ زین العابدین کی طرف بڑھے جو بیمار پڑے تھے۔ شمر نے انھیں بھی قتل کرنا چاہا، لیکن حمید بن مسلم نے کہا: ”سبحان اللہ! کیا بچوں کو بھی قتل کرو گے؟“

شمر کے باقی ساتھیوں نے بھی کہا کہ ہم اس بیمار کو قتل نہ

ہاتھ پر وار روکا جس سے اس کا ہاتھ کٹ گیا۔ بچہ تکلیف سے بے قرار ہو کر چیخنے لگا۔ حضرت حسینؑ نے اسے گود میں اٹھالیا اور فرمایا: ”اے میرے بھتیجے! اس مصیبت پر جو تجھ پر پڑی، صبر کر۔ اللہ تجھے بھی تیرے پاک و مطہر آباؤ اجداد تک پہنچا دے گا۔“

اس کے بعد آپؑ نے اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا: ”اے اللہ! ان لوگوں سے بارش کے قطروں کو روک لے اور زمین کی برکتوں کو ان پر حرام کر دے۔ اے اللہ! اگر تو انھیں کچھ دنوں کی اور مہلت دے، تو ان میں پھوٹ ڈال دے اور انھیں ایک دوسرے سے الگ الگ کر دے کیونکہ ان لوگوں نے ہمیں بلایا اور ہماری مدد کا وعدہ کیا لیکن جب ہم آئے، تو ہمارے خلاف میدان جنگ میں کود پڑے اور ہمیں قتل کر دیا۔“ آپؑ کا سر اور بدن شدید زخمی ہو چکا تھا، لیکن اس حالت میں بھی جب آپؑ تلوار چلاتے تھے، تو آپؑ کے دائیں بائیں دشمنوں کی بھیڑیوں چھٹ جاتی جس طرح پانی پر سے کائی۔ اسی دوران آپؑ کی بہن زینب اپنے خیمے سے یہ کہتی ہوئی باہر نکلیں ”کاش آسمان زمین پر ٹوٹ پڑے۔“

اسی موقع پر عمرو بن سعد حضرت حسینؑ کے قریب پہنچا۔ زینب نے چلا کر کہا ”اے عمرو! کیا ابو عبد اللہ (حضرت حسینؑ) تیری آنکھوں کے سامنے قتل ہو جائیں گے؟“ یہ سن کر عمرو بن سعد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ٹپ ٹپ اس کے رخساروں اور ڈاڑھی پر گرنے لگے۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ حضرت حسینؑ لڑتے ہوئے فرمانے لگے:

”کیا تم میرے قتل پر مجتمع ہو گئے ہو؟ واللہ! میرے بعد اپنے بندوں میں سے کسی بندے کے قتل پر اللہ اتنا ناراض نہ ہوگا جتنا میرے قتل پر ہوگا۔ مجھے اللہ ضرور عزت بخشے گا، لیکن تم سے ایسے ایسے طریقوں سے انتقام لے گا کہ ان کا تصور بھی نہ کر سکو گے۔“

اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ دشمن اگر چاہتا، تو خاصی دیر پہلے آپؑ کو شہید کر چکا ہوتا، لیکن ہر شخص اس گناہ کا بار دوسرے پر ڈالنا اور خود بچنا چاہتا تھا۔ جب شمر بن ذی الجوشن

اقوال حضرت علی المرتضیٰ

- ☆ حرص سے روزی نہیں بڑھ جاتی مگر آدمی کی قدر گھٹ جاتی ہے۔
- ☆ شرافت کا اندازہ عقل اور ادب سے کیا جاتا ہے نہ کہ مال اور نسب سے۔
- ☆ تجربے کبھی ختم نہیں ہوتے اور عقل مند وہ ہے جو ان پر ترقی کرتا رہے۔
- ☆ اسحق ہمیشہ محتاج رہتا ہے، عقل مند ہمیشہ غنی رہتا ہے اور لاپچی ہمیشہ ذلت میں گرفتار رہتا ہے۔
- ☆ مجھے اس شخص پر رحم آتا ہے جس کی شہرت یہ ہو کہ نیک ہے اور درحقیقت برا ہو۔
- (خزینہ معارف، طاہر شادانی)

آپ کی اولاد مقتول ہے اور ہوا پران کی خاک اڑ رہی ہے۔“ یہ دردناک مرثیہ سن کر دوست دشمن کوئی نہیں تھا جو رونے نہ لگا ہو۔ اس وقت ان لوگوں کو احساس ہوا کہ وہ کس قدر شدید گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ جب عمرو بن سعد میدان کر بلا سے کوچ کر گیا، تو بنی اسد نے جو قریب ہی رہتے تھے، آکر نماز جنازہ ادا کی اور حضرت حسینؑ اور دیگر شہدا کی لاشیں دفن کیں۔

”مفید“ کہتا ہے کہ حضرت حسینؑ کا مزار اسی جگہ ہے جہاں دیگر شہدا کو دفن کیا گیا تھا۔ علی بن حسینؑ کو آپ کے قدموں میں دفن کیا گیا۔ آپ کے اہل بیت اور دیگر شہدا کے لیے ایک ہی گڑھا کھودا گیا اور سب کو ایک ساتھ ہی دفن کر دیا گیا۔ عباس بن علیؑ کو اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں وہ شہید ہوئے تھے۔

حضرت حسینؑ کے سر کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے کہ وہ کہاں دفن کیا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ دمشق میں دفن کیا گیا، بعض کہتے ہیں اسے مدینہ بھیج دیا گیا جہاں اسے دفن کیا گیا۔ بعض دیگر مقامات کا نام لیتے ہیں۔

کریں گے۔ اسی اثنا میں عمرو بن سعد بھی وہاں آ گیا۔ اس نے کہا ”خبردار کوئی شخص خیموں میں نہ جائے، اس بیمار کو کوئی ہاتھ نہ لگائے اور جس نے جو کچھ لوٹا ہے، سب واپس کر دے۔“ اس نے خیموں پر چند سپاہی متعین کر دیے تاکہ وہ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کریں۔ یہ انتظام کرنے کے بعد وہ واپس میدان میں آ گیا اور پکار کر کہا کہ حسینؑ کا جسم روندنے کے لیے کون کون تیار ہے؟ اس پر دس آدمیوں نے اپنے نام پیش کیے اور گھوڑے دوڑا کر جسم اطہر کو روند ڈالا۔ دن کا آخری حصہ تھا۔ آفتاب زیادہ دیر تک یہ ہولناک منظر نہ دیکھ سکا اور خون روتا ہوا غروب ہو گیا۔

☆☆

حضرت حسینؑ کی شہادت کا واقعہ یوم عاشورہ یعنی ۱۰ محرم ۶۱ھ بمطابق ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء کو بعد نماز ظہر پیش آیا۔ حضرت حسینؑ کی عمر اس وقت پچپن برس تھی۔ آپ کے ساتھ بہتر آدمی شہید ہوئے۔ عمرو بن سعد کی فوج کے اٹھاسی آدمی مارے گئے۔ زخمیوں کی تعداد ان کے علاوہ تھی۔ عمرو نے تمام شہدا کے سر کاٹنے کا حکم دیا اور شمر ذی الجوشن، قیس بن اشعث، عمرو بن الحجاج اور مروہ بن قیس کے ہاتھ یہ سر، حضرت حسینؑ کے سر کے ساتھ ابن زیاد کے پاس بھجوا دیے۔ یہ لوگ ان سروں کو نیزوں پر ابن زیاد کے پاس لے گئے۔

شہادت کے دو روز بعد عمرو بن سعد، حضرت حسینؑ کی بیٹیوں، بہنوں، شیرخوار بچوں اور حضرت زین العابدینؑ کو ہمراہ لے کر کر بلا سے کوفہ روانہ ہوا۔ جب یہ تباہ شدہ قافلہ اس جگہ سے گزرنے لگا جہاں حضرت حسینؑ اور دیگر شہدا کی لاشیں بے گور و کفن چٹیل میدان میں پڑی تھیں تو قافلے میں ماتم برپا ہو گیا۔ آپ کی بہن زینبؑ رو رو کر کہتی تھیں:

”اے رسول اللہ، جن پر ملائک آسمان سے درود بھیجتے ہیں، دیکھیے، یہ حسینؑ خاک و خون میں غلطاں، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چٹیل میدان میں پڑا ہے۔ آپ کی بیٹیاں قیدی ہیں۔“

انسائیکلو پیڈیا مکتوبات رحمة العالمین

نبی آخر زماں ﷺ کے تمام خطوط مبارک فرامین و معاہدات انتہائی خوبصورت انداز سے شائع ہو گئے ہیں خطوط مبارک کو تقسیم کرنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اسماء گرامی اور حالات زندگی بھی شامل ہیں یہ کتاب اعلیٰ کاغذ دیدہ زیب ٹائٹل اور نفیس جلد پر مشتمل ہے عاشقان رسول اس مقدس کتاب کو اپنے علاقے کی لائبریریوں اور گھروں میں تقسیم کروا کر لامتناہی اجر حاصل کریں۔ یہ خطوط جن گھروں، دفاتر، کاروباری مراکز میں موجود ہونگے وہ مقام آفات الارضی و سماوی سے محفوظ رہیں گے۔ انشاء اللہ

مرتب علامہ عبدالستار عاصم

قائد اعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی پر علامہ عبدالستار عاصم کی معرکہ آرا کاوش

انسائیکلو پیڈیا

جہان قائد

مکمل 5 جلد - 15000/-

تعارف ڈاکٹر محمد جمال خان نیازی

تقدیم ڈاکٹر عبدالقدیر خان

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

مقبول اکیڈمی چوک اردو بازار لاہور 0300-0515101, 0333-0323/4393422

E-mail: qalamfoundation3@gmail.com

کتاب سے بہتر دوست کہاں !!! جُمہوری سے بہتر کتابیں کہاں !!!

ایم ٹی وی سے مکہ تک اسلام نے کیسے میری کایا پلٹ دی کرسٹیان بیکر

رنگین تصاویر پاکستان کے ہر گھر کے لیے دلچسپ کتاب قیمت 990 روپے

غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کی پہلی اور مکمل سوانح عمری

” اتاترک - نئی قوم اور جمہوریہ کا ظہور “

صفحہ 580

نادر تصاویر جمہور سائنس مصنف: پیٹرک کنر اس قیمت 2200 روپے

300	انٹونیو تورلیس	ناول	سرزمین	400	فرخ سہیل گوہندی	ترکی ہی ترکی سفرنامہ، تاریخ و تہذیب
650	ناصر محمد علی شاہ	منظوم ناول	انسانی منظر نامہ	580	شریف الحق دایہ	پاکستان سے بنگلہ دیش - آن کبی جدوجہد
650	احمد حمزہ طاہر	ناول	شہر اطمینان	980	نسرین سید اہل حیدر	تحریک بحالی جمہوریت ایم۔ آر۔ ڈی
580	ایلیف شفق	ناول	ناموس	450	ناہیدہ چوہدری	ریاستی دہشت گردی
780	اورنگ آباد	ناول	سرخ میرانام	450	ناہیدہ چوہدری	سرکش ریاستیں
400	عرفان اورکا	ناول	ایک ترک خاندان	450	ناہیدہ چوہدری	ورلڈ آرڈر کی حقیقت
580	اویا بیدر	ناول	گرفتار لفظوں کی رہائی	490	جان کے۔ ٹولی	غیر مقدس جنگیں (Unholy Wars)
425	امین معذوف	ناول	سمرقند	450	راؤ رشید	جو میں نے دیکھا
480	یشا رکمال	ناول	بوئے گل	180	فرخ سہیل گوہندی	عالمی بینکاروں کی دہشت گردی
580	یشا رکمال	ناول	اناطولیہ کہانی	125	شیخ محمد رشید	اسلام کا معانی نظام اور تحریک پاکستان
700	اویا بیدر	ناول	جلاوطن بلیاں	520	ہیر الدالبرٹ لیمب	سلیمان عالی شان - تاریخ سلطنت عثمانیہ
980	احمد امیت	باب اسرار - دودرویش، شمس تبریز اور روی	اکبر سے اورنگزیب تک	590	ہیر الدالبرٹ لیمب	صلیبی جنگوں کی تاریخ - صلاح الدین ایوبی
680	ایلیف شفق	ناول	اکبر سے اورنگزیب تک	860	ظفر علی راجا ندو	قانون دان اقبال
580	پنیر ماس	خونی مسائے - ہونیا نسل کشی کی روداد	آغا خان	580	ہیکٹر بولتھو	حیات قائد اعظم
780	مہیر بوس	مہیر بوس	آغا خان	380	موت احمد و قاریف	میری آخری جنگ افغانستان، دولت افغان سے انقلاب

Free Delivery

ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیں

جمہوری پبلیکیشنز 2 ایوان تجارت روڈ، لاہور 042-36314140

www.jumhooripublications.com

ظالموں کی حمایت، مظلوموں سے چشم پوشی کب تک؟

انسانی حقوق کی علمبردار تنظیموں
اور اہل ایمان سے ایک منصف کا سوال

جسٹس (ر) بن یامین

سہولت دی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ جیل میں بند ہوتے ہیں وہ بہت ساری سہولتوں اور آرام سے محروم ایک سخت زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن پھر جب ان کے حالات پر انسان غور کرتا ہے، تو وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انھوں نے معاشرے کے خلاف ایسا قدم اٹھایا ہے کہ قانون نے انھیں جیل میں بند کرنے میں ہی معاشرے کی عافیت جانی۔

ان سب باتوں پر جب غور کیا جائے، تو قابل افسوس پہلو یہ نظر آتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے لیے بے قرار ہیں اور تڑپ رہے ہیں جنھوں نے معاشرے یا اس میں رہنے والے انسانوں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ لیکن ہم نے ان مظلوموں کو پس پشت ڈال دیا ہے جو ان جیلوں میں بند لوگوں کے اعمال سے متاثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آدمی جس کے چھوٹے چھوٹے بچے اور نوجوان بیوی ہے۔ وہ انھیں زندگی کی سہولیات پہنچانے کے لیے دن رات محنت مزدوری کرتا ہے۔

ایک مدت سے ذہن پر یہ سوچ غالب ہے کہ ملک میں انسانی حقوق کی علمبردار NGOs اور دوسری تنظیمیں ان لوگوں کی بہتری کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں جو کہ کردہ یا ناکردہ گناہوں کی پاداش میں جیلوں میں بند ہیں۔ ہر کوئی کہتا ہے کہ قیدیوں کو جیل کے اندر یہ سہولت مہیا کی جائے وہ



جب ایسا شخص قتل ہو جاتا ہے، تو اس کی بیوی اور بچے بے سہارا اور بے یار و مددگار ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے پاس آمدن کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہوتا کہ اس سے باعزت زندگی گزار سکیں۔ پھر مزید یہ کہ دوسرے رشتہ دار بھی ایسی حالت میں ان سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ تو ان حالات میں کوئی بتلائے کہ وہ نوجوان بیوہ اور یتیم بچے کیسے زندگی کے دن گزاریں؟ افسوس کا مقام یہ ہے کہ وہ قاتل جس نے اس شخص کو قتل کیا اور اس کے نتیجہ میں جیل میں بند ہوا۔ اس کے آرام اس کی سہولت کے لیے تو ہر کوئی کہتا ہے۔ لیکن اس مقتول کی بیوہ اور یتیم بچوں کا کسی کو خیال ہے نہ ہی کوئی ایسے اقدام کی ضرورت پر زور دیتا ہے کہ جس سے معاشرہ کے یہ بے آسرا اور بے قصور افراد باعزت زندگی گزار سکیں۔ اگر ہم اپنے دماغ پر تھوڑا سا بھی زور دیں، تو بے سہارا بیوہ اور اس کے یتیم بچوں کی تکالیف آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں۔ پھر اسلام نے بھی ہمیں یتیم اور بے سہارا بچوں کی بہترین پرورش کرنے کی بار بار تاکید کی ہے۔

جو لوگ جیلوں میں بند ہیں ان کا نان نفقہ رہائش اور دوسرے لوازمات انھیں سرکار کی طرف سے مہیا کیے جاتے ہیں۔ لہذا ظاہر ہے کہ یہ سب اخراجات پورا کرنے کے لیے سرکار کی طرف سے ایک مخصوص رقم جیلوں کو مہیا کی جاتی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں وہ لوگ جن کے نان نفقہ کا انتظام کرنے والے مقتول دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں ان کی روزی روٹی کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ کیا یہ ظلم کی انتہا نہیں ہے کہ ظالم کے لیے ہر کوئی کہتا ہے کہ فلاں سہولت مہیا کی جائے فلاں آسائش فراہم کی جائے جبکہ اس کے مقابلے میں مظلوم کو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ وہ کس حال میں جی رہا ہے۔ ذیل میں چند ایک تجاویز پیش کی جاتی ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے، تو ان لوگوں کی مصیبتوں پریشانیوں اور تکالیف کا کسی حد تک ازالہ ہونا ممکن ہے:

۱۔ مقتولین کی بیواؤں کو بچیوں کے اسکول میں ان کی صلاحیتوں کے مطابق جو ملازمت وہ کرنا چاہیں ترجیحی

بنیادوں پر دی جائے۔

۲۔ جو بیوائیں ملازمت نہیں کرنا چاہتیں اور کوئی ہنر سیکھنے میں دلچسپی رکھتی ہیں، تو انھیں ہنر سیکھنے میں مدد دی جائے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنا سہارا خود بنیں۔

۳۔ اگر مقتولین کی کوئی اولاد کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، تو انھیں سرکاری ملازمتوں کے حصول میں فوقیت دی جائے۔ کیونکہ اگر ہم ایسا کریں گے، تو اس سے نہ صرف مظلومین کے ساتھ ہمدردی ہوگی بلکہ اللہ کے فرمان کے مطابق ہمارا یہ عمل بین اسلامی ہوگا کیونکہ یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کے ساتھ ہمیں اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

۴۔ اگر مقتول کے والدین حیات میں، لیکن وہ عمر کی اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے کے قابل نہیں ہیں، تو حکومت کو ان کے لیے وظیفہ مقرر کرنا چاہیے تاکہ وہ در بدر کی ٹھوکیں کھانے سے بچ سکیں۔

۵۔ اس وقت ملک میں بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام زور شور سے لاگو ہے، لہذا یہ تجویز بھی دی جاتی ہے کہ اس اسکیم میں سے مقتولین کے ورثا کو ترجیحی بنیادوں پر مدد دی جائے تاکہ وہ مظلومین بھی معاشرے کا کارآمد حصہ بن سکیں۔

مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ عدلیہ کے اعلیٰ افسران تک جیل خانہ جات کا معائنہ کرنے بار بار جاتے ہیں، لیکن آج تک میری نظر سے کوئی ایسی خبر نہیں گزری جس کے مطابق کوئی بھی معاشرے کا بااثر شخص مقتول کی بیوہ اور بچوں کے سرپرست شفقت رکھنے گیا ہو۔ حالانکہ اسلام نے ہمیں یتیموں اور بیواؤں کی نگہداشت کرنے اور معاشرہ کے خلاف کام کرنے والوں کو سزا دینے کا حکم دیا ہے۔ یہ چند ایک ٹوٹے پھوٹے خیالات تھے جن کا تصور کرتے ہوئے دل جلتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم سے بہتر لکھنے اور سوچنے والے معاشرے کے اس کٹھن سوال پر غور بھی کریں اور اپنے بہتر خیالات سے دوسروں کو بھی آگاہ کریں۔

یہ بھارت ہے

بیان کروں گا۔

بھائی صاحب کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور اگلے ہی سال نریندر مودی نے بھارت سرکار سنبھال لی۔ سوامی کے بھائی کا کہا سچ ثابت ہوا اور آج سیکڑوں مسلمانوں کا قاتل بڑے ٹھاٹھ سے جیل میں زندگی گزار رہا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ جلد اسے رہائی مل جائے گی۔ وجہ یہی کہ مودی حکومت اپنے ”آدی“ کو ہر قیمت پر جیل سے رہا کرنا چاہتی ہے۔

سب بھارتی ہندو ہیں

سوامی اسیم آنند کا تعلق ایک دیہی گھرانے سے ہے۔ اس نے نوجوانی میں دوران تعلیم مشہور ہندو قوم پرست راہنما،

جون ۲۰۱۳ء کی بات ہے جب لینا گیتا مغربی بنگال میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں، کمار پوکریپنچی۔ اسی گاؤں میں انتہا پسند ہندو راہنما، سوامی اسیم آنند کا خاندان آباد تھا۔ بھارت کے مشہور رسالے، کاروان میگزین سے وابستہ صحافی، لینا گیتا سوامی کے ماضی اور سرگرمیوں پر تحقیق کر رہی تھی۔

سوامی کے گھر والوں نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ لینا گیتا نے بہت کوشش کی کہ وہ سوامی اسیم آنند کے متعلق کچھ معلومات فراہم کریں، مگر اسے ناکامی ہوئی۔ جب وہ بے نیل مرام رخصت ہونے لگی، تو اچانک سوامی کا بھائی کہنے لگا: ”چند ماہ انتظار کر لیں۔ جب بھی مودی جی برسر اقتدار آئے، میں لاؤڈ اسپیکر پر چیخ چیخ کر اسیم آنند کے ”کارنامے“

سیکڑوں مسلمانوں کا قاتل..... سوامی اسیم آنند

مودی حکومت اپنے اس ”آدی“ کو ہر قیمت پر جیل سے رہا کرنا چاہتی ہے

سید عامر محمود



اکتوبر 2015ء

اردو ڈائجسٹ 25

سوامی ویوک آنند (Vivekananda) کی تحریریں پڑھیں، تو شدت پسند ہندو بن گیا۔ واضح رہے، یہ سوامی ویوکانند ہی ہے جس نے انگریز مورخین کی مدد سے انیسویں صدی میں ”ہندومت“ کی بنیادیں رکھیں۔ اس سے قبل بحیثیت مذہب ہندومت کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ بس رسومات و روایات کے مرکب کا نام تھا۔

کٹر ہندو بن کر اسیم آنند ہندو انتہا پسند تنظیم، آرائس ایس (راشٹریہ سویم سیوک سنگھ) میں شامل ہو گیا۔ اپنی ذہانت اور محنت کے باعث اس نے تیزی سے ترقی کی۔ ۱۹۷۷ء

میں آرائس ایس کی ایک ذیلی تنظیم ”وہا اسی کلیان آشرم“ کا حصہ بن گیا۔ اس تنظیم سے منسلک راہنما و کارکن بھارت بھر میں آباد قبائلیوں کو بذریعہ تبلیغ تحریک ہندو بنانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ اس سعی کے پس پشت انتہا پسند ہندوؤں کا یہ نظریہ پوشیدہ ہے کہ بھارت میں آباد سبھی

مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں کے اجداد ہندو تھے۔

اسیم آنند پھر قبائلیوں کے مختلف علاقوں میں تبلیغ کرتا رہا۔ ان علاقوں میں عیسائی مشنری بھی سرگرم عمل تھے۔ اسیم آنند نے انھیں زبردستی روکنا چاہا، تو دونوں کے مابین تصادم ہو گیا۔ اس نے پھر انتہا پسند ہندو غنڈوں کے ذریعے چرچوں اور عیسائی گھروں پر حملے کرائے اور انھیں نذر آتش کر ڈالا۔ یوں وہ ہندومت کے پھیلاؤ کی خاطر ایک متشدد راہنما بن گیا۔

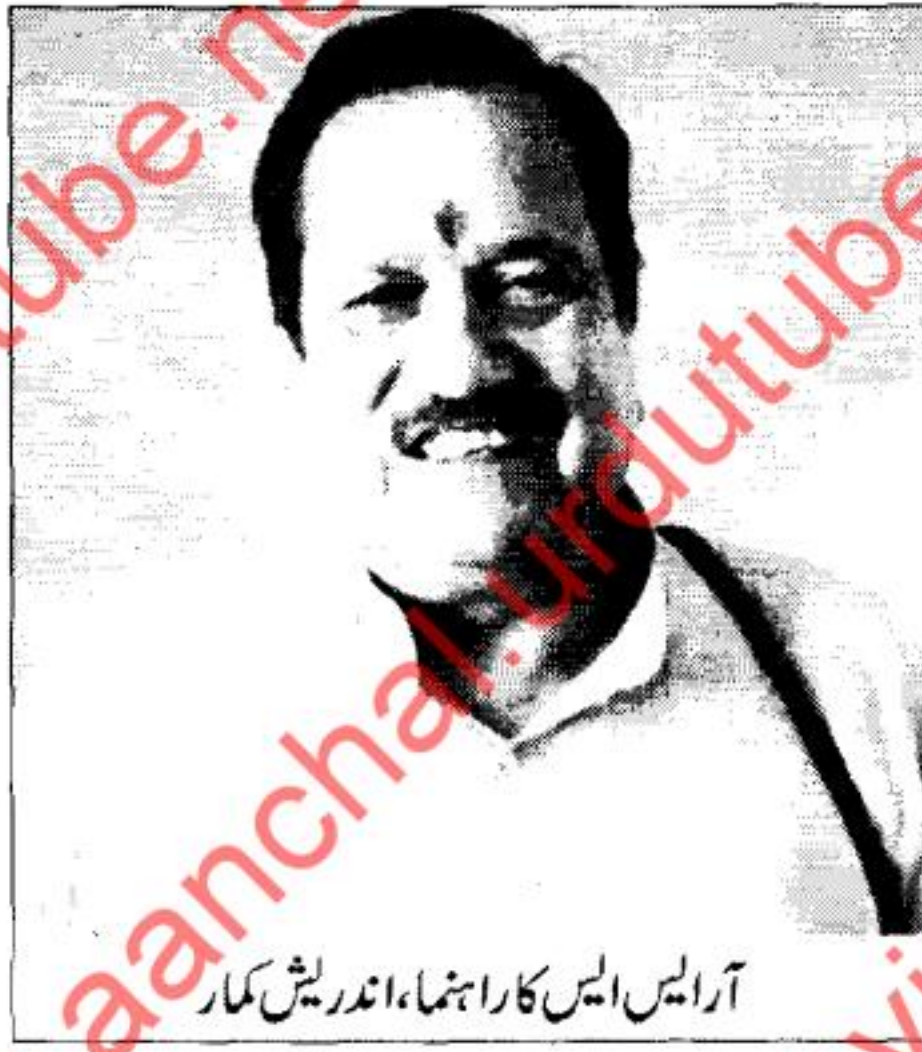
آرائس ایس کے قائدین بھی ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے جو مار دھاڑ سے نہ گھبرائیں اور ”دشمن“ پر بڑھ چڑھ کر حملے کریں۔ اسی لیے وہ اسیم آنند کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔

اواخر بیسویں صدی تک وہ آرائس ایس کے بڑے لیڈروں مثلاً کے ایس سدرشن، موہن بھگت، نریندر مودی، شیوراج سنگھ وغیرہ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا۔

۱۹۹۵ء میں اسیم آنند ریاست گجرات پہنچا اور وہاں آباد قبائلیوں کو ہندو بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے وہاں ایک مندر بھی تعمیر کیا اور ہندومت کے پھیلاؤ کی خاطر وسیع پیمانے پر مذہبی تقریبات منعقد کرائیں۔ دو تقاریب میں نریندر مودی بھی شریک ہوا اور اسیم آنند کا قریبی دوست بن گیا۔

۲۰۰۱ء میں ۱۱ ستمبر کا واقعہ ظہور پذیر ہوا، تو بھارت میں آرائس ایس کے سیاسی روپ، بی جے پی کی حکومت تھی۔ درج بالا واقعے کی آڑ میں بھارتی حکومت خصوصاً مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کو نشانہ بنانے لگی۔ بھارتی فوج نے کشمیری مسلم عوام پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ اس ظلم کا بدلہ لینے کے لیے مختلف کشمیری تنظیموں نے بھارت بھر میں مندروں پر بم دھماکے کیے۔ ان دھماکوں کا مقصد یہی تھا کہ بھارتی حکومت مسلمانوں پر مظالم ڈھانے سے باز آ جائے۔ بم دھماکوں کی زد میں آکر کئی ہندو مارے گئے۔

اینٹ کا جواب پتھر سے ان بم دھماکوں سے سبق سیکھ کر بھارتی حکمران طبقے کو



آرائس ایس کا راہنما، اندریش کمار

چاہیے تھا کہ وہ مسلمانان ہند کو نشانہ بنانا ترک کر دیتا، مگر انتہا پسند ہندوؤں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیصلہ کیا۔ آرایس ایس کی مرکزی قیادت نے طے کر لیا کہ مساجد اور مسلمانوں کے دیگر مراکز پر بم حملے کیے جائیں۔ یوں وہ مسلمانوں کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ یہ ۲۰۰۵ء کی بات ہے۔

اس منصوبے کا سربراہ اندریش کمار کو بنایا گیا۔ یہ آرایس ایس کا سینئر لیڈر ہے۔ اس نے اتیم آنند اور ضلع مہو سے تعلق رکھنے والے آرایس ایس لیڈر، سنیل جوشی کو دو بنیادی کام سونپے۔ اتیم آنند نے اپنے جذباتی لیکچروں کے ذریعے

ہندو نوجوانوں کو مساجد وغیرہ پر بم حملے کرنے کے لیے تیار کرنا تھا۔ جبکہ سنیل جوشی کو یہ ذمے داری دی گئی کہ وہ بموں کا بندوبست کرے اور یہ منصوبہ بندی بھی کہ حملے کیونکر کیے جائیں۔

مسلمانوں کے خلاف ہندو دہشت گردوں کا نیٹ ورک بنانے میں ان دونوں راہنماؤں کو تقریباً ایک سال

لگا۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں، تو ہندو دہشت گردوں نے ستمبر ۲۰۰۶ء میں مالے گاؤں کی مسجد میں بم دھماکے کیے۔ یہ ان کا پہلا وار تھا۔ بم دھماکوں کی زد میں آکر سینتیس مسلمان شہید ہوئے۔ اس کے بعد ہندو دہشت گردوں نے مسلمانوں پر درج ذیل حملے کیے:

☆ فروری ۲۰۰۷ء..... سمجھوتہ ایکسپریس میں بم دھماکے..... ۶۸ مسلمان شہید ہوئے جن میں زیادہ تر پاکستانی تھے۔

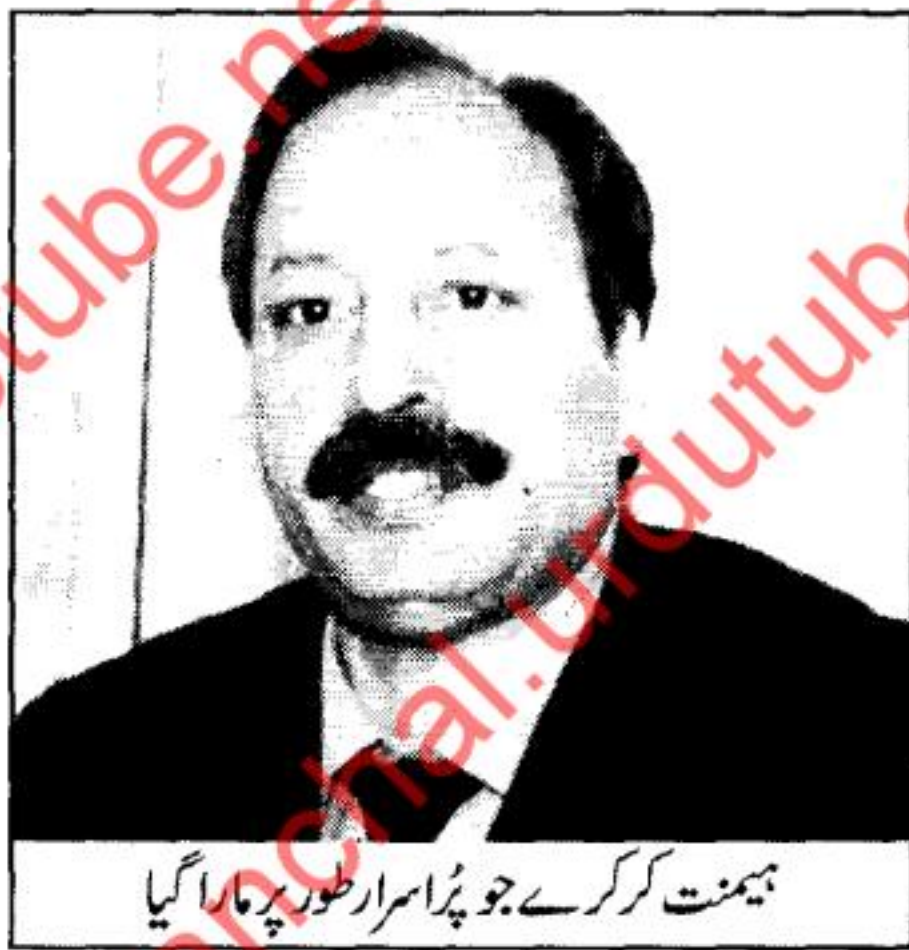
☆ مئی ۲۰۰۷ء..... مکہ مسجد، حیدرآباد دکن میں بم دھماکے..... ۱۶ مسلمان شہید ہوئے۔

☆ اکتوبر ۲۰۰۷ء..... درگاہ اجمیر شریف میں بم دھماکا..... تین مسلمان شہید۔

☆ ستمبر ۲۰۰۸ء..... مالے گاؤں میں پھر بم دھماکا..... آٹھ مسلمان شہید ہوئے۔

☆ ستمبر ۲۰۰۸ء..... موڈاسا (ضلع گجرات) میں بم دھماکا..... ایک مسلمان شہید ہوا۔

ہندو دہشت گرد مزید مساجد کو نشانہ بناتے، مگر ریاست مہاراشٹر کا ایک اعلیٰ پولیس افسر، ہیمنت کرکرے ان کے تعاقب میں لگ گیا۔ کرکرے ایک بے تعصب، محنتی اور فرض شناس پولیس افسر تھا۔ اس نے ہندو



ہیمنت کرکرے جو پراسرار طور پر مارا گیا

دہشت گردی کے نیٹ ورک کا سراغ لگایا اور اس کے اہم کارندوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں حاضر سروس فوجی افسر، کرنل پروہت، سدھوی پر گیا اور آرایس ایس کے نمایاں لیڈر شامل تھے۔ یوں پہلی بار انکشاف ہوا کہ ہندو دہشت گردوں کا نیٹ ورک مسلمانوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ کہ

اس نیٹ ورک نے دہشت گردی کے جتنے حملے کیے، ان کے بعد مسلمان لڑکوں ہی کو گرفتار کیا گیا۔ یہ سب بے گناہ تھے، مگر پولیس کی نااہلی کے باعث انھیں طویل عرصہ اسیری کا صعوبتوں بھرا دور کا شکار ہوا۔ یہ مسلمان نوجوانوں پر ظلم تھا اور بے گناہ ہونے کے باوجود انھیں ناحق سزا کاٹنی پڑی۔

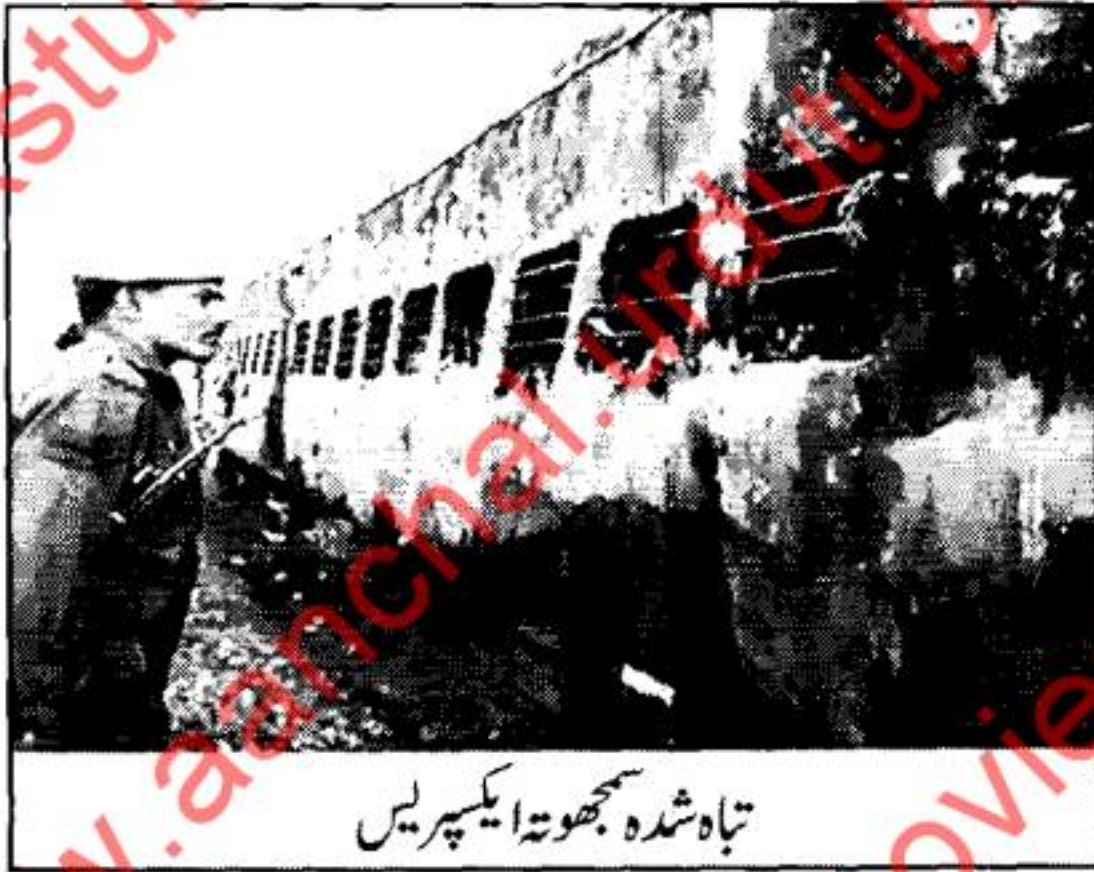
ہیمنت کرکرے ہندو دہشت گردوں کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ نومبر ۲۰۰۸ء میں ممبئی حملوں کا پراسرار واقعہ آن پہنچا۔ اس میں ہیمنت کرکرے انوکھے انداز میں مارا گیا۔ تب تک کرکرے کو معلوم ہو چکا تھا کہ آرایس ایس کی اعلیٰ قیادت

دلچسپ معلومات

اسپین کا دن چار حصوں پر مشتمل ہے۔ صبح، سات بجے سے تین بجے تک رہتی ہے۔ سہ پہر لگ بھگ دس بجے شب تک چلتی ہے۔ پھر دو بجے تک رات کا عمل رہتا ہے اور اس کے بعد دن کا چوتھا حصہ ”لامیدرو گادا“ آتا ہے۔ دن کا یہ سرگرم حصہ اسپین سے مخصوص ہے۔ اسپین میں آپ قبل ظہرانہ کاروباری میٹنگ دو بجے شروع کر سکتے ہیں اور جب ساڑھے آٹھ بجے ”سہ پہر“ ملاقات کا وقت دیا جاتا ہے، تو غیر ملکی چکرا کے رہ جاتے ہیں۔ (اصدق امین، واہ کینٹ)

کیا۔ یہی شخص ان دہشت گردوں کا سرغنہ تھا جس نے سمجھوتہ ایکسپریس میں بم دھماکے کرا کے سیکڑوں مسلمان شہید کر ڈالے۔

ان میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔ سوامی اتیم آنند کی ضمانت ہونے پر یہ تلخ سچائی آشکار ہوتی ہے کہ مودی بھارت کو ہندو ریاست بنانے کی راہ پر گامزن ہے۔ وہ مختلف اقدامات سے ہندو قوم پرستی کو فروغ دے رہا ہے جو بھارتی مسلمانوں کے



تباہ شدہ سمجھوتہ ایکسپریس

لیے خطرے کی کھنٹی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والے عشروں میں بھارتی مسلمان اپنا تشخص، تہذیب و ثقافت کھو بیٹھیں اور ہندو اکثریت میں جذب ہو جائیں۔

دورانندیش قائد اعظم محمد علی جناح اور ان کے ہم نوا مسلم لیڈروں کو اسی خطرے کا ادراک بہت پہلے ہو گیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے پاکستان بنانے کی خاطر جان لڑادی جہاں الحمد للہ کروڑوں مسلمان مکمل آزادی سے اپنی مذہبی و قومی روایات پر عمل پیرا ہیں۔

دہشت گردی کے نیٹ ورک میں ملوث ہے۔ خیال ہے، ان کی اصلیت پوشیدہ رکھنے کے لیے کر کر کے کو قتل کرایا گیا۔

اس زمانے میں کانگریس کی حکومت تھی۔ چونکہ وہ بی جے پی کی حریف ہے لہذا اس نے ہندو دہشت گردوں کے خلاف چھان بین جاری رکھی۔ یہی وجہ ہے، ۲۰۱۱ء میں پولیس نے نیٹ ورک کے ایک اہم کردار، سوامی اتیم آنند کو گرفتار کر لیا۔ دوسری اہم شخصیت، سنیل جوشی کو دسمبر ۲۰۰۸ء میں آرائس ایس کے لیڈر خود قتل کرا چکے تھے۔ انھیں خطرہ تھا کہ وہ نیٹ ورک کا پول کھول دے گا۔

سوامی اتیم آنند پچھلے چار برس میں دو بار انکشافات سے پر بیان دے چکا۔ بیانات میں سوامی نے افشا کیا کہ

بھارتی مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کا نیٹ ورک آرائس ایس لیڈر شپ کے آشیر باد ہی سے بنا یا گیا۔ یوں اس نیٹ ورک کی بدولت نہ صرف سیکڑوں بے گناہ مسلمان شہید ہوئے بلکہ لاکھ لاکھ نوجوان مسلمانوں ہی کو مجرم

قرار دے کے گرفتار کیا گیا۔ یہ جدید بھارت کا نہایت بھیاٹک روپ ہے۔

جب تک کانگریسی حکومت رہی، ہندو دہشت گردوں کے خلاف تفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن نریندر مودی نے حکمران بننے ہی تمام سرکاری ایجنسیوں کو حکم دیا کہ گرفتار شدہ ہندو دہشت گردوں کو ”تنگ نہ کیا جائے۔“ چنانچہ پچھلے دنوں سوامی اتیم آنند کی ضمانت منظور کر لی گئی۔

سوامی کو ضمانت ملنے پر حکومت پاکستان نے بجا طور پر احتجاج

اردو ڈائجسٹ

نوجوانوں کا ناقابل فراموش محسن

ایک سراپا خیر افسر کا تذکرہ جن کی زندگی
قول و فعل کے تضاد سے پاک رہی

نصیر احمد سلیمی



آغا افضل حسین بھی ۴ اگست کی صبح اس

محترم

دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کی رحلت سے ہم اور ہمارا معاشرہ ایک ایسی دل فواز اور دل ربا شخصیت سے محروم ہو گیا جو اپنی ذات میں انجمن بھی تھی اور ہر ایک کے لیے سراپا خیر اور ایثار بھی۔ وہ طلبہ سیاست میں بھی نیک نام رہے اور رسول سرونٹ کے طور پر اعلیٰ پوزیشن سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کو ایک دیانت دار، نیک نام اور فرض شناس افسر کے طور پر یاد کیا جا رہا ہے۔ رب کریم نے آغا افضل حسین اور ان کی اہلیہ محترمہ پروین قادر آغا کو (جو خود بھی گریڈ ۲۲ کی وفاقی سیکرٹری کے منصب سے ریٹائر ہوئی ہیں) شخصی خوبیوں اور اوصاف حمیدہ سے بڑی فیاضی کے ساتھ نوازا ہے۔ بھلائی کر کے بھول جانے کی خوبی تو اللہ کسی کسی کو عطا کرتا ہے۔ میں نے انھیں کسی پر احسان جتاتے بھی نہیں دیکھا۔ یہ خوبی ان میں اور ان کی اہلیہ میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

وہ دوست احباب کے لیے ہر وقت کام آنے پر آمادہ و تیار رہتے اور قرآن پاک کے حکم کے مطابق خونی رشتوں کو جوڑے رکھنے میں بھی کمال رکھتے تھے۔ دونوں نے بڑا فراخ دل پایا اور دونوں کی زندگیاں کھلی کتاب کے مانند رہی ہیں۔ ان کی عملی زندگی قول و فعل کے تضاد اور دو عملی کے مرض سے

پاک رہی۔ وہ اپنے ظاہر و باطن میں یک رنگے تھے۔ ان کی شخصیت کا ”بنیادی جوہر“ بلا امتیاز رنگ و نسل، زبان، فقہی مسلک اور ہر مذہب کے محروم طبقات اور کم وسائل رکھنے والے ملک بھر کے نوجوانوں کے لیے بہتر سہولتیں فراہم کرنا تھا۔ اس تک و دو میں انھوں نے اپنے رات دن کا آرام بج دیا تھا۔ انھیں سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد پرکشش مناصب کی پیشکشیں بھی ہوتی رہیں، مگر انھوں نے کسی کو قبول کرنے کے بجائے اپنی ساری توجہ کا مرکز و محور پاکستان یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن کو بنایا، جس کی آبیاری میں وہ رضا کارانہ طور پر کئی عشروں سے اپنا وقت اور وسائل صرف کر رہے تھے۔ آغا افضل حسین کی رحلت پر استاد محترم جناب الطاف حسن قریشی (مدیر اعلیٰ اردو ڈائجسٹ) نے ۷ اگست کو روزنامہ جنگ میں اپنے ہفتہ وار کالم ”صورت حال“ میں ان کی طالب علموں، بے سہارا لوگوں اور چھوٹے ملازمین کے لیے بے لوث خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں ”نوجوانوں کا ناقابل فراموش محسن“ اور ”رول ماڈل“ قرار دیا۔ میں اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنے کی جسارت کروں گا

کہ آغا صاحب ہم جیسے عمر رسیدہ لوگوں کے لیے بھی ”رول ماڈل“ تھے۔ وہ تو پاکستان یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن میں ساہا سال سے کسی مالی منفعت اور اعزاز یہ کے بغیر مصروف عمل تھے۔ انھوں نے اپنے مخلص دوستوں کو بھی اس کام میں رضا کارانہ طور پر اپنے ساتھ لگا لیا۔ آغا افضل حسین خود اور ان کے ساتھ کام کرنے والے تمام عہدے دار بھی اس ادارے میں بلا معاوضہ، رضا کارانہ طور پر اپنا وقت دیتے۔

پاکستان یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن کا ادارہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان کے ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر یو کرامت (مرحوم) نے لاہور میں قائم کیا تھا۔ پہلا یوتھ ہاسٹل بھی لاہور میں قائم ہوا۔ محترم پروفیسر یو کرامت (مرحوم) ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ آغا صاحب پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر صاحب کے شاگرد رہے۔ بعد ازاں آغا افضل حسین پنجاب یونیورسٹی میں طلبہ یونین کے بھاری اکثریت سے جنرل سیکرٹری بھی منتخب ہوئے۔ آغا صاحب نے اپنی سیکرٹری شپ میں ہی ذوالفقار علی بھٹو کو بھی پنجاب یونیورسٹی میں خطاب کرنے کو بلایا تھا۔ آغا صاحب نے زمانہ طالب علمی میں پروفیسر کرامت کی تحریک پر پاکستان یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔

پروفیسر کرامت کی مساعی اور کاوشوں سے لاہور کے علاوہ کچھ دیگر مقامات پر بھی یوتھ ہاسٹل قائم ہوئے۔ بعد میں بعض ہاسٹل کی حالت دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے ناگفتہ بہ ہو گئی تھی جو آغا صاحب نے اپنے زمانے میں درست کرائی۔ اب سب ہاسٹل کام کر رہے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں آغا صاحب کو پاکستان یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن کا اعزازی سیکرٹری جنرل (انتظامی سربراہ) منتخب کیا گیا، تو انھوں نے اس ادارے میں نئی جان ڈالنے کے لیے اپنے پرانے مخلص دوستوں کو رضا کارانہ طور پر وقت دینے پر آمادہ کیا جن میں جناب وسیم سجاد بھی تھے (سابق وزیر قانون اور سینٹ آف

پاکستان کے سابق چیئرمین) جو اس وقت پاکستان یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن کے صدر ہیں اور جناب ڈاکٹر انوار حسین صدیقی، نائب صدر بھی (سابق وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد)۔

جناب ہمایوں قاضی فارن سروس میں تھے۔ وہ وزارت خارجہ میں اعلیٰ مناصب پر بھی فائز رہے۔ اور افغانستان اور ترکی میں پاکستان کے سفیر رہے۔ آغا صاحب مئی ۲۰۱۵ء میں علاج کے لیے امریکا گئے، تو قائم مقام اعزازی سیکرٹری اور فینجنگ ٹرسٹی کی ذمے داریاں انہی کے سپرد کر گئے تھے۔ (ہمایوں قاضی صاحب کا خاندان صوبہ سرحد میں (اب خیبر پختون خواہ) تحریک پاکستان کی جدوجہد میں مسلم لیگ کے ساتھ بڑا فعال اور متحرک رہا ہے۔

ہمایوں قاضی کی والدہ محترمہ ۱۹۷۰ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی رکن بھی رہی ہیں آغا افضل حسین کے انتقال کے بعد فینجنگ کمیٹی نے ہنگامی اجلاس میں فیصلہ کیا کہ جناب ہمایوں قاضی کو آغا افضل حسین (مرحوم) کی جگہ اعزازی سیکرٹری جنرل اور فینجنگ ٹرسٹی کی حیثیت دے دی جائے۔ اسلام آباد میں آغا صاحب کے ساتھ طویل عرصے سے جناب آفتاب احمد، جناب راجہ محمد امین اور جناب ڈاکٹر جہاں زیب بھی فینجنگ کمیٹی کے رکن اور ٹرسٹ کے رکن کی حیثیت سے رضا کارانہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پاکستان یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن کا نو رکنی ٹرسٹ ہے جس کے فینجنگ ٹرسٹی پہلے آغا صاحب تھے اور اب قاضی صاحب ہیں۔ یوتھ ہاسٹل کی بارہ رکنی فینجنگ کمیٹی ہے، جس میں چاروں صوبوں کے لوگ شامل ہیں۔

توقع ہے کہ آغا صاحب کے جانشین ان کی اس زندہ یادگار کو مزید وسعت دیں گے اور سہولتوں میں مزید اضافہ کریں گے۔ اسلام آباد کے ہاسٹل میں اس کام کی ابتدا آغا کی زندگی ہی میں ان کی ہدایت کے مطابق ان کی ٹیم نے شروع

کر دی تھی۔ آغا افضل حسین (مرحوم) کا ایک بڑا کارنامہ ”پاکستان یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن“ کو ”انٹرنیشنل یوتھ ہاسٹل“ کی تنظیم کا فعال رکن بنانا ہے جس کی وجہ سے پاکستان کے نوجوانوں کو دنیا بھر میں موجود انٹرنیشنل یوتھ ہاسٹلز میں کم کرایہ پر قیام کی سہولت مل جاتی ہے۔ اس کے لیے پاکستان یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن سے ”انٹرنیشنل یوتھ ہاسٹل“ کا کارڈ بنوا کر لے جانا پڑتا ہے جو ایک سال کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔ کارڈ کی مدت ختم ہونے کے بعد ہر سال تجدید کرانا ہوتی ہے۔ پاکستان کے یوتھ ہاسٹلز نوجوانوں اور طلبہ کو خصوصاً اسکولز کالجز اور یونیورسٹیز کے طلبہ اور طالبات کے گروپوں کو تین دن کے عارضی قیام کے لیے نہایت معمولی کرائے پر صاف ستھرے بستروں کے ساتھ صاف شفاف ماحول فراہم کر رہا ہے۔ اس وقت ملک کے چاروں صوبوں میں ۱۸ مقامات پر یوتھ ہاسٹلز کام کر رہے ہیں جن میں تقریباً ایک ہزار (۱۰۰۰) بستروں کی گنجائش ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ ادارہ کسی بیرونی امداد کے بغیر اپنے محدود وسائل کے اندر رہتے ہوئے کفایت شعاری کے اصول پر کاربند ہے۔

آغا صاحب نے اپنے دور میں پہلے سے موجود ہاسٹلز کو ورکنگ کنڈیشن میں لانے کے لیے مرمت کے کام کو بھی مکمل کرایا اور سات نئے ہاسٹلز بھی تعمیر کرائے اور پاکستان یوتھ ہاسٹلز کی جن زمینوں پر طاقت ور قابض ہو گئے تھے، ان کے خلاف قانونی عدالتوں میں جنگ لڑی۔ لاہور میں ایبٹ روڈ پر یوتھ ہاسٹل کی زمین واگزار کرانے کے لیے طویل عرصہ تک آغا صاحب کو عدالتوں میں پیشیاں بھگتنا پڑیں، تب جا کر یوتھ ہاسٹل کی ۲۴ کنال زمین سے بارہ کنال زمین کا فیصلہ پنجاب ہائی کورٹ نے یوتھ ہاسٹل کے حق میں حاصل کیا، جس کو قابض فریق نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ آغا افضل حسین علاج کے لیے امریکا جانے کے آخری دن تک پنجاب ہائی کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد کے لیے بھی دن رات سرگرم تھے کہ

اچانک لاہور میں یکم مئی ۲۰۱۵ء کو ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ٹیسٹ کرائے گئے، تو پتا چلا کہ سرطان کے موذی مرض نے کافی عرصے سے جکڑ رکھا ہے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ یوتھ ہاسٹلز کی زمینوں کی واگزاری کی عدالتی جنگ میں بار بار کے سفر کی بے آرامی نے آغا صاحب کی صحت خراب کی۔ آغا صاحب کو صرف لاہور ہی کا بار بار سفر نہیں کرنا پڑا بلکہ کئی دیگر جگہوں کے ہاسٹلز کی زمینوں کے تحفظ کے لیے بھی سفر کرنا پڑتا تھا۔ کراچی ہاسٹل کی زمین عبدالستار افغانی کی میسر شپ کے زمانے میں باقاعدہ سرکاری نرخ کے مطابق پوری ادائیگی کر کے حاصل کی گئی تھی۔ اس میں بھی بعد میں مسائل پیدا ہو گئے تھے، حالانکہ یوتھ ہاسٹل کے سرکاری ادارے کے ڈی اے کو تعمیر کا کام سونپا تھا۔ کے ڈی اے نے مجاز اتھارٹی سے نقشے پاس کرا کے تعمیر کا آغاز کیا تھا، جس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی گئیں اور بعد میں آنے والی صوبائی حکومت نے ہاسٹل کی زمین پر من پسند افراد کو نوازنے کے لیے پلاٹ بنانے کا منصوبہ بنالیا۔ جس سے حکومت کو باز رکھنے کے لیے بھی آغا صاحب کو بڑی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ کراچی ہاسٹل کی زمین کو طاقت وروں کے قبضے میں جانے سے بچانے کے لیے جناب ملک معراج خالد نے بھی کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

جناب ملک معراج خالد (مرحوم) نے ہی صوبائی حکومت کو اس سے باز رکھا تھا۔ میں نے آغا صاحب کے ساتھ پاکستان یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن کے سلسلہ میں سفر کیے۔ انھیں کام کا جنون تھا۔ تب ہی تو ان کو تنہا بڑے بڑے کام کر کے قوم کے محروم طبقات اور کم وسائل لوگوں کو سہولتیں فراہم کرنے کی دھن سوار رہتی تھی۔ میں نے ملک کے اندر بھی سفر کے دوران انھیں اپنے ساتھیوں کے آرام کا خیال رکھتے دیکھا۔ ۲۰۰۴ء میں انڈیا یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن کی دعوت پر بھارت کے پندرہ روزہ دورے کے سفر میں بھی ساتھیوں کے آرام کا خیال رکھتے پایا۔ بھارت کے سفر میں

جس نے توبہ کی

”اور جس نے توبہ کی۔ ایمان لایا اور اچھے کام کیے، تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں بدل دے گا اور اللہ کریم تو بخشنے والا اور مہربان ہے اور جو توبہ کرتا ہے اور عمل نیک کرتا ہے، تو بے شک وہ اللہ کریم کی طرف رجوع کرتا ہے۔

(سورۃ فرقان ۲۵، آیت: ۷۰)

آل انڈیا مسلم لیگ کے صفِ اول کے راہنما اور مسلمانان ہند کے محسن بھی تھے۔ ان کے دادا نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر پائے گی۔ ان کی ادارت میں رسالہ ”مخزن“ کو برصغیر میں جو مقام حاصل تھا، وہ کم ہی کسی اور جریدے کو نصیب ہوا۔ جو ادیب ”مخزن“ میں چھپ گیا، وہ امر ہو گیا۔

سر عبدالقادر کو دسمبر ۱۹۲۶ء میں قائد اعظم نے ٹیلی گرام کے ذریعے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں منعقدہ دہلی کی صدارت کے لیے بلایا تھا۔ اتفاق سے سر عبدالقادر کو اجلاس میں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی، تو قائد اعظم نے مسلم لیگ کا اجلاس دو گھنٹے تک ملتوی رکھا۔ قائد اعظم نے اپنی سیاسی زندگی میں ایسا انتظار کسی اور کے لیے نہیں کیا۔ سر عبدالقادر کے یہ سب اعزازات اپنی جگہ، مگر قدرت نے علامہ اقبال کے مجموعے ”بانگ درا“ پر مقدمہ لکھنے کا اعزاز عطا کر کے ان کو امر کر دیا۔ تاریخ اس اعزاز کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہمیشہ عظیم روایات کا محافظ اور امین بنائے رکھے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محترمہ پروین قادر کو اپنے شوہر نامدار آغا افضل حسین کے مشن کو آگے بڑھانے کا حوصلہ عطا کرے تاکہ یوتھ ہاسٹل کے منصوبوں میں آغا صاحب کی ٹیم کو سرگرم رکھنے میں بھرپور کردار ادا کر سکیں۔ آمین

چاروں صوبوں سے چالیس افراد شامل تھے۔ کاش وہ اپنے آرام کا بھی خیال رکھتے۔ دوسروں کے لیے ایثار و قربانی ان کی سرشت میں خدا نے ودیعت کی تھی۔ اللہ نے ان کو بلا کا تحمل اور برداشت کا حوصلہ دیا تھا۔ میرا ان سے تعارف ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کراچی میں ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر ڈاکٹر آغا ناصر حسین کی رہائش گاہ پر ہوا تھا۔ آغا ناصر کراچی میں غزالی روڈ بلاک ۲ پی ای سی ایچ ایس میں میرے پڑوسی تھے اور میرے عزیز دوست ڈاکٹر انوار حسین صدیقی کے گہرے دوست تھے۔ دونوں نے امریکا کی ایک ہی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی تھی۔

ڈاکٹر انوار حسین صدیقی اکثر شام کو آغا ناصر حسین سے ملنے آتے، تو میرے پاس بھی ضرور آتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر انوار حسین صدیقی نے آغا افضل حسین سے میرا تعارف کرایا تھا۔ ڈاکٹر آغا ناصر صاحب واپس امریکا پڑھانے چلے گئے۔ آغا افضل حسین سے ان کے گھر پر یہ تعارف آغا صاحب سے میری دوستی میں تبدیل ہو گیا جو آخری سال تک برقرار رہا۔ میں اپنی طویل رفاقت کے مشاہدے میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ اللہ نے آغا صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ پروین قادر آغا کو وسعتِ قلب بھی عطا کی تھی اور سیر چشم بھی بنایا تھا۔

دونوں ہی اپنے پرائے کی کمینز کے بغیر ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتے، ان کی عزت نفس کا خیال رکھنے کی توفیق خدا اپنے شکرگزار بندوں ہی کو عطا فرماتا ہے۔ دونوں میاں بیوی پاکستان کو عطیہ خداوندی تصور کرتے تھے، اس سے محبت کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے۔ میں نے انھیں ہمیشہ پاکستان کا کیس دلیل اور منطق کے ساتھ پیش کرتے دیکھا۔ اور کیوں نہ کرتے، آخر ان کے گھرانوں نے اس کے لیے قربانیاں بھی تو دی تھیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ پروین قادر آغا آخر تھیں کس کی پوتی؟ ان کے دادا سر عبدالقادر (مرحوم و مغفور)

تاریخ اسلام

لیے شامل اشاعت ہے۔

☆☆

”تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ نیک آدمی اس آواز سے پہچانا جاتا ہے جو خدا اپنے بندوں کی زبان پر اس کے لیے جاری کر دیتا ہے۔“
”لہذا تیرا دل پسند ذخیرہ عمل صالح کا ذخیرہ ہو۔ یہ ذخیرہ اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ تجھے اپنے خواہشوں پر قابو حاصل ہو۔ جو چیز حلال نہیں ہے، اس کے لیے تیرا دل کتنا ہی مچلے، اپنے آپ کو اس سے دور رکھ۔ یہ بھی جان لو کہ محبوبات و مکروہات میں نفس کی مخالفت کرنا ہی نفس سے انصاف ہے۔ اپنے دل میں رعایا کے لیے رحم، محبت اور لطف پیدا کرنا۔ خبردار! رعایا کے حق میں پھار کھانے والا درندہ نہ بن جانا کہ اسے لقمہ بنا ڈالنے ہی

مالک بن الحارث اشتر خلیفہ چہارم کے رفیق، ان کی فوج کے سپہ سالار اور سپاہی تھے۔ حضرت علیؑ نے انھیں دستور حکومت کی تعلیم دی اور قوانین اسلام پر عمل کا سبق پڑھایا۔ مالک بن اشتر کو محمد بن ابی بکرؓ کے بعد مصر کا گورنر مقرر کیا گیا۔ مندرجہ ذیل دستور حکومت حضرت علیؑ نے انھیں ایک خط کے ذریعے بھیجا تھا اور اس پر عمل کی تلقین کی تھی۔

۱۹۹۶ء بینظیر حکومت کی معزولی کے بعد صدر فاروق لغاری نے وزارت عظمیٰ کی ذمہ داری ملک معراج خالد کو سونپی، تو انھوں نے حضرت علیؑ کے متذکرہ بالا مکتوب کو نشان راہ بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ چنانچہ وزارت مذہبی امور کو کہا گیا کہ اس مکتوب کی نقول سب محکموں کو ارسال کی جائیں۔ ذیل میں اخلاقیات سے متعلق خط کا حصہ قارئین کی دلچسپی کے

مکتوب

حضرت علیؑ

حکمرانوں کو راہِ حق دکھلانے
والی تاریخی دستاویز

میں تجھے اپنی کامیابی دکھائی دے۔

”رعایا میں دو قسم کے آدمی ہوں گے، تمہارے دینی بھائی یا مخلوق خدا ہونے کے لحاظ سے تمہارے جیسے آدمی۔ لوگوں سے غلطیاں تو ہوتی ہی ہیں، جان بوجھ کے یا بھول چوک سے ٹھوکریں کھاتے ہی رہتے ہیں۔ تم اپنے عفو و کرم کا دامن خطا کاروں کے لیے اس طرح پھیلا دینا، جس طرح تمہاری آرزو ہے کہ خدا تمہاری خطاؤں کے لیے اپنا دامن عفو و کرم پھیلا دے۔“

”یہ کبھی نہ بھولنا کہ تم رعایا کے افسر ہو، خلیفہ تمہارا افسر ہے اور خدا خلیفہ کے اوپر حاکم ہے۔ خلیفہ نے تمہیں گورنر بنایا اور مصر کی ترقی و اصلاح کی ذمہ داری تمہیں سونپ دی ہے۔ خدا سے لڑائی نہ مول لینا کیونکہ آدمی کے لیے خدا سے کوئی بچاؤ نہیں۔ خدا کے عفو و رحمت سے تم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ عفو پر کبھی نادم نہ ہونا۔ سزا دینے پر کبھی شخی نہ بگھارنا۔ غصہ آتے ہی دوڑ نہ پڑنا بلکہ جہاں تک ممکن ہو، غصے سے بچنا اور غصے کو پی جانا۔“

”خبردار! رعایا سے کبھی نہ کہنا کہ میں تمہارا حاکم بنا دیا گیا ہوں! اور اب میں ہی سب کچھ ہوں، سب کو میری تابعداری کرنی چاہیے۔ اس ذہنیت سے دل میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ دین میں کمزوری آتی اور بربادی کے لیے بلاوا آتا ہے اور اگر حکومت کی وجہ سے غرور پیدا ہونے لگے، تو سب سے بڑے بادشاہ خدا کی طرف دیکھنا جو تمہارے اوپر ہے اور تم پر وہ قدرت رکھتا ہے، جو تم خود بھی اپنے آپ نہیں رکھتے۔ ایسا کرو گے، تو نفس کی طغیانی کم ہو جائے گی۔ حد سے گھٹ جائے گی اور بھٹکی ہوئی روح لوٹ آئے گی۔“

”خبردار! خدا کے ساتھ اس کی عظمت میں بازی نہ لگانا۔ اس کی جبروت میں تشبہ اختیار نہ کرنا کیونکہ خدا جباروں کو ذلیل کر ڈالتا اور مغروروں کو نیچا دکھا دیتا ہے۔“

”اپنی ذات کے معاملے میں، اپنے خاص عزیزوں کے معاملے میں، جنہیں تم اپنی رعایا میں سے چاہتے ہو، خدا سے بھی انصاف کرنا اور خدا کے بندوں سے بھی۔ یہ نہ کرو

گے، تو ظلم کرنے لگو گے۔“

”یاد رکھو جو کوئی خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے، تو خدا خود اپنے مظلوم بندوں کی طرف سے ظالم کا حریف بن جاتا ہے۔ اور معلوم ہے خدا جس کا حریف بن جائے، اس کی حجت باطل ہو جاتی ہے۔ وہ خدا سے لڑائی ٹھاننے کا مجرم ہوتا ہے، یہاں تک کہ باز آجائے اور توبہ کر لے۔ خدا کی نعمت کو اس سے بڑھ کر بدلنے والی اور خدا کی عقوبت کو اس سے زیادہ بلانے والی کوئی چیز نہیں کہ آدمی ظلم کو اختیار کر لے۔ یاد رہے خدا مظلوموں کی سننا اور ظالموں کی تاک میں رہتا ہے۔“

”تمہیں سب سے زیادہ پسند وہ راہ ہونا چاہیے جو حق کے لحاظ سے سب سے زیادہ درمیانی، انصاف کی رو سے سب سے زیادہ عام اور رعایا کو سب سے زیادہ رضا مند کرنے والی ہو۔“

”یہ بھی یاد رکھو، عوام کی ناراضی خواص کی رضا مندی کو بہا لے جاتی ہے اور خواص کی ناراضی عوام کی ناراضی کے ہوتے ہوئے گوارا کر لی جاتی ہے۔“

”یہ بھی یاد رکھو کہ خوشحالی میں حاکم کے لیے سب سے بڑا بوجھ اور سب سے کم کار آمد انصاف سے کھسانے والے، مانگنے میں اصرار کرنے، بخشش و عطا کے موقع پر کم سے کم شکر گزار ہونے، انعام و اکرام سے محرومی پر عذر نہ سننے اور زمانے کی کروٹوں کے مقابلے میں سب سے کم ثابت قدم رہنے والے خواص ہی ہوتے ہیں۔ دین کا اصلی ستون، مسلمانوں کی اصل جمعیت، دشمن کے مقابلے میں اصلی طاقت امت کے عوام ہیں، لہذا عوام ہی کا تمہیں زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔“

”تمہاری مجلس سے سب سے زیادہ دور اور تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ مکروہ وہ شخص ہونا چاہیے جو لوگوں کے عیب ڈھونڈا کرتا ہے۔ لوگوں میں عیب تو ہوتے ہی ہیں، یہ کام حاکم کا ہے کہ ان کے عیب ڈھکے۔ خبردار چھپے ہوئے عیبوں کی کرید نہ کرنا۔ تمہارا منصب بس یہ ہے کہ جو عیب چھپے ہوئے ہیں، ان کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دو۔ حتیٰ المقدور لوگوں کے ڈھکے کو ڈھکا ہی رہنے

قول حضرت ابو بکر صدیقؓ

☆ وفادار اور مخلص ساتھیوں سے مل کر رہنا اور ان سے میل جول رکھنا، جس سے ملنا خلوص سے ملنا۔

☆ جب انسان صرف اللہ کے لیے کوئی کام کرے، تو خداوند تعالیٰ خود اس کا کفیل ہو جاتا ہے۔

☆ انسان کو چاہیے کہ دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے خود اپنے نفس کی بھی اصلاح کرے، یہ بہت ضروری ہے۔

☆ موت سے محبت کرو، تو زندگی عطا کی جائے گی۔
(انتخاب: سعید نذیر، ماڈل ٹاؤن، لاہور)

تعریف کی بھرمار سے آدمی میں غرور پیدا ہوتا ہے اور تمہارے سامنے نیکو کار اور خطا کار برابر نہ ہوں۔ ایسا کرنے سے نیکوں کی ہمت پست ہو جائے گی اور خطا کار اور بھی شوخ ہو جائیں گے۔
”ہر آدمی کو وہ جگہ دینا جس کا وہ اپنے عمل کے لحاظ سے مستحق ہے اور تمہیں جاننا چاہیے کہ رعایا میں اپنے حاکم کے ساتھ حسن ظن اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ حاکم رعایا پر رحم و کرم کی بارش کرتا رہے اس کی تکلیفیں دور کرے اور کوئی ایسا مطالبہ نہ کرے جو اس کے بس سے باہر ہو۔ یہ اصول تمہارے لیے کافی ہے، اس سے رعایا کا حسن ظن تمہیں بہت سی مشکلوں سے بچا دے گا۔

”خود تمہارے حسن ظن کے سب سے زیادہ مستحق وہ ہوں جو تمہارے امتحان میں سب سے اچھے اتریں۔ اسی طرح تمہارے سوئے ظن کے بھی سب سے زیادہ مستحق وہی ہوں جو آزمائش میں سب سے بُرے نکلیں۔ کسی اچھے دستور کو نہ توڑنا، جو اس امت کے اگلے لوگ جاری کر گئے ہیں اور جس سے لوگوں میں اتحاد پیدا ہوتا ہے، رعایا کی بھلائی ہوتی ہے۔ اگر توڑو گے تو اچھے دستوروں کا ثواب اگلوں کے لیے باقی رہے گا اور عذاب تمہارے حصے میں آئے گا کہ بھلی راہ تم نے مٹا دی۔ اس بارے میں اہل علم و عرفان سے مشورہ کرتے رہنا کہ تعمیر و اصلاح کے وسائل کیا ہیں اور انہیں کس طرح استحکام و دوام بخشا جائے۔“

دینا۔ ایسا کرو گے، تو خدا بھی تمہارے وہ عیب ڈھکے رہنے دے گا، جو تم رعایا سے چھپانا چاہتے ہو۔

”وہ سب اسباب دور کر دینا جو لوگوں میں بغض و کینہ پیدا کرتے ہیں، عداوت و غیبت کی ہر سی کاٹ ڈالنا۔ خبردار! چغل خور کی بات ماننے میں جلدی نہ کرنا، کیونکہ وہ دغا باز ہوتا ہے۔ وہ خیر خواہ کا روپ دھار کر سامنے آتا ہے۔ اپنے مشورے میں بخیل کو شریک نہ کرنا کیونکہ وہ تمہیں احسان کرنے سے روکے اور فقر سے ڈرائے گا۔ بزدل کو بھی صلاح میں شریک نہ کرنا کیونکہ مہمات میں تمہاری ہمت کمزور کر دے گا۔ حریص کو بھی شریک نہ کرنا، کیونکہ ظلم کی راہ سے دولت سمیٹنے کی ترغیب دے گا۔ یاد رکھو بخل، بزدلی، حرص اگرچہ الگ الگ خصلتیں ہیں، مگر ان کی بنیاد خدا سے سوئے ظن پر ہے۔

”بدترین وزیر وہ ہے جو شریعوں کی طرف داری کرے اور گناہوں میں ان کا سا جھمی ہو۔ ایسے آدمی کو اپنا وزیر نہ بنانا۔ کیونکہ اس قسم کے لوگ گناہ گاروں کے مددگار اور ظالموں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان کی جگہ تمہیں ایسے آدمی مل جائیں گے جو عقل و تدبیر میں ان کے برابر ہوں گے، مگر گناہوں سے ان کی طرح لگے نہ ہوں گے، نہ کسی ظالم کی اس کے ظلم میں مدد کی ہوگی نہ کسی گناہ گار کا اس کے گناہ میں ساتھ دیا ہوگا۔ یہ لوگ تمہیں کم تکلیف دیں گے۔ تمہارے بہترین مددگار ثابت ہوں گے۔ تم سے پوری ہمدردی رکھیں گے اور غیر سے اپنے سب رشتے کاٹ لیں گے۔ ایسے ہی لوگوں کو نجی صحبتوں اور عام درباروں میں اپنا مصاحب بنانا۔

”یہ بھی یاد رہے کہ خاص الخاص لوگوں میں بھی وہی تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ مقبول ہوں جو زیادہ سے زیادہ کڑوی بات تم سے کہہ سکتے ہوں اور ان کاموں میں تمہارا ساتھ دینے سے انکار کر سکتے ہوں، جو خدا اپنے بندوں کے لیے ناپسند فرما چکا۔ اہل تقویٰ و صدق کو اپنا مصاحب بنانا، انہیں ایسی تربیت دینا کہ تمہاری جھوٹی تعریف کبھی نہ کریں، کیونکہ

نے گھیر لیا کہ میری جان اس تکلیف سے بے آرام ہو گئی۔ حتیٰ کہ ذکر الہی کرنے سے عاجز اور مجبور ہو گیا۔ اب اگر آپ کا روئے اقدس نہ دیکھتا تو بس میرا کام تمام ہو چکا ہوتا۔ آپ کی عیادت نے مجھ کو نئی زندگی دے دی۔“

آپ نے صحابی کی باتیں سن کر ناراضگی کا اظہار کیا اور منع فرمایا کہ آئندہ ایسی نامناسب دعا مت کرنا، یہ آداب بندگی کے خلاف ہے کہ انسان اپنے مالک دو جہاں سے عذاب و بلا طلب کرے۔ یہ واقعہ سنا کہ مولانا رومی لکھتے ہیں، انسان ایک کمزور چیونٹی کی مانند ہے۔ اس میں یہ طاقت کہاں کہ آزمائش کا اتنا پہاڑ اٹھا سکے؟ صحابی نے عرض کیا ”اے پیارے نبی میری ہزار بار توبہ میں آئندہ کبھی بھی اپنی زبان پر ایسی دعا نہ لاؤں گا۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ میری رہنمائی فرمائیں۔“ آپ نے اس کو نصیحت فرمائی۔

اللہم ربنا آتنا فی دار دینا حسن

وآتنا فی دار عقبانا حسن

ترجمہ: اے اللہ دنیا میں ہمیں بھلائیاں عطا فرما اور آخرت میں ہم کو بھلائیاں عطا فرما۔ خدا تمہاری مصیبت کے کانٹوں کو گلشنِ راحت میں تبدیل کر دے۔ آمین۔

یہ واقعہ ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ خدا کی

طرف سے عطا شدہ نعمتوں کی

ناشکری کرنے

سے اللہ تعالیٰ اور

ان کے رسول

ناراض ہوتے

ہیں۔ نامناسب

دعا آداب بندگی

کے خلاف ہے۔



ناشکرے نہ بنئیے

حیاتِ رسول ﷺ سے ایک سبق آموز واقعے کا تحفہ

یا سرِ عرفات

سیر میں درج ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سخت بیمار ہو گئے۔ شدتِ ضعف نے انہیں اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور کر دیا۔ جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صحابی کی بیماری کا علم ہوا، تو عیادت کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ بیمار صحابی نے جب آپ کو دیکھا تو خوشی سے نئی زندگی محسوس کی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اچانک زندہ ہو گیا۔ ”زہے نصیب اس بیماری نے مجھے خوش نصیب کر دیا جس کی بدولت میرے غریب خانے میں آپ کے مبارک قدم پڑے۔“ اس صحابی نے کہا ”اے میری بیماری، رنج و غم اور اے درد و بیداری شب، تجھے مبارک ہو بسبب تمہارے اس وقت نبی پاک میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔“ جب آپ عیادت سے فارغ ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا ”تمہیں کچھ یاد ہے کہ تم نے حالتِ صحت میں کوئی نامناسب دعا مانگی ہو؟“

انہوں نے کہا ”مجھے کچھ یاد نہیں کہ کیا دعا مانگی تھی۔“ تھوڑے ہی وقفے کے بعد حضور کی برکت سے صحابی کو وہ دعا یاد آ گئی۔ انہوں نے عرض کیا:

”میں نے اپنے اعمال کی کوتاہیوں اور خطاؤں کے پیش نظر یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ تعالیٰ وہ عذاب جو آخرت میں آپ دیں گے، وہ مجھے اس عالم دنیا میں دے دیں تاکہ عالم آخرت کے عذاب سے فارغ ہو جاؤں۔ یہ دعا میں نے بار بار مانگی یہاں تک کہ میں بیمار ہو گیا اور یہ نوبت آ گئی کہ مجھ کو ایسی شدید بیماری

بزرگان دین

عالم مفسر، محدث اور صوفی بزرگ تھے۔ چنانچہ آپ نے جوں ہی ہوش سنبھالا آپ کے کانوں میں تلاوت قرآن پاک کی آواز پہنچی۔ حدیث کی سماعت کا موقع ملا اور ہر جانب علم کا چرچا دیکھا۔ بچپن ہی سے ماموں کے زیر تربیت رہے۔ کم عمری ہی میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد تو حضرت سری سقطیؒ اپنے پیارے بھانجے کو اپنے گھر ہی لے آئے اور نہایت توجہ اور محبت سے پرورش کی۔

حضرت جنیدؒ سات برس کے ہوئے، تو حضرت سری سقطیؒ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اس مبارک سفر پر انھوں نے اپنے پیارے بھانجے کو بھی ساتھ لے لیا۔ ایک مقام پر حضرت

عراق کے امام الائمہ

حضرت جنید بغدادیؒ

معاشرے میں پھیلی برائیوں کے خلاف جہاد کرنے والے ممتاز صوفی بزرگ کی چشم کشادہ داستانِ حیات

کلیم چغتائی

کے مشہور شہر، نہاوند میں حضرت جنید بغدادیؒ

ایران کے اجداد آباد تھے۔ صوبہ جہال کا یہ شہر ہمدان سے چالیس میل جنوب میں واقع ہے۔ ۱۵۰ھ

میں دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے شہر بغداد تعمیر کروایا اور اسی کو دار الخلافہ مقرر کیا، تو اس شہر کی شہرت سن کر دور دور سے لوگ آ کر یہاں آباد ہونے لگے۔ حضرت جنیدؒ کے والد محمد قواری بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل تھے جو اپنے خاندان سمیت آ کر بغداد میں رہنے لگے۔

یہ تیسری صدی ہجری کا آغاز تھا جب محمد قواری کے ہاں ایک بچے کی پیدائش ہوئی۔ محمد قواری نے بچے کی والدہ اور ماموں کے مشورے سے بچے کا نام اس کے دادا کے نام پر جنید رکھا۔ جنید کے معنی ہیں 'چھوٹا سا لشکر' اور پھر گزرتے وقت نے دیکھا کہ قدرت نے اس نیک و سعید بچے کی ذات میں کس قدر خوبیاں یکجا کر دیں۔ حضرت جنیدؒ اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھے کہ ان کو نہایت عمدہ تعلیمی ماحول میسر آیا تھا۔ بغداد تو یوں بھی علم و فن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ پھر آپ کے والد، بے حد دیندار انسان تھے۔



والدہ ماجدہ بڑی متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ ان کے بھائی یعنی

حضرت جنیدؒ کے

ماموں، حضرت سری

سقطیؒ بہت بڑے



نایاب موتی

- ☆ مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوتی ہے۔
- ☆ اخلاق کا اچھا ہونا، محبت الہی کی علامت ہے۔
- ☆ جو نرمی سے محروم رہا وہ گویا ہرنیکی سے محروم رہا۔
- ☆ بد خلقی آدمی کے اخلاق کو ایسا چوٹ کرتی ہے جیسے سرکہ شہد کو مار دیتا ہے۔
- ☆ نیکی کی ترغیب دینے والا نیکی کرنے والے کے برابر ہے۔
- ☆ جن سے تم علم سیکھتے اور جن کو سکھاتے ہو، ان کی عزت کرو۔
- ☆ علم کی آفت اس کا بھول جانا ہے۔
- ☆ مرد پر سب سے زیادہ حق اس کی ماں کا ہے۔
- ☆ جس عورت کی موت ایسی حالت میں آئے کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہو وہ بہشتی ہے۔
- ☆ جب تم کسی بیمار کی عیادت کے لیے جاؤ، تو اس سے اپنے لیے دعا کراؤ۔ (محمد یونس انصاری، لاہور)

ہے۔ آپ کا زمانہ احادیث نبویؐ کی تدوین اور انھیں جمع کرنے کا زمانہ تھا۔ آپ نے بھی احادیث کی سماعت کی اور حدیثیں کتابت فرمائیں۔ آپ نے احادیث روایت بھی کی ہیں۔ طاؤس العلما حضرت جنیدؒ نے متعدد کتب تحریر فرمائیں افسوس کہ ان میں سے بہت سی کتابیں اب موجود نہیں ہیں۔ قرآن پاک کی تمثیلوں اور تشبیہوں کے بارے میں تفسیری نوعیت کی ایک کتاب ”امثال القرآن“ کے نام سے تحریر فرمائی۔ یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہے۔ حضرت سیدنا علیؑ جویریؒ (داتا گنج بخشؒ) نے آپ کی کتاب ”تصحیح الارادہ“ کا حوالہ دیا ہے، اس کتاب کا بھی کوئی نسخہ حاصل نہیں ہو سکا۔ دعاؤں اور مناجاتوں کے بارے میں آپ نے ایک کتاب ”کتاب المناجات“ کے

سری سقطیؒ اور دیگر بہت سے مشائخ کے درمیان ایک علمی بحث چھڑ گئی۔ موضوع تھا: ”شکر“۔ بحث طویل ہو گئی لیکن ”شکر“ کی کسی ایک تعریف پر سب کا اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ حضرت سری سقطیؒ کی نگاہ اپنے کمسن بھانجے جنیدؒ پر پڑی تو ان سے پوچھ لیا۔ ”بیٹے تم بتاؤ شکر الہی کیا ہوتا ہے؟“

اس قدر کم عمر بچے سے اس سوال کے جواب کی کسی کو توقع نہ تھی۔ لیکن تمام علمائے کرام نے حیرت اور خوشی کے ساتھ ننھے جنیدؒ کا جواب سنا جو کہہ رہے تھے۔ ”شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے ذریعے انسان اللہ کی نافرمانی نہ کرے بلکہ اپنی تمام تر توانائیوں کو اسی کی اطاعت میں صرف کر دیا جائے۔“ تمام مشائخ نے اس جواب پر خوش ہو کر کہا کہ آپ نے بہت خوب تعریف بیان فرمائی ہے۔

حضرت جنیدؒ کی فراست اور حکمت کا اندازہ آپ کے ماموں اور دیگر اساتذہ کو بہت شروع ہی میں ہو گیا تھا۔ ایک دن آپ حضرت سری سقطیؒ کی خدمت میں موجود تھے۔ اطراف میں اور کئی لوگ بیٹھے تھے۔ حضرت سریؒ سے کسی نے پوچھا ”کون سی ایسی چیز ہے جو آنکھوں سے نیند اڑا دے؟“

مختلف جواب آئے۔ کسی نے کہا۔ ”بھوکے رہنے سے نیند اڑ جاتی ہے۔“ کوئی بولا۔ ”پانی کم پیا جائے تو نیند نہیں آتی۔“ حضرت جنیدؒ کی باری آئی تو آپ نے عرض کی۔ ”دلوں کا اس بات کو جان لینا کہ اللہ تعالیٰ کو ہر شخص کے بارے میں پوری طرح خبر ہے کہ اس نے کیا کچھ کمایا ہے۔“

حضرت سریؒ نے یہ جواب سنا تو خوش ہو کر فرمایا ”پیارے بیٹے، تم نے خوب جواب دیا۔“ اس دن کے بعد حضرت سریؒ جب بھی کہیں تشریف لے جاتے، حضرت جنیدؒ کو اپنے قریب جگہ دیتے تھے۔

علم دین کو دور دور تک پھیلانے، فقہی مسائل کو عام فہم بنا کر پیش کرنے اور معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور غلط فہمیوں کی اصلاح کرنے میں امام الائمہ حضرت جنیدؒ کا بہت اعلیٰ مقام

عنوان سے لکھی۔ یہ بھی ناپید ہے۔ آپ کی دیگر کتب میں ”شرح شطحیات ابی یزید بسطامی“ ”منتخب الاسرار فی صفات الصدیقین والابرار“ ”العمدہ“ ”دواء الارواح“ شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں آپ نے اپنے استاد حضرت حارث محاسبی کے افکار کو اپنی زبان میں نقل فرمایا ہے۔

آپ کی ایک کتاب ”قصیدہ فی التصوف“ کا قلمی نسخہ برلن (جرمنی) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ان کے علاوہ آپ نے متعدد رسالے بھی تحریر فرمائے جن میں ”رسالہ فی تکذیب الرویت“ ”رسالہ دواء التفريط“ ”رسالہ فی مسائل الشامین“ شامل ہیں۔ ”کتاب الفناء“ ”کتاب الميثاق“ ”کتاب الالوبیت“ ”کتاب فی الفرق بین الاخلاص والصدق“ ”کتاب آداب“ ”المفتقر الی اللہ“ ”باب آخر فی التوحید“ ”مسائل ستہ“ ”آخر مسئلہ فی التوحید“ آپ کی دیگر مشہور تصانیف ہیں۔

آپ اپنے شاگردوں کو درس کی صورت میں تعلیم دیتے اور شاگرد آپ کی باتیں سن کر لکھتے جاتے تھے۔ آپ کی گفتگو کا انداز نہایت مؤثر اور عام فہم تھا۔ لیکچر کے بعد شاگردوں کے سوالات کے جواب بھی دیتے تھے۔ آپ موضوع سے ہٹ کر کبھی بات نہ کرتے اور جو کچھ فرماتے، دلیل اور منطق کی بنیاد پر بے حد سلجھے ہوئے انداز سے کرتے۔

حضرت جنید اپنے تلامذہ میں سب سے زیادہ توجہ ابو محمد اخذ بن محمد ابن الحسن الجریری کو دیا کرتے تھے۔ آپ نے انہی کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اس معاملے میں آپ نے اپنے اکلوتے صاحبزادے حضرت قاسم کو کبھی فوقیت نہیں دی، حالانکہ وہ بھی بڑے عالم و فاضل تھے۔ آپ کے دیگر شاگردوں میں ابو بکر ابن مجد الشبلی، ابو مغیث الحسین، ابن منصور الحلانج، حضرت ابو الحسین نوری، حضرت ابن عطا آدمی، حضرت جعفر خلوی، حضرت بایزید بسطامی، حضرت حاتم اصم، حضرت ابراہیم ابن ادہم، حضرت احمد بن الجالحواری جیسے جید علماء کرام شامل ہیں۔

آپ اپنے عہد کے دیگر بزرگان دین، مشائخ اور علماء کرام کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان سے خوشگوار تعلقات رکھتے تھے۔ بغداد، شام، بصرہ، نیشاپور اور دیگر تمام مقامات کے مشائخ آپ کے احباب میں شامل تھے۔ یہ بزرگان دین جب آپ سے ملنے آتے، تو آپ ان کی خوب خاطر تواضع کرتے۔ جواب میں یہ بزرگ بھی حضرت جنید کی خدمت میں تحائف بھیجا کرتے تھے۔ حضرت جنید ہر ایک کی ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ کوئی بیمار ہو جاتا، تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔

ایک بار آپ کے شاگرد حضرت نوری علیہ السلام ہوئے، تو آپ ان کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت جریری آپ کے شاگرد تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں سفر حج سے لوٹا، تو گھر جانے سے پہلے استاد محترم حضرت جنید کی خدمت میں چلا گیا تاکہ انھیں مجھ سے ملنے میں زحمت نہ ہو۔ دوسرے دن نماز فجر پڑھ کر بیٹھا ہی تھا کہ دیکھتا ہوں، حضرت جنید پیچھے کھڑے انتظار فرما رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ ”میں تو آپ کی خدمت میں حاضر اسی لیے ہوا تھا کہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔“ فرمایا۔ ”وہ آپ کی مہربانی تھی اور یہ آپ کا حق ہے۔“

آپ بے حد شفیق، حلیم اور کریم النفس بزرگ تھے۔ لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی فرماتے تھے اور خاموشی سے ان کی اصلاح کر دیتے۔ ابن سابط کا واقعہ تو بہت ہی مشہور ہے۔ وہ ایک ڈاکو تھا۔ ایک بار وہ گرفتار ہوا، تو سزا کے طور پر اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا اور کئی سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ رہا ہو کر آیا، تو اس نے پہلی رات ہی ایک گھر میں نقب لگائی۔ گھر میں داخل ہو کر اس نے دیکھا کہ کپڑوں کے تھان پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے ان کپڑوں کی گٹھری بنانے کی کوشش شروع کر دی لیکن ایک ہاتھ کٹا ہوا ہونے کی وجہ سے اسے مشکل پیش آرہی تھی۔

اتنے میں حضرت جنید اس کمرے میں تشریف لے آئے جہاں ابن سابط موجود تھا جو کپڑوں کی گٹھری باندھنے کی کوشش

عیش کوشی کا انجام

پہلے زمانے میں ایک بادشاہ ملکی معاملات میں غفلت کرتا تھا اور اپنی فوج کو خوش نہ رکھتا۔ اس کے حالات دیکھ کر پڑوسی ملک کے حاکم نے ایک زبردست فوج تیار کر کے حملہ کر دیا۔ اس بے پرواہ بادشاہ کی فوج اس کے مقابلے میں پسپا ہو گئی۔ جب کوئی حکومت اپنے خزانہ سے فوج کو حصہ دے کر خوش نہیں کرے گی، تو اس کے سپاہی اپنے ملک اور حاکم کے لیے جان کی بازی نہیں لگائیں گے اور اپنی جان بچائیں گے۔ ایسا سپاہی کب بادشاہ کے لیے لڑے گا جس کا پیٹ کھانے سے خالی ہوگا؟ یہ سپاہی باغی ہو کر دشمن کے ہاتھ مضبوط کریں گے۔

درس حیات:

۱۔ جس ملازم کو تنخواہ نہ دی جائے وہ کام میں کوتاہی کرتا ہے اور کبھی وفادار نہیں بنتا۔

۲۔ جو اپنے مخدوم کو بھول جائے اور اس سے منہ موڑ لے، وہ یقیناً بے وفا، کمینہ، نمک حرام اور ناپاک انسان ہے۔

۳۔ اپنے ماتحتوں پر ان کے درجہ اور مقام کے لحاظ سے مہربانی روا رکھیں۔

(ایڈووکیٹ نادیہ جعفری، دائرہ دین پناہ)

پہلے فقہ کا علم بھی حاصل نہیں کیا، وہ ایک ایسا شخص ہے جسے راہنمائی کرنے کا حق نہیں ہے۔

خیال ہے کہ آپ کا انتقال شوال ۱۲۹۷ھ یا ۱۲۹۸ھ میں ہوا۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے شاگرد حضرت ابو محمد جریری نے آپ کو غسل دیا اور کفن پہنایا۔ ”آپ کے صاحبزادے حضرت قاسم نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ اس کے بعد آپ کو شونیزہ کے قبرستان میں مغربی جانب، آپ کے ماموں اور قابل احترام استاد حضرت سری سقطی کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

کر رہا تھا۔ نیم تاریکی کی وجہ سے ابن سابط نے خیال کیا کہ یہ بھی کوئی ایسا شخص ہے جو اس مکان سے کچھ لینے کے لیے آگیا ہے۔ اس نے حضرت جنید کو حکم دیا کہ کپڑوں کی دو گٹھڑیاں بنائیں، ایک چھوٹی ایک بڑی، پھر ابن سابط نے چھوٹی گٹھڑی خود اٹھالی اور بڑی گٹھڑی حضرت جنید کو دے کر انھیں حکم دیا کہ وہ اسے لے کر چلیں۔

راستے بھر ابن سابط نے حضرت جنید کو برا بھلا کہا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر ابن سابط نے چھوٹی گٹھڑی انھیں بطور انعام دینا چاہی، تو انھوں نے متانت اور نرمی سے کہا۔ ”یہ تکلیف نہ کرو، وہ میرا ہی مکان ہے جہاں سے تم نے یہ کپڑے اٹھائے تھے۔ آئندہ کوئی ضرورت ہو، تو مجھے بتا دینا۔“ یہ کہا اور ابن سابط کو حیران چھوڑ کر چلے آئے۔

دوسرے دن ابن سابط آپ کی مسجد کے سامنے سے گزرا تو حضرت جنید کی آواز کان میں پڑی، آپ لوگوں کو توبہ کی تلقین فرما رہے تھے۔ قدرت نے ابن سابط کے دل کی حالت بدل دی، وہ اسی وقت حضرت جنید کے پاس پہنچا، توبہ کی اور پھر اپنے عہد کے بڑے بزرگ کہلائے۔

تاج العارفین حضرت جنید بغدادی کا ایک بڑا کارنامہ تصوف کی اصلاح ہے۔ آپ نے تصوف کے سلسلے میں پھیلی ہوئی مختلف غلط فہمیوں اور خامیوں کی اصلاح فرمائی۔ آپ تصوف کی راہ اختیار کرنے سے قبل قرآن و حدیث اور فقہ پر عبور حاصل کرنے پر تلقین کیا کرتے تھے۔ آپ کا کہنا ہے ”میں نے فقہ کی تعلیم حضرت ابو عبید اور حضرت ابو ثور جیسے اساتذہ حدیث کے مسلک کے مطابق حاصل کی، بعد میں، میں نے حضرت حارث المحاسبی اور حضرت سری بن مغلس جیسے صوفیا کی صحبت اختیار کی۔ یہی چیز میری کامیابی کا راز بنی، اس لیے کہ ہمارا علم ہمیشہ قرآن و حدیث کے ضابطہ کے اندر رہنا چاہیے۔ جس شخص نے قرآن حفظ نہیں کیا اور نہ ہی حدیث باقاعدہ طور پر پڑھی ہے اور تصوف کا رخ کرنے سے

تعمیر شخصیت

سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ کسی کی خوبیاں بیان کرنا اچھی بات ہے۔ ہنفسہ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن ایک انسان کی خوبیاں گننے میں تمام خامیوں کی نفی یا کسی کی تمام اچھائیوں کے انکار سے بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے۔

انصاف کا مطلب ہے: ایک شخص کو ایسا مقام دینا جس کا وہ مستحق ہے۔ اس کے برعکس کسی چیز کو صحیح اور جائز مقام نہ دینا ظلم کہلاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انصاف کے معنی ہیں اعتدال و توازن اور ظلم کا مطلب ہے حد سے تجاوز اور مبالغہ آمیز رویہ۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا اعتدال پسند ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بڑا منصف مزاج ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص ظالم ہے تو مطلب یہ کہ جو عمل وہ کر رہا ہے، اس میں وہ افراط و تفریط سے کام لیتا ہے۔

باری تعالیٰ ہے ”کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات

ارشاد پر آمادہ نہیں کرے کہ تم انصاف نہ کر سکو۔ بلکہ انصاف سے کام لو، (بلاشبہ) وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔“ (سورہ مائدہ: ۸)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، پیغمبر خدا ﷺ فرماتے ہیں ”جس سے پیار ہو، اس سے محبت اعتدال کے ساتھ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دن تمہارا مبعوض بن جائے۔ اور جس سے تمہیں بغض اور نفرت ہو، اس سے نفرت بھی اعتدال کے ساتھ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دن تمہارا محبوب بن جائے۔“ (ترمذی، جمع الفوائد)

بے اعتدالی ایک فتنہ اور بری خصلت ہے۔ اس کی وجہ سے کسی کا صحیح مقام جاننے میں غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ عام طور پر بعض لوگ جب کسی کی تعریف کریں، تو اس کی توصیف میں حد

اپنی روزمرہ زندگی میں لائیے

اعتدال

انسان کو افراط و تفریط سے بچانے والی اللہ پاک کی محبوب بشری صفت

محمد اقبال

اقوال حضرت عمر الفاروقؓ

☆ جونیک عمل دنیا میں کرو گے، اس کا پھل آخرت میں ملے گا۔

☆ صبر کا دامن پکڑ لو، یاد رکھو کہ صبر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ! مصیبتوں میں صبر کرنا اچھا ہے، لیکن ان امور سے بچنا جن سے اللہ نے روکا ہے، اعلیٰ صبر ہے۔

☆ قرآن کی تعلیمات کو سمجھو کیونکہ وہ علم کا سرچشمہ ہے اور دلوں کی بہار۔

☆ قرآن ہدایت کا سرچشمہ، علم کا کنول اور رحمن کی تازہ ترین کتاب ہے، اس کے ذریعے اللہ اندھی آنکھیں، بہرے کان اور بند دل کھول دیتا ہے۔

☆ نماز میں قرآن خوانی ایسی ہے جیسے کسی کو چھپا ہوا خزانہ مل جائے، اس میں بڑی خیر و برکت ہے۔ اس لیے جتنا زیادہ ہو سکے، قرآن پڑھا کرو۔

☆ نماز نور ہے، زکوٰۃ برہان، صبر روشنی، روزہ ڈھال اور قرآن تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف ایک دلیل ہے۔

☆ اللہ کا شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی عطا کردہ دولت سے زکوٰۃ ادا کرو جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

☆ جو کوئی عشا کی نماز بغیر پڑے سوئے، اللہ کرے اسے کبھی سونا نصیب نہ ہو، کبھی نصیب نہ ہو، کبھی نصیب نہ ہو۔ (انتخاب: لیاقت علی، قصور) ہو۔

برے اور ناشائستہ افعال و حرکات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اسی لیے خواندہ، مذہبی اور غور و فکر کرنے والے افراد کے معاشرے کو معتدل معاشرہ کہتے ہیں جو ہمارے دین اور انسانیت کا تقاضا ہے اور ہماری اخلاقی ذمہ داری بھی۔

(صاحب مضمون دارالعلوم، کورنگی، کراچی میں زیر تعلیم ہیں)

بعض معاشروں میں اکثر لوگ جب کسی کی مدح سرائی کریں تو اس کی تمام کمزوریوں سے صرف نظر کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ اس کے صحیح اور مناسب مقام کی پہچان نہیں کر پاتے۔ یا اسی طرح جب کسی کی مذمت کریں تو حد میں نہیں رہے۔ گویا ان کی لغت میں درجہ صفر ہے ایک یا سو، درمیان میں سرے سے کوئی نقطہ موجود ہی نہیں ہوتا۔

جب ہم کسی کے ساتھ دشمنی کریں، تو اس میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ حد میں رہنے کے بجائے سطحی جذباتیت اپنے اوپر غالب کر لیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ اعتدال میں نہ رہنا ہے۔ اسی طرح ہماری شدید محبت بھی بعض وقتوں میں حد اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے جس کے بے شمار نقصانات ہم آئے دن اپنے ارد گرد ماحول میں دیکھتے ہیں۔

خصوصاً اپنے بچوں کی محبت میں ان کی اخلاقی غلطیوں پر مناسب گرفت نہ کرنے کے باعث اولاد کی نافرمانی کی صورت پریشانیوں کا سامنا کرتے ہیں۔ اگر والدین اپنی اولاد کے ساتھ معتدل محبت کا رویہ اختیار کریں تو بے ادبی اور بے حیائی کا یہ سیلاب روکنا ممکن ہے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی کے ساتھ شدید محبت کے باعث اس سے کئی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ جب وہ ہماری توقعات پر پورا نہ اترے، تو ہماری شدید محبت مبالغہ آمیز نفرت میں بدل جاتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنے معاشرہ میں بے اعتدالی کے کئی رخ روزانہ کے حساب سے مشاہدہ کرتے ہیں۔

دینی امور میں بھی حد اعتدال پار کرنے سے متعدد خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ یوں معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ لہذا دینی امور کی ترغیب دیتے اور روشناس کراتے وقت اعتدال میں رہنا چاہیے۔

جس معاشرے میں تعلیم، دین اور سوچ بچار کی کمی ہو جائے، وہ عام طور پر بے اعتدالی کا شکار ہوتا ہے۔ نتیجتاً افراد میں تند مزاجی، جذباتیت، قطع کلامی اور بے اعتمادی جیسے



رکھے گا۔ لیکن اگر وہ اخلاق بد کا حامل ہو،
انا کے بت کو پوجتا رہے تو جلد یا بدیر ایسا
شخص معاشرے میں تنہا رہ جاتا
ہے۔ لوگ اس سے کنارہ کشی
اختیار کر لیتے ہیں۔

تواضع کے حوالے سے یہ

پراثر گفتگو سن کر ہمارے

معاشرے کی موجودہ اخلاق

واقدار اور معاشرت کی ایک

تصویر میرے ذہن کے کینوس

پر ابھرنے لگی۔ میں نے سوچا:

”ہمیں اجتماعی و انفرادی طور پر

اس وصف کو اپنے مابین

اجاگر کرنا چاہیے۔ یہ تواضع

ہی تو ہے جو ہمارے محبوب

صلی اللہ علیہ وسلم کے نمایاں

اوصاف میں شامل ہوا۔“

فتح مکہ کے وقت حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان

گلیوں میں گشت فرمایا جہاں

آپ مشرکین مکہ کی

خنتی، بدسلوکی اور

ہتک آمیز رویے کا

جو ٹہنی سر جھکائے گی.....

تواضع

خوشگوار زندگی کا راز

عبداللہ معتمد

نے ایک نگاہ اپنے سامنے بیٹھے مجمع پر ڈالی۔

سامعین کے چہروں پر تذبذب، تامل اور

استفسار کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس نے

ان کی الجھن دور کرنے کے لیے تعبیر کو

آسان بناتے ہوئے کہا:

”جھکی ہوئی شاخ سے لوگ زیادہ تعداد میں فائدہ

اٹھاتے ہیں۔ اس کا فیض ہر ایک کے لیے عام ہوتا ہے۔ کوئی

بھی اس سے مستفید ہونا چاہیے، وہ خود منع کرتی ہے نہ ہی

فائدہ اٹھانے والے کو ذرا تامل ہوتا ہے۔“

سامعین کو مطمئن پا کر اس نے گفتگو آگے بڑھائی:

”یہی مثال ایک متواضع انسان کی ہے۔ اگر وہ مخلوق خدا

کی خاطر تواضع کا دامن تھامے رکھے، انکسار کی چادر اوڑھے

رہے تو وہ ہر کسی کی محبت اور عقیدت کا محور بن جائے گا۔ ہر

ایک اس سے تعلق رکھنے اور جان پہچان بنانے کی خواہش

خطیب

گرم پانی سے بھی اتر نہ پائے۔“

”استغفر اللہ، اس فیشن کا ایسا انجام، یہ جان کر ہی جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔“ ایک خاتون گویا ہوئیں۔

کلثوم باجی ”مجھے پہلے بھی ایک ساتھی نے بتایا تھا کہ جب کسی خاتون نے نیل پالش لگائی ہو، تو مرنے کے بعد وہ کسی چیز سے نہیں اترتی۔ اس لیے غسل میت مکمل نہیں ہو پاتا۔“

ایک فوتیگی کی خبر اور غسل میت، دوسرے ایک معمولی فیشن کا ایسا بھیاں تک انجام جان کر ہی دل دہل گیا۔ مگر اتنی سی بات پر پولیس کا کیا کام؟

جواب نے مزید دہلادیا۔ ان خاتون نے خودکشی کی تھی اور پٹکے میں پھندا ڈال کر خود کو لٹکا لیا۔ اگلی صبح بیٹے نے پولیس کو بلایا۔ مقدمہ بننے پر پولیس نے لاش کا پوسٹ مارٹم کروایا۔ خودکشی اور پھر پوسٹ مارٹم کی وجہ سے میت کو غسل دینا انتہائی تکلیف دہ ہو گیا۔ لیکن مجال ہے کہ عاصمہ نے ناخن اتارنے کی مشکل کے وامیت کے بارے میں کوئی بات زبان سے نکالی۔ مجھے عاصمہ پر رشک آیا کیونکہ عورت ہو کر زبان بند رکھنا بہت بڑا کمال ہے۔ اس نے فقط خوفِ خدا اور سنت نبویؐ کی پیروی کرتے ہوئے خود کو روکے رکھا۔ مجھے اس کی قوت ایمانی اور جرأت و ہمت دیکھ کر عاصمہ کی دوست ہونے پر فخر محسوس ہوا۔

میری نظر میں بہت سے لوگ گھوم گئے جو فخر یہ بتاتے تھے کہ ہم نے خودکشی کی کوشش کی تھی یا جنہیں دنیا کے ہر مسئلے کا حل خودکشی ہی سوچتا ہے۔ میرا دل چاہا ان سب کو خودکشی حرام ہونے کا مطلب تو بتا دوں.....!

میں چھوٹی تھی، تو دل میں اس سوال نے جڑ پکڑ لی کہ کیا صرف اچھا بننا ہی زندگی کا مقصد ہے؟ تب یہ الجھن پیدا ہوئی کہ میں اچھی طالبہ ہوں، اچھی بیٹی بھی! پھر اسکول میں نتیجہ بھی بہترین ہوتا ہے۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ اگر میں نہ رہی، تو کون سا کوئی خاص فرق پڑے گا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے مجھے کیوں

پیدا کر دیا؟

یہ پڑھ کر قارئین یقیناً سوچیں گے کہ میں کتنی جاہل تھی! مگر میری سوچ اتنی پختہ ہوئی کہ میں زندگی سے بے زار ہو گئی۔ حتیٰ کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگی ”مجھے کیوں پیدا کر دیا؟ میں نے سارے کام کر لیے ہیں۔ اب مجھے اپنے پاس بلا لیں۔ مزید جی بھی لوں گی، تو کیا کر لوں گی۔ زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر بن جاؤں گی۔ پھر کیا ہوگا؟ بس اتنا ہی کافی ہے۔ میں

زندہ رہوں یا مر جاؤں، کیا فرق پڑے گا؟“

ایک دن علامہ اقبال کا ایک شعر سنا۔ امی جان نے سنایا تھا۔ دراصل جب میری الجھن زیادہ بڑھی، تو ایک روز یہ سوال ان سے کر دیا۔ امی جان روٹیاں پکا رہی تھیں۔ میں ساتھ کھڑی روٹیاں سینک رہی تھی۔ امی نے ایک نظر میری طرف دیکھا (آج سوچتی ہوں اتنے ”اعلیٰ“ خیالات سن کر دہل گئی ہوں گی) پھر کہنے لگیں ”بیٹا! ایسا نہیں سوچتے۔ استغفار کرو۔ کیا معلوم اللہ تعالیٰ نے تمہیں کس کام کے لیے بھیجا ہے؟ اور جو کام اللہ تعالیٰ نے آپ سے کروانا ہے، اس کا ابھی وقت ہی نہ آیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے لیے آپ کو اپنی صلاحیتیں مزید نکھارنے کی ضرورت ہو!“

گرہ کچھ ٹھلنے لگی، مگر ابھی الجھن باقی تھی۔ امی کچھ دیر خاموش رہیں پھر مخاطب ہوئیں۔

”میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی میں اسی لیے مسلمان، میں اسی لیے نمازی“

”بیٹا! نماز پڑھنا یا اچھا ہونا نہیں بلکہ مقصد زندگی تو زمین پر اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے۔ کیا یہ کام ہو گیا؟“

میں نے نفی میں سر بلایا۔ امی خاموش ہو گئیں اور میری الجھن بھی سلجھ گئی۔ اس کے بعد مجھے زندگی کبھی بے مقصد نہیں لگی اور نہ ہی میں نے یہ سوچا کہ خودکشی کر لوں۔ دعا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں حرام موت سے بچائے اور انہیں بھی جو اس کے خواہش مند ہو چکے۔

ظہور نظر: فن اور شخصیت

ڈاکٹر خالق تنویر کی اہم کتاب کا تعارف

ابوصارم



ریاست بہاولپور نے دنیائے علم و ادب کو دو اہم نام دیے..... ظہور نظر اور سید شہاب دہلوی۔ ظہور نظر اردو شاعری کا ایک بڑا نام ہے۔ افسوس کہ بعض دیگر عمدہ شاعروں کی طرح انھیں بھی بھلا دیا گیا۔ تاہم مرحوم خوش قسمت ہیں کہ انھیں ڈاکٹر خالق تنویر جیسا سوانح نگار مل چکا۔

ڈاکٹر خالق تنویر کا تعلق بہاول نگر کے علاقے سے ہے۔ جب اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور سے پی ایچ ڈی کرنے کا موقع آیا، تو آپ نے ظہور نظر کے فن و شخصیت کو اپنا موضوع بنایا۔ پی ایچ ڈی کا یہ مقالہ حال ہی میں طبع ہو کر سامنے آیا ہے۔

☆☆

ظہور نظر ۲۲ اگست ۱۹۲۳ء کو منٹگمری (ساہیوال) میں پیدا ہوئے۔ ۷ ستمبر ۱۹۸۱ء کو وفات پائی۔ نو بیٹیوں کے بعد پیدا ہوئے تھے، اس لیے خاندان میں سبھی کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ تاہم یہ خوشیاں زیادہ عرصے انھیں میسر نہ رہ سکیں۔

سات برس کے تھے کہ والد چل بسے۔ چنانچہ انھیں قادیان پہنچا دیا گیا جہاں مرحوم کے چچا زاد بھائی مقیم تھے۔ ظہور نظر ماں سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لیے والدہ کی جدائی انھیں بہت شاق گزری۔

قادیان میں ان پر نظر رکھنے والا کوئی نہیں رہا، چنانچہ

وہ آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومنے پھرنے لگے۔ جلد ہی وہ قصبے میں چھٹے ہوئے بد معاش بن گئے۔ چوری چکاری کرنا ان کا معمول بن گیا۔

جب والدہ تک خبریں پہنچیں کہ بیٹا آوارہ ہو چکا، تو ان کے غم کا ٹھکانا نہیں رہا۔ انھوں نے سارا سامان اور گھر فروخت کیا اور بیٹیوں کے ساتھ قادیان جا پہنچیں۔

والدہ کو یقین تھا کہ وہ بیٹے کو سیدھی راہ پر لے آئیں گی اور ایسا ہی ہوا۔ مگر معاشرہ ایک چور کو اپنے دامن میں جگہ دینے پر تیار نہ تھا۔ لہذا تنگ آکر ظہور نظر نے قادیان کو خیر باد کہہ دیا۔ وہ کچھ عرصہ لدھیانہ میں رہے، پھر ۱۹۴۵ء میں بہاولپور چلے آئے۔ اسی شہر میں ان کی بقیہ زندگی بسر ہوئی۔

”ظہور نظر: فن اور شخصیت“ میں ڈاکٹر خالق تنویر نے بڑی تفصیل سے اور دلچسپ انداز میں مرحوم کی ڈرامائی زندگی کو بیان کیا ہے۔ سوانح حیات کا یہ حصہ اپنی جگہ خاصے کی چیز ہے۔ یہ انسانی نفسیات کے تلخ و شیریں پہلوؤں کو بخوبی اجاگر کرتا ہے۔ ہر انسان اپنے اندر خوبیاں اور خامیاں، دونوں رکھتا ہے اور ظہور نظر کی سوانح یہ کلیہ واضح کرتی ہے۔

دلچسپ معلومات

کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ۶.۰۲×۱۰^{۲۳} کتنا بڑا نمبر ہے؟ اگر آپ ایک سیکنڈ میں ۱۰ لاکھ روپے خرچ کریں تو آپ کو ۶.۰۲×۱۰^{۲۳} روپے خرچ کرنے کے لیے ۱۱۹ ارب سال درکار ہوں گے۔ اس عرصے میں کئی انسانی نسلیں گزر جائیں گی؟

(امیر حمزہ بن مشتاق احمد، وار برٹن)

تا ۱۹۸۱ء کے دوران دوسو سے زائد ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ غرض مرحوم کی شخصیت کے بہت سے رنگ ہیں۔ وہ فلمی گیت نگار، صحافی، انقلابی، جاں نثار دوست، داستان طراز، لطیفہ ساز اور قلندر تھے۔ ڈاکٹر خالق تنویر نے مرحوم کی جامع کمالات شخصیت کو بڑی خوبصورتی سے ان مختصر جملوں میں سمیٹ دیا:

”ظہور نظر زندگی بھر غربت کے زخموں سے چور رہے۔

لیکن چہرے پر اس طرح مسکراہٹ سجائے رکھی کہ ان کی روح کے کرب کا ہلکا سا پرتو بھی کوئی نہ دیکھ سکا۔“

آخر میں ظہور نظر کی شاعری میں سے بعض اشعار کا انتخاب ملاحظہ فرمائیے:

ہوا جو یوں تو یہ خوبی ترے ہنر کی تھی
میری وفاؤں میں میرا کمال کوئی نہ تھا

وہاں بھی ہم نے کمائی حلال کی روزی
جہاں فرق حرام و حلال میں نہ تھا

خدا وہ دن نہ دکھائے نظر کہ مشکل میں
مرا مربی و محسن کبھی زمانہ بنے

جناب ڈاکٹر خالق تنویر نے اپنے مقالے کو جامع و مبسوط بنانے کے لیے بڑی تندہی و سرگرمی سے کام کیا۔ یہی وجہ ہے، ظہور نظر کی حیات کے ہر گوشے کو وا کرنے والا شاہکار وجود میں آ گیا۔ جناب جمیل یوسف ہمارے مدوح کی تعریف میں یوں رطب لسان ہیں:

”پروفیسر خالق تنویر نے اپنے مقالے کی تیاری میں بڑی تحقیق کی ہے۔ بڑی جدوجہد اور تلاش سے کام لیا ہے۔ جابجا اپنی تلاش اور تحقیق کے ثمرات سے اوراق کتاب کو مزین کیا ہے۔ مگر تحریر کا تسلسل، سلاست اور روانی کہیں مجروح نہیں ہوتی اور قاری بیان کے بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔“

☆ ☆

ظہور نظر کا اولین مجموعہ کلام ”ریزہ ریزہ“ ۱۹۴۴ء میں سامنے آیا۔ اس میں صرف وہ نظمیں شامل ہیں جو ۱۹۴۵ء تا ۱۹۶۶ء کہی گئیں۔ ۱۹۸۶ء میں دوسرا مجموعہ کلام ”وفا کا سفر“ شائع ہوا جو مرحوم کی غزلوں پر مشتمل ہے۔

ظہور نظر ترقی پسند تحریک کے فعال رکن تھے۔ انھوں نے کراچی کی ادبی تنظیم ”انجمن ترقی پسند مصنفین“ کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے، ان کی بیشتر نظموں کا موضوع عالمی و ملکی سطح پر بے بسوں پر ہونے والا ظلم و جبر ہے۔ لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ظہور نظر نے آزاد نظم کو عوامی سطح پر مقبول بنا دیا۔ اس ضمن میں مشہور شاعر و ادیب، احمد ندیم قاسمی وفا کا سفر کے فلیپ میں لکھتے ہیں:

”ظہور نظر نے تصدق حسین خالد، میراجی اور ن م راشد کے برعکس جو آزاد نظم لکھی، وہ میری نظر میں شاعری کی الگ صنف ہے۔ اگر آزاد شاعری کو ہمارے ہاں زندہ رہنا ہے، تو اسے ظہور نظر کا سلیقہ اختیار کرنا ہوگا کہ نظم کا آہنگ نہ صرف کہیں ٹوٹا نہیں ہر لفظ میں کھلتا چلا جاتا ہے۔“

ظہور نظر نے پنجابی زبان میں بھی نظمیں کہیں۔ نیز ۱۹۷۰ء

سچا واقعہ

سے کتنی کترا جانا ہے۔ عمانوئیل بہت سے آلات ساتھ لایا تھا جنہیں شمال کی بلند و بالا پہاڑی چوٹیوں پہ گاڑتے چلے جانا تھا۔ یہ کام وہ پاکستانی عملے سے اپنی نگرانی میں کروانا چاہتا تھا۔ یہ ایک دلچسپ مہم تھی۔ میرے فرائض میں عمانوئیل کا مددگار، مترجم ہونے کے علاوہ سامان اور عملے کی نگرانی کرنا بھی شامل تھا۔ عمانوئیل کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا تھا۔ سپاہیانہ چال ڈھال میں جان وین کا انداز اور لباس سے بے پروائی اسے دوسروں سے منفرد بنا دیتی۔

ہمارا قافلہ جیپوں پر روانہ ہوا۔ مگر آگے سرکیں محدود تھیں۔ ہم نے پندرہ ہزار فٹ بلند درہ برزل کو ایک جانب چھوڑا اور تقریباً بارہ ہزار فٹ تک ہی محدود رہے۔ عمانوئیل لیپ ٹاپ سے راستے متعین کرتا، سیٹلائٹ کی مدد سے گنڈنڈیاں کھوجتا اور غیر معروف پہاڑی راستوں کی راہ لیتا۔ وہ ایک آدھ چٹان پر پتھروں میں ڈرل کروا کے کیل نما آلہ

ہلکویاہ

دعا کے کراماتی اثر سے مبہوت ایک امریکی
عیسائی کی ناقابل فراموش داستان

آغا گل

دنوں میں میجر جنرل آغا مسعود الحسن کا اسٹاف آفیسر ان تھا۔ انھیں پاک فوج میں ”بابائے فضائی دفاع“ (فادر آف ایئر ڈیفنس) کہا جاتا ہے۔ ایک دن مواصلات کا امریکی ماہر، عمانوئیل (۱) آیا، تو مجھے اس کے ساتھ بطور رابطہ آفیسر بھی کر دیا گیا۔ اس کا سبب میری قابلیت تو نہ تھی بلکہ صرف یہ پہلو کہ میں پہاڑوں پر چڑھنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ ساتھ ہی محکمہ خارجہ نے مجھے دو گھنٹے کا لیکچر دیا کہ مجھے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں اور کن موضوعات



اپنے ہاتھوں سے گاڑ دیتا۔ ان چھوٹی سی تنگ پگڈنڈوں پر بوجھ لے کر چلنا مقامی قلیوں ہی کا کام تھا۔

جب بلند و بالا دروں میں تیز ہواؤں کے ریلے آتے، تو ہم چٹانوں میں پناہ لے لیتے۔ بعض اوقات طوفان کئی گھنٹوں جاری رہتا۔ اس کی زد میں آنے والا انسان تنکے کے مانند اڑ جاتا ہے۔ شکر ہے کہ ہمارا سامان محفوظ رہا اور کوئی فرد بھی اس کی لپیٹ میں نہ آیا۔ اگرچہ گرمیوں کا موسم تھا، مگر ان پہاڑوں پر خاصی سردی محسوس ہوتی خصوصاً شام ڈھلتے اور سورج طلوع ہوتے وقت خیموں سے باہر نکلنا تکلیف دہ تھا۔ عمانوئیل جفاکش اور محنتی انسان تھا۔ سرشام اس کے لیے خیمہ استادہ کر دیا جاتا۔ ہمارے اجتماعی خیمے تھے۔ وہ شاذ و نادر ہی مل کر کھانا کھاتا اور اپنے خیمے میں دو تین پیگ پی لیتا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم شغل سے نوشی پسند نہیں کرتے چنانچہ وہ ہماری ثقافت کا احترام کرتے ہوئے اپنی الگ محفل جھاتا۔ البتہ اکثر مجھے طلب کر لیا کرتا۔

اس کے لیے ڈبوں میں بند خوراک اور مشروب خاص کے کریٹ موجود تھے، مگر اس نے خود ہی اپنی حد مقرر کر رکھی تھی جس سے کبھی تجاوز نہ کرتا۔ وہ یوں تو کم گو انسان تھا، لیکن اکثر مے نوشی کے بعد بڑے مزے کی باتیں کرتا۔ اس نے ابتداء ہی میں مجھے منع کر دیا کہ میں اسے سرکہ کے مخاطب نہ کروں۔ ”یہ نوآبادیاتی انداز اور الفاظ امریکیوں کو اچھے نہیں لگتے، بس میرا نام لیا کرو۔ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھنا اور کھڑے ہو جانا بھی رسی سا ہے، میرا اتنا ہی احترام کرنا ہے، تو کام میں زیادہ ساتھ دو۔“

میں سر ہلاتا رہتا اور کوشش کرتا کہ بھرپور تعاون کا مظاہرہ کروں۔ غلام محمد، معین قریشی اور شوکت عزیز کو وزیراعظم بنانے والے مجھے بھی قبل از وقت سیکرٹری مواصلات بنا سکتے تھے۔ ان بلند و بالا پہاڑوں میں جہاں بے شمار خطرات تھے، میں ایک بہتر مستقبل کے لیے بھی راستہ بنا رہا تھا۔ عمانوئیل کی خوشنودی مجھے اعلیٰ مقام دلوا سکتی تھی، لہذا حکایات سعدی پہ پوری طرح عمل کرنے کی سعی کرتا۔

دس ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پہ درخت نہیں اگتے، تاہم جھاڑیاں اور قدرتی پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ ہم دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے وہ اکثر شام میں ساغرو مینا سامنے رکھ کر بقول شاعر میکدے سے اپنی جوانی اٹھلاتا تھا۔ پکا لاندہب تھا، تخلیق کائنات کے بارے میں ”بگ بینگ“ کے سوا کوئی نظریہ نہ مانتا۔ اس کا خیال تھا کہ خدا نے ہماری کہکشاں اینڈرومیڈا تخلیق کی، یہ نظام شمسی بنایا اور پھر دیگر کاموں میں لگ گیا۔ اس کی رائے میں خدائی کہکشاں بناتا اور نئی دنیاں بساتا ہے، چھوٹے موٹے کام اس کی عظمت کے خلاف ہیں۔ مصروف خدا سات ارب انسانوں کی پسند و ناپسند، اعمال اور دعاؤں پہ بھلا کیوں نظر رکھے؟ اس نے بس ایک نظام وضع کر دیا جو اپنے طور پر جاری و ساری ہے۔

سرکاری احکامات پس پشت ڈالتے ہوئے میں دھیمے لہجے میں بحث کرتا مبادا اپنے ایمان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں۔ یہ خدشہ بھی پیش نظر رہتا کہ کہیں عمانوئیل بھڑک نہ اٹھے۔ لیکن تھا وہ دلچسپ اور انسان دوست شخص! اس نے تاکید کر رکھی تھی کہ عملے کو دل کھول کر معاوضہ دیا جائے خصوصاً مقامی قلیوں کو جو اپنے علاقے سے ہمیں آگے پہنچا کر پلٹ جاتے۔ مگر ہر نئے مقام سے ہمیں تازہ دم قلی مل جاتے۔ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر وزن اٹھا کر چلنا ان ہی کا دل گردہ تھا۔ ورنہ تنگ و پر پیچ پگڈنڈیوں پر چلتے ہول آنے لگتا۔

ہمارے موبائل تو کب کے اضافی بوجھ بن چکے تھے۔ جبکہ عمانوئیل اپنے سیٹلائٹ موبائل کے ذریعے اپنے سفارت خانے اور ملک سے رابطے میں رہتا۔ ان پہاڑوں میں چھوٹے چھوٹے بکھرے گاؤں بھی راہ میں پڑتے تھے، مگر مکانات ایک دوسرے سے خاصے دور تھے۔ کہیں بھی بیس پچیس سے زیادہ مکان نہ دکھائی دیتے۔ وہاں قدرتی حسن تھا اور فطرت اپنی رعنائی کے ساتھ جلوہ گر رہتی۔ لیکن وہاں روٹی نہ تھی، صرف حسن تھا اور حسن سے پیٹ نہیں بھرتا ورنہ مرد و مرثیہ دور گرم میدانوں

میں روٹی کے لیے سرگرداں نہ رہتے۔ ان کے خاندان دو لخت ہوتے اور بٹ سے جاتے ہیں۔

اس گاؤں پر بھی بارشوں کے علاوہ غربت برسا کرتی تھی، مگر وہ تھے بہت ہی مہمان نواز! ہم نے منت سماجت سے انھیں رضامند کر لیا کہ صرف انڈے ہی بطور مہمانداری قبول کریں گے۔ باقی اشیاء مثلاً مرغیاں یا بکرے ہم قیثاً خریدیں گے۔ ہمارا کام بھی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ بیشتر قلی ہم نے فارغ کر دیے تھے۔ اب محض ڈیڑھ درجن قلی باقی تھے جو سڑک تک اترنے میں ساتھ دیتے، بوجھ اٹھاتے اور راہنمائی بھی کرتے۔ مزدوروں نے عمانوئیل اور میرے لیے خیمے گاڑے۔ انھیں قیام کے لیے آراستہ کیا پھر اپنے خیموں کی جانب متوجہ ہوئے۔ ہم نے پہر کی چائے پی، پرندوں کی چچہاہٹ، خود رو جھاڑیوں کی مہک، چشموں کی گنگناہٹ غرض ایک خواب آگیا منظر تھا۔

سیکیورٹی گارڈز حسب سابق چاک چوبند اور مستعد تھے۔ ہمیں انھوں نے ہی خبر دی کہ گاؤں کی چھوٹی سی مسجد میں چند اجنبی قیام پذیر ہیں۔ لہذا ہمارے قافلے کا کوئی فرد اس جانب نہ جائے۔ کیا عجب وہ طالبان ہوں۔ تاہم میں عمانوئیل سے اجازت لے کر مسجد چلا گیا تاکہ ان لوگوں سے مل کر یہ جان سکوں، کہیں وہ ہمارے لیے خطرناک تو نہیں۔

نماز مغرب پڑھ کر ان سے ملاقات ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد وہ بہت ہی محبت سے کھانے کے لیے مجبور کرنے لگے۔ ناہموار پتھروں کو گارے سے جوڑ کر یہ مسجد بنائی گئی تھی۔ اندر الٹینیں روشن تھیں۔ ایک جانب آشدان میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں قرونِ اولیٰ کے نمازیوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔

ان کا ایک ساتھی پاؤں رپٹنے کے باعث ہڈی تڑوا بیٹھا اور بستر پر نیم دراز تھا۔ اسے راولپنڈی اسپتال لے جانے کے مشورے ہو رہے تھے۔ یہاں تو جنازہ بھی دو کندھوں پہ اٹھتا

حضرت خواجہ حسن بھری

صوفیاء میں حضرت خواجہ حسن بھریؒ کی ذات گرامی محتاج بیان نہیں۔ آپ کی سیرت سے آپ کی دولت و ثروت اور شوکت و صولت بھی اظہر من الشمس ہے۔ آپ ہمیشہ شایانہ تزک و احتشام سے رہتے تھے۔ موتیوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ اسی لیے آپ کو حسن لؤلوی (موتیوں کا کاروبار کرنے والا حسن) کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

(امیر حمزہ بن مشتاق احمد، وار برٹن)

ہے۔ دشوار گزار پگڈنڈیوں پر چارپائی لے کر چلنا ناممکنات میں سے تھا۔ ان کا تعلق تبلیغی جماعت سے تھا جو گاؤں گاؤں قریہ قریہ اپنا بستر اور کھانے پینے کا سامان اٹھائے پھرتے، لوگوں کو دین کی جانب راغب اور نماز کی تلقین کرتے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کو زخمی سے ہمدردی تو تھی، مگر پہاڑوں سے اتار کے لے جانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ سب اللہ سے دعا مانگ رہے تھے کہ کوئی بیل نکل آئے۔ گاؤں کے لوگوں سے بھی کہتے کہ دعا کریں خصوصی طور پر کہ اللہ کوئی راہ نکال دے۔ جماعت کا امیر بہت ہی پر امید تھا کہ دعاؤں کے زیر اثر اللہ خود ہی کوئی انتظام کر دے گا۔ میں نے عمانوئیل کو واپس جا کر کہانی سنائی، تو اس نے اطمینان کی سانس لی کہ خود کش حملے کے امکانات نہیں رہے۔ وہ کہا کرتا کہ موت سے تو ہرگز نہیں ڈرتا البتہ خود کش حملہ آور سے خائف رہتا ہے کہ جسم کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں، بازو کہیں، ٹانگ کہیں۔ عمانوئیل کو تو گویا ایک ٹیسٹ کیس مل گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ چند روز وہ وہیں رہ کر دعاؤں کا اثر دیکھے گا۔ اس کا رویہ دوستانہ رہتا مگر تھا امریکی۔ لہذا ہمیں اس کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

اگلے روز میں عمانوئیل کی تاکید پر ادائیگی نماز کے بعد تبلیغی جماعت والوں سے گھل مل گیا۔ وہ ایک اسٹریچر بنانے کا سوچ رہے تھے تاکہ تدبیر اور تقدیر، دونوں کا ساتھ رہے۔ زخمی بھی پُر عزم تھا۔ لیکن بلند پہاڑوں کے جھکڑ، وادیوں کی بھری ہوائیں، اس پر مستزاد طوفان باد و باران! بادلوں کے چھا جانے سے دیکھنے کی صلاحیت کم ہو جایا کرتی ہے۔ خود چلنا دشوار ہو جایا کرتا کجا یہ کہ ایک اسٹریچر سنبھالتے ہوئے ناہموار پگڈنڈیوں سے اترتے چلے جانا اور برساتی نالے عبور کرنا!

عمانوئیل کی تجویز تھی کہ ہمارے قلی زخمی کو کمر پر لاد کے اتریں اور نصف گھنٹے بعد اسے دوسرا قلی سنبھال لے۔ مگر ایک زخمی کو یوں اتروانا اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہوتا۔ اور پھر ہمیں کئی روز مزید لگ جاتے۔ جبکہ نازکا پر بت جیسے قاتل پہاڑ پر طوفان کے آثار بڑھ رہے تھے۔ اس پورے علاقے کے موسم کو نازکا پر بت کنٹرول کرتا ہے۔ میں خاصا شش و پنج میں پڑ گیا۔ انجیل میں، تو مرقوم ہے کہ خداوند تو اپنے بندے کی آزمائش نہ کر اور یہ دعاؤں کو آزمانے پر مصر ہے۔ کیا یہ خدا کا امتحان لینا چاہتا ہے یا عقیدوں کا؟

اگلے روز اچانک فضا میں ہیلی کا پٹر کی آواز گونج اٹھی۔ محافظ تو گویا عمانوئیل پر ٹوٹ ہی پڑے۔ وہ اسے تقریباً گھسیٹے ہوئے چٹانوں کی محفوظ دراڑ میں لے گئے۔ بارہ اشاریہ سات کی طاقتور گن چٹان پہ لگائی۔ بندو قوں نے بعض نے ایس پی جی چڑھا لیے۔ وہ ممکنہ حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ میں نے بھی استدعا کی کہ مجھے کچھ تو دیا جائے تاکہ مرنا پڑے تو مقابلہ کرتے ہوئے مارا جاؤں۔ مجھے محافظوں نے ایک کلاشنکوف تھمادی جو ان کے بھاری ہتھیاروں کے مقابلے میں غلیل لگ رہی تھی۔

ہیلی کا پٹر نے ایک دائرے میں چکر لگایا اور ہمارے اوپر سے گھوم گیا۔ ہم سبھی پر سکون ہو گئے۔ وہ ہمارے ہی وطن عزیز

کا ہیلی کا پٹر نکلا۔ تھوڑی دیر بعد وادی میں گھوم کر نیچی اڑان بھرتا نمودار ہوا اور مسجد کے سامنے فضا میں معلق ہو گیا۔ اس کے سکڈ زمین سے نہ لگنے پائے تھے کہ کمانڈوز باہر کود پڑے۔ ادھر ادھر دائیں بائیں پوزیشنیں لیتے وہ مائیک پہ اعلان کرنے لگے کہ ہتھیار پھینک کر ہاتھ بلند کرتے باہر آ جاؤ۔ ہیلی کا پٹر کچھ دیر ہوا میں تھر تھراتا رہا اور پھر زمین پر اترے بغیر دور کی وادی میں غائب ہو گیا۔

وہ تمام نمازی جو مسجد میں مقیم تھے، یکے بعد دیگر باہر نکلتے رہے۔ حیرت کی بات یہ کہ ان کا سامان بھی ان کے ساتھ تھا۔ ان کی جامہ تلاشی لے کر ایک جانب بٹھا دیا جاتا۔ کوئی مزاحمت نہ ہوئی، بلکہ ان کے امیر نے درخواست کی کہ چائے بنانے کی اجازت دی جائے۔ وہ چائے سے تواضع کرتے ہوئے کمانڈوز کے ساتھ دین کی باتیں کرنا چاہتے تھے۔ زخمی کو ایک تو شک پر ڈال باہر لایا گیا۔

بدلتے ہوئے حالات غیر متوقع تھے۔ کمانڈوز کا کمانڈر، میجر اکبر بھی چکرا کے رہ گیا۔ میں بھی دراڑ سے باہر نکل آیا۔ تعارف ہوا اور ہم نے اپنے سرکاری کارڈ دکھائے۔ حیران و پریشان اور قدرے سراسیمہ سا عمانوئیل بھی دراڑ سے برآمد ہوا۔ چونکہ حکم تھا کہ ان بھی کو زندہ یا مردہ پیش کیا جائے، لہذا انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ہیلی کا پٹر جو کہیں وادیوں میں پھڑ پھڑا رہا تھا، چلا آیا اور گرجتا ہوا زمین پہ آ نکلا۔ ان رضا کارانہ طور پر گرفتار ہونے والوں سے کوئی ہتھیار برآمد نہ ہوا۔

میجر اکبر نے عمانوئیل کو بھی ہیلی کا پٹر میں بٹھا لیا۔ ان تمام کارروائیوں کے باوجود کمانڈوز انتہائی چوکنا اور محتاط تھے۔ خاص انداز میں وہ آہستہ آہستہ اٹنے قدموں ہیلی کا پٹر میں سوار ہو رہے تھے۔ اچانک نعروں کی آواز سنائی دی، دیکھا، تو تبلیغی جماعت والوں کا ایک ساتھی ہاتھ لہراتا دوڑے چلا آ رہا تھا۔ وہ آوازیں لگا رہا تھا:

”مجھے چھوڑ نہ جانا، میں ان کا ساتھی ہوں۔“ قریب پہنچا تو اسے ہینڈ زاپ کر کے تلاشی لی گئی۔ سینے پہ خودکش جیکٹ زیب تن نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ہتھیار برآمد ہوا۔ اسے بھی ہیلی کاپٹر میں بٹھالیا گیا۔ وہ یوں تو گرفتار یا حراست میں تھے، مگر نہایت ہی مطمئن اور پرسکون۔ ہیلی کاپٹر وادیوں کے درمیان اڑتا غائب ہوا، تو میں سر تھام کے بیٹھ گیا۔ ایک عجیب سا ڈراما ہوا تھا۔ یہ ان کی دعاؤں کا اثر تھا یا کسی مخبر کی اطلاع کہ انھیں ہیلی کاپٹر میں لے جایا گیا؟ یہ قسمت تھی یا حسن اتفاق..... مگر زخمی جا چکا تھا۔

عمانوئیل رخصت ہوا، تو میں ٹیم کا سربراہ بن گیا۔ چند روز سفر کے بعد ہم بخیریت سڑک تک جا پہنچے۔ قلیوں کو فارغ کیا۔ فالتو سامان بھی انھیں دے دیا اور جیپوں میں اسلام آباد کی راہ لی۔

میں نے جاتے ہی عمانوئیل سے رابطہ کیا۔ وہ بھی مجھ سے ملنے کا مشتاق تھا۔ اسی شام مجھے ڈپلومیٹک اسٹاپو بلا لیا۔ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ وہ ہماری طرح معافہ کرنے کا عادی ہو چکا تھا اور مصافحہ کرتے ہوئے ”السلام علیکم“ بھی کہنے لگا۔ اس کا ملازم کافی لے آیا۔ میرا تجسس میرے چہرے سے عیاں تھا۔ میں نے واپسی کے سفر کی روداد سنانے کے بجائے وہی معتمد پیش کیا۔

عمانوئیل نے بھی دیر نہ کی، بولا ”در اصل میرے سفارت خانے کو خفیہ اطلاع ملی تھی کہ طالبان مجھے اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اعلیٰ سطح پر مجھے بچانے اور واپس لانے کی درخواست کی گئی میں اس گاؤں میں انہی دنوں کیوں چلا آیا، یہ بھی ایک اچنبھا ہے۔ میں وہاں کیوں ٹھہرا ہا، یہ بھی حیرت کی بات ہے۔“

میں بے تاب ہوا جا رہا تھا، پوچھا ”ان لوگوں کا کیا بنا؟“ عمانوئیل مسکرایا ”ان کے راہپنڈی مرکز نے تصدیق کی کہ وہ جماعت ہی کے افراد ہیں۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق سفر میں تھے۔ انھیں تو معذرت کر کے چھوڑ دیا گیا۔ زخمی کو اسپتال میں داخل کرایا گیا جو تیزی سے رو بصحت ہے۔“

مجھ سے نہ رہا گیا، بولا ”عمانوئیل! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ محض اس زخمی کو لانے کے لیے خدا نے ہیلی کاپٹر بھجوایا۔ دعاؤں کے باعث وہ اکرام سے اسپتال چلا آیا۔“

عمانوئیل نے وقار کا مسئلہ نہ بنایا، بولا ”واقعات تو یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ڈرامے کے ڈراپ سین کی طرح سب کچھ اچانک ہوا۔“

مجھے اپنی کامیابی اور فتح پر خوشی ہو رہی تھی۔ ”گویا تم بھی دعاؤں کو ماننے لگے ہو۔“ اس سے پوچھا۔

عمانوئیل نے کندھے جھٹکے اور سوچتے ہوئے بولا ”یوں لگتا ہے، دعا کوئی سنگل ہے جو انسانی دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ برقی رو (Ectric Impulse) فوراً کائناتی حکمران (Universal Intellect) سے رابطہ کرتی ہے جو چیزوں کو حسب منشا گھما دیتا ہے۔“

مجھے تخت تاؤ چڑھا، کہا ”گویا تم اس کے حیرت انگیز واقعے کے بعد بھی اپنے ہی خیالات پر قائم ہو؟“

عمانوئیل نے ہاتھ بلند کیا اور بولا ”نہیں بلکہ میں سوچنے لگا ہوں کہ میرا نام عمانوئیل کیوں رکھا گیا؟ قدیم مسیحی، مارنٹھا (Maranatha) (۲) کیوں پکارا کرتے تھے اور بللویاہ (۳) کے کیا فوائد ہیں؟ ویسے! میں بھی دعائیں مانگنے لگا ہوں۔“

حواشی

۱۔ عمانوئیل: خدا ہمارے ساتھ ہو۔
۲۔ Maranatha: اے خداوند جلد آ..... انجیل میں مرقوم ایک کلمہ۔

۳۔ بللویاہ: خدا کی حمد ہو۔
(مضمون کے مصنف اعلیٰ سرکاری افسر رہے ہیں۔ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ بلوچستان سے تعلق ہے۔ طویل عرصے سے افسانے اور ناول لکھ رہے ہیں۔)

اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریداری کر

560 روپے کی غیر معمولی بچت پائیے * اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے



اردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے
معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے
ڈچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُر لطف بنائیے

قیمت فی پرچہ 100/- روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام _____
پتہ _____
فون نمبر _____
ای میل _____
میں ماہ _____ 20 سے اردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجئے۔
1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا
2۔ میں مطلوبہ رقم 1000/- روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا
3۔ میں نے 1000/- روپے اردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر 110-800380 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروادیے
ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔ یا
4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکریپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا
5۔ ہمیں 0301-8431886 پر ایس ایم ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔
دستخط _____ تاریخ _____

اردو ڈائجسٹ پرائیمری، سیکنڈری اور ہائی اسکول کے طلباء کے لیے دستیاب ہے۔
ای میل: urdu Digest@urdu-Digest.com یا 0301-8431886 پر ایس ایم ایس کریں۔
0301-8431886

عظیم ماں

افواج کے سپہ سالار جنرل راجیل شریف نے اگلے پاک مورچوں پر جوانوں سے خطاب میں کہا ”دفاع وطن کے مقدس فریضے کی انجام دہی کے لیے گھر سے دور رہنا پاک فوج کی ایک شاندار اور قابل فخر روایت ہے۔“ سپہ سالار اپنی والدہ ماجدہ کی رحلت کے اگلے روز اپنے جوانوں کے ساتھ تھے۔ فوجی اور خانہ بدوش میں یہ قدر مشترک ہے کہ

مٹی میں چراغ رکھ دیا

والدہ کے حضور ایک شکر گزار بیٹے کا منفرد نذرانہ عقیدت

محمد توفیق

ان کا پڑاؤ ہمیشہ عارضی ہوتا ہے اور جلد ہی انھیں خیمے اکھاڑ کرنی منزل کی راہ لینا ہوتی ہے۔ آخر نزوان حاصل کرنے کے لیے کپل وستو چھوڑنا ہی پڑتا ہے کہ ہجرت بنیادی اصول ہے۔ ایک فوجی افسر کے گھر آنکھ کھولنے اور ہوش سنبھالنے کے ناتے میں اس شاندار اور خوشگوار ہجرت اور شاہد کا امین ہوں۔ اس زمانے میں ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کا گھریلو سامان مختصر سا ہوتا تھا، زیادہ تمام جھام نہیں دو بڑے ٹرنک، بستر، کپڑوں اور برتنوں کے لیے اور چند لکڑی کے کریٹ فرنیچر کے لیے جن میں اس کا مختصر جہاں سمٹ آتا۔ ڈھاکہ اور رنگ پور، کھٹمنڈو، کراچی، لاہور، پنڈی، کوئٹہ غرض امی جی ہر شہر کی تہذیب، ذائقے اور رکھ رکھاؤ سے آشنا ہوئیں۔ لیکن ظرف اتنا بڑھا کہ کھٹمنڈو اور اپچی سن کالج میں محل نما رہائش میسر آئی تو چھٹا نہیں اور جھنگی سیدیاں میں دو کمرے کا کوارٹر ملا، تو بھی شکر سے لب زبانا۔ کسی فلسفی نے کہا تھا ”خدا نے اس لیے بنائی کہ وہ خود ہر گھر میں نہیں رہ سکتا۔“



لیکن ہر بن باس کاٹنے کے بعد گھوم پھر کر پڑاؤ ایبٹ آباد
بی بنا۔

تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات
سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں
ایک بار میں نے پاکستان آرمی کے نامور ڈاکٹر، جنرل
عبدالاحد نجمی سے پوچھا ”صحت دوا میں ہوتی ہے یا دعا میں؟“
انہوں نے ہنس کر جواب دیا، اگر مرض چھوٹا ہو تو دوا اور بڑا ہو تو دعا
میں۔ ”میں نے پوچھا“ اور دعا سے مریض کتنے عرصے میں ٹھیک
ہو جاتا ہے ”انہوں نے کہا“ مریض دعا خود کرے، تو عرصہ لگ
جاتا ہے اور اگر ماں کرے تو جلدی ٹھیک ہو جاتا ہے۔“ میں نے
پوچھا ”ماں کیوں“ جنرل نجمی نے جواب دیا ”ماں کی دعا میں
تڑپ ہوتی ہے، یہ منہ سے کچھ نہیں کہتی لیکن اس کا انگ انگ دعا
بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس وقت ہمیشہ کرم کرتا ہے۔“

ااریب ساری دنیا کی مائیں ایک سی ہوتی ہیں۔ اشفاق
احمد نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی والدہ ”سرداراں بیگم“ کے
بارے میں لکھا ہے ”وہ اپنے کسی کارخیر، کسی بھلائی، کسی ہمدردی
کا صلہ نہیں چاہتی تھیں۔ مرنے کے کچھ دن بعد ہم سب بھائی
بہن قبرستان گئے، تو قبر تلاش نہ کر سکے۔ ماں نے اپنی قبر کہیں
چھپالی تھی کہ ہمیں بار بار یہاں آنے، پھول چڑھانے، فاتحہ
پڑھنے کی زحمت نہ ہو۔“

معروف قانون دان چودھری اکرام وکالت کے ابتدائی
دنوں کے ایک مقدمے کا ذکر یوں کرتے ہیں ”ایک نیم پاگل
سے بیٹے نے چھری گھونپ کر ماں کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ یہ قوہ
گھر میں موجود کئی افراد نے دیکھا لیکن جب شدید ضرب سے
جاں بہ لب ماں کی نبضیں ڈوب رہی تھیں اور دل کی ڈھکنیں
بیٹھ رہی تھیں تو اس نے پولیس کو اپنا بیان نزعی قلم بند کراتے
ہوئے کہا ”مجھے میرے بیٹے نے نہیں مارا، یہ سب لوگ غلط کہ
رہے ہیں، میں نے خود اپنے آپ کو چھری ماری ہے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا ”اے

رب جنت میں میرا ساتھی کون ہوگا؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ
اے موسیٰ، تیرے شہر کا فلاں شخص قصاب جنت میں تیرا ساتھی
ہوگا۔ موسیٰ علیہ السلام فوراً اس قصاب کے تعاقب میں روانہ
ہو گئے۔ اس وقت وہ اپنی دکان بند کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں
گوشت تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے مہمان بننے کی
درخواست کی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کر لی۔ وہ قصاب
کے گھر گیا۔ گھر کا دروازہ کھولا۔ وہاں اس کی ایک سو دس سالہ
ماں چٹائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ قصاب نے اپنی ماں کا ہاتھ چوما۔ اس
کا منہ دھویا۔ بستر پر لٹا کر گوشت پکایا اور اپنی بوڑھی ماں کو اس
طرح کھلایا جس طرح کوئی چڑیا اپنے بچوں کو کھلاتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ بوڑھی ماں کی
خدمت کے بعد اس نے موسیٰ علیہ السلام کو کھانا کھلایا۔ موسیٰ
علیہ السلام سمجھ گئے کہ سب اس کی بوڑھی ماں کی دعاؤں کا نتیجہ
ہے کہ یہ شخص جنت میں میرا پڑوسی ہوگا۔ ماں کی خدمت کے
بعد جب وہ شخص جانے لگا، تو اس کی ماں نے اس کے کان میں
سرگوشی کی جس پر وہ شخص مسکرایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے قصاب
سے پوچھا کہ تیرے کان میں تیری ماں نے کیا کہا جس پر تو
مسکرایا؟ قصاب نے کہا کہ جب بھی میں ماں سے رخصت
ہونے لگتا ہوں تو یہ میرے کان میں کہتی ہے کہ جابیٹا جنت میں
تیرا گھر موسیٰ علیہ السلام کے پڑوس میں ہوگا۔ میں مسکرا دیتا
ہوں کہ کہاں میں شہر کا معمولی سا قصاب اور کہاں اللہ کا جلیل
القدر پیغمبر؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیری ماں درست کہتی
ہے کہ تو جنت میں میرا پڑوسی ہوگا۔

۲۶ جولائی ۲۰۰۹ء کی سہ پہر تین بج کر ۷ منٹ پر پی او
ایف اسپتال کے آئی۔ سی۔ یو وارڈ کے بیڈ نمبر ۳ پر دراز امی جی
کے پیروں کو میں نے دھیرے سے سہلایا، تو انہوں نے گہری
غنودگی سے چند لمحوں کی مہلت مانگ کر آنکھیں کھولیں۔ یوں
بھی کہتے ہیں کہ ”نیند موت کی بہن ہے۔“ ڈاکٹر وسیم الدین
کی قیادت میں مسیحاؤں کی پوری ٹیم ان کے ارد گرد حصار

بنائے ان کی جان بچانے کے لیے ملک الموت سے فیصلہ کن مذاکرات میں مصروف تھی۔ ان کے سر ہانے نصب مانیٹر پر دل کی دھڑکن، فشار خون اور شوگر کی بے ترتیب چبختی چنگھاڑتی لہریں بے بسی سے سگنل دے رہی تھیں کہ ”میں نے خدا کو اپنے ارادے کی شکست سے پہچانا۔“

امی جی کے چہرے پر آکسیجن ماسک، ناک میں خوراک کی نالی، دونوں بازوؤں پر گلوکوز اور پروٹین کی ڈرپس، سینے اور پیٹ پر ان گنت طبی آلات نصب تھے، مگر ان تمام جدید طبی آلات کی مشترکہ کاوشیں بھی ان کا فشار خون ۳۵ سے بلند کرنے میں گزشتہ کئی گھنٹوں سے مسلسل ناکام چلی آرہی تھیں۔ ادھر ادھر بھاگتے، آنکھیں چراتے ڈاکٹروں کے بے تاثر چہرے گویا اپنی شکست کی چغلی کھا رہے تھے۔ ڈاکٹر اگر کسی کو زندگی دے سکتے، تو کوئی ڈاکٹر کبھی خود موت کا ذائقہ نہ چکھتا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ ”شفا خدا دیتا اور فیس ڈاکٹر لیتا ہے۔“

پانی پلانے کے گلوگیر استفسار پر ان کی آنکھوں میں رضامندی کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ نقاہت کے باعث وہ بولنے یا سر کو جنبش دینے سے قاصر ہو چکی تھیں۔ ان کے سر ہانے بیٹھ کر میں نے آہستگی سے سر کو بلند کیا۔ چہرے سے آکسیجن ماسک ہٹا کر پانی کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگایا تو انھوں نے ادھورا گھونٹ لیا۔ اس لمحے میں نے ان کے ہونٹوں کے اطراف روؤں کو کانٹوں کے مانند کھڑے محسوس کیا۔ وجدان نے قدرت کا اشارہ بھانپ لیا اور جھک کر ان کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کلمہ ادا کیا، تو وہ آخری مرتبہ بیدار ہوئیں۔ میری درخواست پر انھوں نے چار مختصر اقساط میں ہلتے لبوں سے کلمہ ادا کیا جس کے اختتام پر ان کا سر دائیں جانب ڈھلک گیا۔ ان کی نبض تھامے ڈاکٹر نے برف جیسے سرد لہجے میں بولے سے کہا ”Sir, she is no more“ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مجھے محسوس ہوا ان کے پاؤں کے قریب کھڑے بیٹے ایسے سیارچے بن گئے ہوں جو

اپنے سینٹرائٹ کی کشش ثقل سے آزاد ہو کر خلا میں ہمیشہ کے لیے معلق ہو گئے اور اسپتال کی چھت اڑ گئی ہو۔

امی جی کا وصال ایسے زلزلے سے مشابہ تھا جس کے ساتھ اونچی عمارتیں ماتھا جوڑ کر ہٹ جاتی ہیں۔ ہزاروں واٹ کی بجلی گر کر سب کچھ بھسم کر جاتی ہے۔ وہ جس خاموشی سے دنیا میں رہیں، اسی خاموشی سے عقبی کو سدھار گئیں۔ غالباً اسی حسن خاتمہ کے لیے وہ اکثر دعا مانگا کرتی تھیں۔ سارتر نے کہا تھا ”جان توڑ محنت، ٹوٹا ہوا دل، آنسوؤں سے لبریز آنکھیں، خاموش ہونٹ اور پوشیدہ ارمانوں کی تپش! اس دنیا میں کوئی بھی عورت خاموش نہیں ہے۔“ اور ماں کی تو پوری حیات اس چھوٹے سے جملے میں مقید ہے ”وہ پیدا ہوئی، مصیبتیں برداشت کیں اور مر گئی۔“

اب میں اس کی قبر پر بیٹھا سوچ رہا ہوں میں نے ماں کا چہرہ غور سے کب دیکھا تھا جس دن میں نے آنکھیں کھولیں شاید اس دن یا جب اس نے پھیر لیں آنکھیں تب دیکھا تھا امی جی کی ۶۲ سالہ زندگی کو اگر تین لفظوں میں بیان کیا جائے تو وہ ہوں گے: ”دکھ، محبت اور خدمت۔“ ان کی شخصیت کمر نفی، مظلومیت اور بے چارگی کے خمیر سے گندھی تھی۔ سادگی اور درویشی کا قرینہ اور رکھ کھاؤ کچھ تو قدرت نے ان کی سرشت میں رکھا تھا اور کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے پیدا کیا تھا۔ امی جی کو کھلکھلا کر ہنستے تو شاید زندگی بھر نہیں دیکھا گیا، شفقت سے لبریز مسکراہٹ البتہ ان کا خاصہ تھی۔ ان کی مسکراہٹ ہمیشہ شیرخوار بچے کی مسکراہٹ ہوتی تھی، معصوم، بے اختیار اور لمحاتی.....

۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر تنویر کی پشاور میں آوارہ گولی کے ہاتھوں جوان مرگی کے بعد یہ مسکراہٹ بھی غنقا ہو گئی۔ گھر میں خوشی کا کوئی بھی موقع ہوتا وہ دل کے کسی کوئے کھدرے سے جھاز پونچھ کر تنویر کو برآمد کر ہی لیتیں۔ ہر سال ۹ جون کو اس کے یوم وفات

کے موقع پر وہ اس کا سفید اور کوٹ اور اسٹیتھو اسکوپ بڑے اہتمام سے ہینگر پر آویزاں کرتیں، انہیں سہلاتیں، پچکارتیں اور ارد گرد سے بے نیاز ہو کر خود کلامی کی کیفیت میں اس سے باتیں کرتیں، خصوصی اہتمام سے اس کے پسندیدہ کھانے اپنے ہاتھوں سے تیار کرتیں اور اہل محلہ میں تقسیم کرتیں۔ اس دن سارا گھر سوگواریت میں ڈوب جاتا اور ہر کوئی ان کا سامنا کرنے سے کتراتا۔ وہ زبان سے اپنے دکھ کا اظہار تو نہ کرتیں لیکن اس روز ان کا انگ انگ تنویر کی یاد میں لت پت ہوتا۔

سینکالے کہا تھا ”بلکے پھلکے غم اپنا اظہار کرتے ہیں، لیکن گہرے غم خاموش رہتے ہیں۔“ وہ کبھی کبھار کہا کرتی تھیں۔ ”خدا کرے ہر ماں باپ کا جنازہ ان کی اولاد اٹھائے، لیکن کسی ماں باپ کو جوان اولاد کے جنازے کو کندھانہ دینا پڑے۔“ عین عالم شباب میں تنویر کی وفات پر امی نے بس اتنا کہا تھا ”اللہ دی چیز آہی، اللہ چاہ کیدی“ (اللہ کی چیز تھی، اللہ نے لے لی) لیکن یہ زخم ساری زندگی ان کے اندر رستار ہا اور وہ چھپ کر اکیلے میں خون کے آنسو رویا کرتیں۔ ملاقاتی خواتین کے بال بچوں کی تعلیم کا احوال وہ بڑی دلچسپی اور اخلاص سے سنتیں، لیکن لاشعور میں جیسے خوف کا اظہار بھی کر ڈالتیں ”بیٹی بچوں کو اعلیٰ تعلیم ضرور دلاؤ لیکن انھیں ڈاکٹر نہ بنانا، ڈاکٹر جلد مر جاتے ہیں۔“ وہ اپنی خوش بختی اور بیٹوں پر معصوم سافخر کیا کرتی تھیں ”یہ میرے خون جگر کے قطروں کے لگائے پودے ہیں“ لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش بختی کے پردے میں کتنے دکھ، کتنے غم اور کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مانیں دیتا ہے خدا نے انھیں خاص بصیرت، خاص ذوق، خاص قسم کی ثقافتی سمجھ بوجھ عطا کر رکھی تھی۔ دنیاوی اعتبار سے وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن ”فوک وز ڈم“ کے بل بوتے پر بعض اوقات ایسی معرفت کی بات کہہ ڈالتیں کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ ایک مرتبہ

ڈھا کہ قیام کے دوران ایک پڑوسی سیکنڈ لیفٹیننٹ کی نو بیاہتا دلہن ملنے آئیں جو کمینرز ڈکالچ کی طالبہ اور لاہور کے کسی ”ہائی فائی“ گھرانے کی چشم و چراغ تھیں۔ پہلے بچے کی پیدائش سے انھیں یہ مسئلہ لاحق تھا کہ بچہ رات کو بستر پر پیشاب کر ڈالتا جس سے ان کے کپڑے بھی ”ان ہائی جینک“ ہو جاتے تھے۔

گفتگو کے دوران وہ تکرار سے اس پریشانی کا ذکر کرتی رہیں تو امی جی نے انھیں سمجھایا ”بیٹی جس ماں کے بستر پر بچہ پیشاب نہ کرے وہ عورت بدنصیب ہوتی ہے۔“ میرے پاس وہ کبھی کبھار اس پیشگی شرط کے ساتھ آتیں کہ رات ڈھلنے سے پہلے انھیں واپس اپنے پلنگ تک پہنچا دیا جائے گا۔ انھیں رات باہر بسر کرنا معیوب لگتا تھا۔ میرے ہاں وہ قیام کے دوران ایک مرتبہ طلحہ بابا کے سر پر کتے پالنے کا جنون سوار تھا۔ وہ ان دنوں لڑکپن کی سرحد پر بیٹھنا جو انی میں قدم رکھ رہا تھا، اعضا منہ زور ہو رہے تھے، آواز پھٹے ڈھول کے مانند بے سری ہو رہی تھی، بازو لٹکے جارہے تھے، ہاتھ اتنے بڑے، ٹانگیں یہاں سے وہاں تک، نشوونما اس قدر بے سنگم نہ توازن نہ ہم آہنگی۔

اس پرکتوں سے عشق کا بھوت نیا سوار ہوا تھا۔ باکس بیکل، گرے ہاؤنڈ، کولی، گریٹ دین، لبرمین غرض کسی بھی قسم کے پیدائی گرے کتے کی لگن میں وہ کوئی بھی دیوار پھلانگ سکتا تھا۔ سلیم بٹ جب اسے قازقستان کے حوالے سے بتاتے کہ وہاں کتے فروخت کرنے کے لیے باقاعدہ اتوار بازار لگتے ہیں اور جہاں گوریاں گود میں کتے لیے فروخت کے لیے آتی ہیں، تو حیرت اور تجسس سے اس کے دیدے جیسے پھٹ سے جاتے اور وہ چشم تصور میں جیسے اچھل کر کسی گوری کی گود میں جا بیٹھا ”کتا ایکسپرٹ“ بنا انھیں کتے کی عادتوں سے آگاہ کر رہا ہوتا کہ اگر اونچے سروں میں چلائے تو ڈر گیا ہے یا تکلیف میں ہے، دم جلدی جلدی افقی سمت میں لہرائے تو جان لیجیے کہ مسکرا رہا ہے اور دوستی کرنا چاہتا ہے۔ جب کتا خوفزدہ ہو، تو وہ کان لڑکا کر سر نیچے کرے، تو پتا چلتا ہے کہ شرمندہ ہے۔ آدھی رات کو منہ اٹھا کر دیر تک لمبی تان میں

بھوکنے والا کتا عموماً افسردہ اور بہت تنہا ہوتا ہے۔

امی اسے سمجھاتی رہیں کہ یوں پلے کے گلے میں رسی ڈال کر گھسیٹنے سے اسے تکلیف ہوتی ہے، لیکن دھن کا پکا طلحہ بھلا کہاں باز آنے والا تھا۔ اس کے حد سے بڑھے جنون کی تسکین کے لیے ایک سیاہ لمبے کانوں والے ڈوگی کا بندوبست کیا گیا جسے اس نے دودھ پلا اور رات بکھلا کر بد بھمی میں مبتلا کر ڈالا۔ ایلٹ نے کہا تھا ”جانور ایسے دوست ہوتے ہیں جو نہ سوالات کرتے ہیں نہ ہی نکتہ چینی۔“ وہ اسے اسکول میں بھی ہمراہ لے جانے پر بضد ہوتا جس سے اسے مشکل باز رکھا جاتا۔ ایک رات اس کے گلے میں رسی ڈال کر پھانک کے ساتھ باندھ کر سویا، لیکن صبح اس نے رسی تڑائی اور فرار ہو گیا۔

طلحہ بابا تو اس کے غم میں نڈھال ہو گئے اور پڑوسیوں کے گھروں اور محلے میں اس کے ممکنہ اغوا کاروں کا سراغ لگانے میں جت گئے جن کی رالیں اس نوخیز پر ممکنہ طور پر ٹپک سکتی تھیں۔ لیکن اس کا سراغ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اب طلحہ نے مایوس ہو کر امی جی کے دامن میں پناہ لی اور سسکیاں بھرتے ہوئے گلہ کیا کہ یوں بچھڑ جانا تھا تو پھر دوستی کا ڈھول ڈالا ہی کیوں تھا۔ امی جی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا ”بیٹا تمہارا ڈوگی شاید یہ جاننے اور تجربہ کرنے آیا تھا کہ اپنے پیاروں کے ہاتھ سے سنگلی گلے میں ڈالوا کر دل پر کیا بیت جاتی ہے۔“

کتا ایک سپرٹ کتے کی عادتوں سے واقف تھا، اس کے جذبات سے نہیں۔ ہم جس سے محبت کرتے ہیں اس کے گلے میں سنگلی ڈال کر زندگی بھر گھسیٹتے رہتے ہیں۔ حالانکہ جس کا جتنا پرانا ساتھ ہو، اتنا ہی اس کی بے وفائی کے لیے تیار بننا چاہیے۔ پرانی دوستی جب دشمنی میں بدلتی ہے، تو اس میں زہر زیادہ ہوتا ہے کہ تبدیلی کا نجات کا ضمیر ہے۔

اپنے بچوں کو انھوں نے جنم گھٹی بھی خوف کی دی، اور پہلا دودھ بھی ڈر کی ہکل تان کر پلایا، اس لیے ان کے بیٹے کسی ”پر قینچ“ کبوتر کی طرح زندگی بھی سہمے سہمے ڈر ڈر کر بسر کر

رہے ہیں۔ ان کے اندر کا برائل چوزہ ہر بجلی کے بلب کے پاس جا کر رک جاتا ہے۔ اس میں اسے عافیت کی گرمی اور ممتا نظر آتی ہے۔ ساری عمر وہ سو سے، اندیشے، انہونیوں اور بد گمانیوں کے الجھے ہوئے دھاگے سلجھاتی رہیں۔ وہ اللہ کے گھر کی فقیرنی تھیں جو اپنے بیٹوں کے لیے مانگ مانگ کر ڈگریاں، رزق، بھوکیں، صحتیں، ترقیاں لاتی رہیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں ان سے زیادہ اللہ ان پانچوں کا خیر خواہ ہو سکتا ہے۔

اپنے لیے تو ان کا زندگی سے کوئی مطالبہ ہی نہیں تھا کہ اپنی نظروں میں بکسار ہونے کو وہ سب سے بڑی سبکی سمجھتی تھیں۔ لیکن ان کی مردہ خواہشوں سے بیٹوں کے لیے انگنت خواہشوں کا ”جاگ“ لگ گیا تھا۔ وہ دم بدم کبھی بالکونی پر، کبھی گول سیرھی پر تو کبھی گیٹ پر کھڑی خیر مانگتی تھیں، ہر لمحہ خوف زدہ رہتیں ”نروس ڈائریا“ کا شکار تھیں۔ جب یہ دونوں صورتیں نہ ہوں، تو تب باورچی خانے میں اپنے پانچ بیٹوں کے لیے کھانے پکاتیں تھیں۔ ماں کے ارد گرد پرورش کا بکھیرا نہ ہو، تو وہ بن پانی کے جھاڑ کی طرح پہلے کمالاتی پھر زرد ہو کر جان چھوڑ دیتی ہے۔

مجھ کو تھکنے نہیں دیتا ہے ضرورت کا پہاڑ میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے

امی جی کی ملائت کے دوران گھر کے صحن میں لگے پھلوں کے وہ درخت جو عمر طبعی پوری کرنے کے باعث فرزند شجر پیدا کرنے سے معذور ہو چکے تھے، کاٹ دیے گئے۔ یہ تو طے شدہ معاملہ ہے کہ اشجار پھلوں کو جب وہ پک جاتے ہیں، تو چھوڑ دیتے ہیں لیکن کیا کبھی مالک، مٹی اور ماں بھی بانجھ ہو سکتے ہیں؟ درخت چاہے کتنا ہی اونچا کیوں نہ چلا جائے، اس کی جڑیں زمین کو ہمیشہ ہوس سے کریدتی رہتی ہیں۔ للی اب سہا سہا رہتا ہے۔ امی جی کی بیساکھی چھوٹی تو اسے لامحالہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ جب ماں کی قربت کا گرم کسبل جسم سے اترتا ہے، تو ہر ٹھہرتے آدمی کو خود ہی جاگرز پہن کر جاگنگ کر کے اپنے وجود

مزاحیہ غزل

”تسکینِ دل کا ہم نے یہ سامان بنا لیا“

جتنا ادھار جس سے ملا، لے کے کھا لیا

شاہ پڑا تھا راہ میں، ہم نے اٹھا لیا
افسوس اس میں نکلے فقط پان چھالیا

سگرٹ تو ہم بھی مفت کی پیتے ہیں اس طرح
ٹوٹا کسی نے پھینکا، لپک کر اٹھا لیا

میکے گئی ہوئی ہیں وہ، اب ہم نے دسویں دن
روٹی ٹنگوٹی، باؤلا سالن بنا لیا

اُتو کو بھی اندھیرے میں آتا نہیں نظر
کپڑے سیاہ جب بھی پہنتا ہے کالا

دھمکا کے اس نے مانگا موبائل تو ہم نے بھی
اس کو پرانا دے کے نئے کو بچا لیا

جرم ڈبل سواری میں عاصی دھرے گئے
”یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا“

مرزا عاصی اختر، کراچی

ہے۔ اپنی کیورس نے کہا تھا ”میں موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ
جب ہم ہوتے ہیں، تو موت نہیں ہوتی اور جب موت ہوتی
ہے، تو ہم نہیں ہوتے۔“

میرے اضطراب کو جیسے جواب مل گیا۔ میں نے مسکرا
کر دل ہی دل میں آرزو کا ایک چھوٹا سا چراغ روشن کیا
اور لحد کی جانب دیکھا، تا حدنگاہ چراغ ہی چراغ، تا حد
خیال روشنی ہی روشنی!

مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے
زیر زمیں بھی روشنی ہوا

کی حرارت کو برقرار رکھنے کا فن آجاتا ہے۔ غم بھی اس کی
خود ساختہ قرعہ انبیک سے نکلتے ہیں اور آنسو بھی اسے اپنے گیلے
رومال میں جذب کرنا ہوتا ہے۔

امی جی سر آہ بھر کر حسرت سے کہا کرتی تھیں ”لٹی ٹھیک ہو
جائے گا، لیکن میری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد۔“ جس طرح
لاٹری کا ٹکٹ لے کر یقین تو کسی کو نہیں ہوتا لیکن گمان رہتا ہے کہ
شاید میرا نمبر ہی نکل آئے۔ امی جی کے گزر جانے کے بعد پانچ
دن تک میں انیکسی میں اس موہوم امید کے ساتھ موجود رہا کہ
شاید کسی صبح کوئی دھیرے سے دروازے کی جھری سے جھانکے
اور کپکپاتے ہاتھوں سے دودھ کا لبریز گلاس اور تازہ اخبارات کا
بندل میز پر لا کر رکھے۔ کوئی دنگ کاتے قدموں سے میرے لیے
شلوار میں ازار بند ڈال کر غسل خانے میں لٹکا جائے، کوئی رات
دیر گئے گھر آنے پر جھڑکے اور پھر اگلے ہی لمحے مسالے میں سے
لاٹی گنی کلیجی کھانے کے لیے لجا جت بھرا اصرار کرے، کوئی
جھولیاں پھیلا کر بلا وجہ دعائیں دے، لیکن ایسا کوئی چمکا نہیں
ہوا۔ پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ امی جی زندگی کے جھمیلے میں
کہیں کھو گئی ہیں۔ شاپنگ تو رہی نہیں رسید ہاتھ میں رکھنے کا کیا
فائدہ۔ واقعی ماں کے بغیر گھر قبرستان معلوم ہوتا ہے۔

اضطراب بڑھا، تو میں گھر سے چند قدم کے فاصلے پر واقع
ان کی لحد پر چلا آیا۔ زندگی اور شاک موت میں بھی تو فاصلہ چند
قدم کا ہی ہوتا ہے ایک خواہشوں کا مسکن دوسری مسرتوں کا
مدفن۔ لحد سے آواز آئی ”بیٹا میرا مشن پورا ہو گیا۔ زندگی ایک
موج دریا ہے۔ اٹھنے کے بعد اگر وہ ساحل سے نہ ٹکرائے تو بھنور
کی آنکھ اور مرنے والی کی آنکھیں اس کے ماتم میں روتی رہتیں
ہیں۔ موت انسان کی محسن ہے یہ نہ آتی، تو اس زندگی کو کتنی
پائیداری ہوتی جس میں حزن و ملال کے سوا کچھ نہیں۔ فنا کے بقا
کی آرزو محض خیالی ہے۔“ واقعی بڑے لوگ کوئی حشرات الارض
تھوڑی ہوتے ہیں جو بلا مقصد زمین سے جمتے رہیں۔ ان کا
جہاں میں قیام اور کوچ چند اصولوں و ضابطوں کا پابند ہوا کرتا

تجربات زندگی

قسمت

جسے دنیا کا شاطر ترین چورا چکا بھی نہیں چُرا سکتا

سراج دین

محلے دار سلیم مغل ایک معروف کمپنی کے مالک ہیں۔ یہ کمپنی آرائش و زیبائش کی مختلف اشیا تیار کرتی ہے جن میں کریکیم، ہیئر آئل اور ہیئر ٹانک وغیرہ شامل ہیں۔ کمپنی دعویٰ کرتی ہے کہ اس کی مصنوعات کے ذریعے مردوں کو گنجلے پن سے نجات ملتی، خواتین کی زلفیں دراز ہوتیں اور بال گرنا بند ہو جاتے ہیں۔ میں نے ان کی کمپنی کا ہیئر آئل استعمال کیا، تو رتی بھر فائدہ نہ ہوا بلکہ سر کے زید بال گر گئے اور رقم الگ برباد ہوئی۔ ایک

دن سر راہ سلیم صاحب سے ملاقات ہو گئی، تو میں نے شکایت کی کہ آپ کا تیل استعمال کیا تھا، مجھے بالکل فائدہ نہیں ہوا۔

وہ مسکرا کر کہنے لگے
”لیکن مجھے تو ہو رہا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی راہ ہو لیے اور میں وہیں کھڑا ان کے لفظوں پر غور کرنے لگا۔ جملہ سمجھ آتے ہی میں بھی کھلکھلا کر ہنس دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ کاروباری معاملات میں انسان کی قسمت کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ بعض لوگ سونے میں ہاتھ ڈالیں تو وہ

مٹی ہو جاتا ہے۔ کچھ مٹی میں ہاتھ ڈالتے ہیں، وہ سونا بن جاتی ہے۔ شہرہ آفاق کتاب دبستان غالب کے مصنف غریب رحمت، ناصر الدین ناصر راقم کے سگے ماموں تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ جو قسمت کے دھنی ہوں، ان کی معمولی شے بھی ہاتھوں ہاتھ بکتی ہے جیسے کولا مشروبات والوں کا پانی دن رات بکتا ہے اور کئی ایسے بھی ہیں جو قیمتی جڑی بوٹیاں مثلاً زعفران اور ستوری تک ڈال کر اپنی مصنوعہ تیار کرتے ہیں، لیکن انھیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ یہ قدرت کے عجیب معاملات ہیں جو انسانی عقل سے ماورا ہیں۔

☆☆

آخر کار شاہد کو اس معروف بازار میں ایک مہربان دکاندار کے توسط سے بمشکل ریڑھی کھڑی کرنے کی جگہ مل گئی۔ اس کی فرنی اتنی خوش ذائقہ اور خوشبودار تھی کہ دکانداروں اور راہ گروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دیکھ خالی ہو گئی



چاولوں کا آنا لیا اور اللہ کا نام لے کر دیگ چولھے پر چڑھا دی۔

☆☆

آج اس کے کاروبار کا پہلا دن تھا اور خالی دیگ دیکھ کر وہ پھولے نہیں سارہا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ایک دکاندار نے اسے ماہانہ دس ہزار روپے کے عوض اپنا تھڑا استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ شاہد نے بخوشی یہ پیشکش قبول کی اور ایک کے بجائے دو دیگیں پکا کر لانے لگا۔ شروع شروع میں صدیق بھی اپنے یار کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ چند ہی ہفتوں بعد اللہ تعالیٰ نے اس کا بازو تھام لیا اور پورے علاقے میں اس کی فرنی کی دھوم مچ گئی۔

ایک دن راقم نے بھی بمشکل اپنی باری آنے پر فرنی کھائی تو انگلیاں چاٹتا رہ گیا۔ واقعی اس کے ہاتھ میں جادوئی ذائقہ تھا تبھی دیکھتے ہی دیکھتے دونوں دیگیں خالی ہو جاتیں۔ دور دراز علاقوں سے لوگ کھانے کے بعد میٹھا پکھنے کی غرض سے شاہد کی فرنی منگوانے لگے۔ پھر میرا اس بازار جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ وقت گزرتے پتا ہی نہ چلا اور دو سال بیت گئے۔

آج پھر وہاں سے گزر ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک معروف پلازے سے ملحق تین مرلے کی چار منزلہ دکان شاہد کی ملکیت ہے۔ بالائی دو منزلیں اس نے پاس کے دکانداروں کو گودام کی صورت کرائے پر دے رکھی تھیں جن کا معقول کرایہ آتا۔ چار ملازم ہاتھ بٹانے کے لیے اس کے سامنے فرنی کھانے اور لے جانے والوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ دکان کے سامنے شاہد کی چمکتی دمکتی سیاہ کار کھڑی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ اب شادی بیاہ کی تقریبات میں امرا شاہد سے فرنی بنواتے ہیں اور وہ منہ مانگے دام وصول کرتا ہے۔ گھر میں فرنی پکھنے کے دوران اٹھنے والی خوشبو محلے داروں کی اشتہا بڑھا دیتی اور وہ بھی اس نعمت سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنی جیب بلیک کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

قسمت کا چکر ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک روز شاہد کی دکان

جس نے بھی کھائی وہ اٹے قدموں دوبارہ لینے ضرور آیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں شاہد کے حالات بدل گئے۔ وہ خود کو فرش سے عرش پر محسوس کرنے لگا اور کچھ عرصے میں معقول رقم کا مالک بن گیا۔ اسے تو اپنی قسمت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

چند ماہ قبل تک وہ بارہا اپنی قسمت آزما چکا تھا مگر ہر بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود سالہا سال بیکار رہا کیونکہ ملازمت کے حصول میں تگ و دو سفر یا معقول رقم ضروری تھی۔ پھر مختلف ہنر سیکھے جو ادھورے چھوڑنے پڑے کیونکہ گھر کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ دو وقت کی روٹی بمشکل نصیب ہوتی۔ کئی چھوٹے موٹے کاروبار شروع کیے۔ مثلاً پلاسٹک کے برتنوں کی ریڑھی لگائی اور کبھی پھلوں سے ریڑھی سجائی سبزی بیچی اور آلو چھوٹے بھی لگائے مگر لکشمی کی دیوی روٹھی ہی رہی۔

☆☆

صدیق اس کے بچپن کا دوست تھا۔ وہ گاہے گاہے اس کے کام آتا رہتا۔ شاہد نے جب بھی اس سے ادھار رقم مانگی صدیق نے بھی انکار نہیں کیا۔ یوں شاہد دس ہزار روپے کا مقروض ہو چکا تھا۔ لیکن آفرین ہے صدیق پر کہ اس نے کبھی اپنے یار سے رقم کا تقاضا نہیں کیا۔ پھر ایک دن صدیق ہی کے مشورے پر اس نے کھانے پینے کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس نے پہلے خوب سوچ بچار کی پھر چھوٹے پیمانے پر میٹھا پکوان بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ حلوہ کھیر فرنی یا زردہ۔ وہ ان میں سے کوئی شے تیار کر کے قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا مگر کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ صدیق نے مشورہ دیا کہ ان کھانوں کے پرچیوں پر نام لکھو اور دو رکعت صلاۃ حاجت پڑھ کر ایک پرچی اٹھا لو جس پکوان کا نام نکلے وہی پکانا شروع کر دو اللہ بڑا مہربان ہے۔

پرچی اٹھائی تو قرعہ فرنی کا نکلا۔ چاولوں کا آنا چینی اور دودھ..... فرنی بنانے کے لیے یہ تین اہم اشیاء تھیں۔ شاہد نے محلے ہی کے گوالے سے خالص دودھ پرچون والے سے چینی اور

حدیث مبارک

آپ ﷺ کے گھر والوں نے جو کی روٹی سے بھی دودن متواتر پیٹ نہیں بھرا یہاں تک کہ حضور دنیا سے اٹھا لیے گئے۔ (بخاری و مسلم)

فرنی کا نسخہ بتانے کو کہا، مگر وہ ابھی تک اپنی بات پراڑا ہوا تھا۔ انکار سننے کی دیر تھی کہ چودھری کے اشارے پر مشنڈوں نے اس کی ٹھکائی شروع کر دی۔ انھوں نے بچارے کو خوب مارا۔ جب وہ تشدد کی تاب نہ لاسکا تو کہنے لگا ”اچھا میں آپ کو فرنی کا نسخہ بتا دیتا ہوں۔“

چودھری کے اشارے پر مشنڈوں نے ہاتھ روک لیا اور قسمت کا مارا شاہد نسخہ بتانے لگا کہ اس میں چار چیزیں پڑتی ہیں: چاول، چینی، دودھ اور چوتھی چیز میں آپ کو نہیں دے سکتا۔ یہ سننے کی دیر تھی کہ دوبارہ اس کی ٹھکائی شروع ہو گئی۔ تب ناچار اس نے چودھری کے سامنے ہاتھ جوڑے اور غنڈوں کو تشدد کرنے سے روکا۔ پھر کہنے لگا کہ چوتھی چیز میری ”قسمت“ ہے۔ یہ میں آپ کو کیسے دے سکتا ہوں؟

یہ سننے ہی بدلیسی چودھری صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کچھ توقف کے بعد اس نے غنڈوں کو زد و کوب کرنے سے روک دیا۔ زمین پر لیٹے شاہد کو کندھوں سے پکڑا اٹھایا اور ساتھ والے صوفے پر عزت و احترام سے بٹھا اس سے معافی کا طلب گار ہوا۔ وہ بچارا حیران پریشان چودھری کی جانب دیکھنے لگا کہ یک دم اس کی کایا کیسے پلٹ گئی۔ شاہد خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی ”قسمت“ والی بات چودھری کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ حقیقت یہی ہے کہ دنیا میں آنے والا ہر انسان اپنی قسمت لے کر پیدا ہوتا ہے جسے شاطر سے شاطر چورا چکا بھی نہیں چھین سکتا۔

پر کچھ لوگ آئے جو شکل و صورت اور اپنی پوشاکوں سے امیر کبیر لگتے تھے۔ انھوں نے شاہد سے تخیلے میں بات چیت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مدعا یہ نکلا کہ وہ انگلینڈ میں کاروبار کرتے تھے۔ وہ شاہد کو منہ مانگی تنخواہ کے عوض اپنے ساتھ لندن لے جانا چاہتے تھے، مگر شاہد ان کی کسی پیش کش کو خاطر میں نہ لایا۔ خیر وہ اسے سوچ بچار کا وقت دے کر چلے گئے۔

ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ وہ دوبارہ آدھمکے۔ جب شاہد کو کسی طور آمادہ نہ پایا تو کہنے لگے کہ چلو ایسا کرو کہ ہمیں فرنی بنانے کا طریقہ اور اس میں جو اشیاء ڈالتے ہو وہ ہی بتا دو۔ ہم اس کے بھی تمہیں منہ مانگے دام دیں گے۔ شاہد نے سوچا یہ بات تو اپنے ہاتھ کاٹ کر دینے کے مترادف ہے، لہذا وہ کسی طور انھیں نسخہ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔

کچھ توقف کے بعد شاہد نے قدرے رعب دار آواز میں گرجتے ہوئے انھیں دکان سے نکل جانے کا کہا۔ وہ جاتے ہوئے شاہد کو کہہ گئے کہ لگتا ہے گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا۔ بچارے کو علم ہی نہیں تھا کہ بات نہایت سنگین صورت اختیار کر جائے گی۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک دن دکان سے فارغ ہو کر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگا۔ اچانک دو نقاب پوش مشنڈوں نے اسے آدبوچا اور بھرے بازار میں دھکیل کر کالی پراڈو میں ڈال اپنی راہ ہو لیے۔ انھوں نے ہاتھوں میں پستول پکڑ رکھے تھے اس لیے چاہنے کے باوجود شاہد چلا نہ سکا۔ وہ بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ بس یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور اسے کیوں اغوا کیا گیا؟ جلد ہی اسے ان سوالوں کا جواب مل گیا۔ ایک شاندار مگر سنسان بنگلے کے سامنے گاڑی رکی اور نقاب پوش اسے گھسیٹتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے۔ وہاں ایک عمر رسیدہ شخص قیمتی پوشاک پہنے کسی چودھری کے مانند صوفے پر براجمان اور اسی کا منتظر تھا۔

شاہد حیران رہ گیا جب اس نے بھی انگلینڈ جانے یا

بے چارا خاوند

بیویوں کے ہاتھوں تنگ انگریز خاوندوں نے
تحریک تحفظ حقوق مرداں چلانے کا اعلان کر دیا

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

اپنی فطرت میں صنف نازک کے بجائے
عورت "صنف ناچھک" ہے۔ وہ صرف ایک موقع پر
جھکتی ہے..... جب اسے نکاح کے رجسٹر پر
دستخط کرنے ہوں۔ پھر اسی لمحے وہ عہد کر لیتی ہے کہ بقیہ تمام
زندگی جھکنا نہیں، جھکانا ہے۔ اور ہوتا بھی یہی ہے کہ شوہر، بیوی
کے سامنے جھکتے جھکتے بالآخر "کبڑا عاشق" ہو جاتا ہے۔ اس کے
باوجود اقوام متحدہ سے لے کر مोजی گیٹ تک حقوق نسواں کی
بابا کارچی ہوئی ہے۔ کبھی کسی مرد کو بھی "تحفظ حقوق مرداں"
کا خیال نہیں آیا۔ مرد و عورتا قربانی کا بکرا ہے (اگرچہ بکرے کے
بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں)۔ چنانچہ وہ بے چارا
یہ سوچ کر صبر کر لیتا ہے۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناظر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی
تا ہم مغربی مردوں نے عورت کے مظالم
کے خلاف علم بغاوت بلند کر تالاب میں پہلا
پتھر پھینک دیا ہے۔ ان مظالم کے اعداد و شمار
مردانگی کے نام پر دھبا ہیں۔ یہ "لٹھ"
پر "نتھ" کی حکمرانی کی روح فرسا
داستان سناتے ہیں۔ لندن میں قائم

ایک فلاحی ادارے "Mankind Initiative" کے مطابق
اس ترقی یافتہ ملک کے پندرہ فی صد مردوں پر ان کی ہتھ پھٹ
اور منہ پھٹ بیویاں جسمانی تشدد کرتی ہیں جسے وہ غریب تحمل
سے برداشت کرتے ہیں۔ ان میں سے اکتیس فی صد کی عورتیں
تو اتنی مرکھنی ہیں کہ ان کے شوہر، ضرب شدید کا نشانہ بن کر
ہسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ مرد یہ سب کچھ کیوں سہہ رہے ہیں؟ اس
کی ایک وجہ تو وہی خوش فہمی ہے جس کا ذکر ناصر کاظمی کے مندرجہ
بالا شعر میں کیا گیا۔ دوسری یہ کہ وہ اپنی مردانگی کا بھانڈا نہیں
پھوڑنا چاہتے۔ یہ طعنہ نہیں سن سکتے "یار، کیسے مرد ہو عورت سے
مار کھا گئے؟ لو یہ اسکرٹ پہن لو اور ہماری برادری سے دفع ہو
جاؤ۔" چنانچہ کوئی کسی سے یوچھتا کہ کہنی کیسے ٹوٹ گئی؟ تو بتا
جواب آتا کہ فرش سے پھسل گیا تھا۔ پیشانی کیوں نیلی ہے؟ تو بتا
دیا کہ کرکٹ کی گیند لگ گئی تھی۔ گال کی سرخی کی وجہ "الرجی" بتائی
جاتی۔ یوں گھر کی بات گھر میں رکھ کر مرد، بیویوں کو اپنے



اعصاب و عضلات پر حاوی کرتے گئے۔ لیکن جیسا کہ حضرت داغ نے کہا تھا۔

بھلا ضبط کی بھی کوئی انتہا ہے کہاں تک طبیعت کو اپنی سنبھالیں

چنانچہ لندن کے مردوں نے متحد ہو کر فیصلہ کر لیا ”بس بھئی بس، زیادہ مار نہیں میم صاحب!“ انھوں نے پھر گھریلو تشدد فورم (Domestic Abuse Forum) کے نام سے ایک مزاحمتی تنظیم بنالی۔ تنظیم کو پولیس، مقامی کونسلوں کے نمائندوں، ڈاکٹروں، وکیلوں، اساتذہ غرض معاشرے کے ہر طبقے کے مردوں کی حمایت حاصل ہے کیونکہ سب ہی کے گھروں کو ان کی بیویوں نے ”گوانا نامو بے“ میں تبدیل کر رکھا ہے۔ خود تنظیم کے ارکان میں ہر مکتب فکر کی نمائندگی موجود ہے۔ یہ لوگ جب اپنا اجلاس کریں، تو آغاز میں ہر شخص مائیک پر آ کر اپنی روداد غم سناتا ہے۔ عموماً تقریر کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی ہوگی۔

مظلومیت کا پیکر ہے آپ کی دعا سے بندہ بھی ایک شوہر ہے آپ کی دعا سے

(محبوب رائی)

ماہرین ان مظلوموں کو نفسیات، ابلاغیات، خودداری اور خود آگہی جیسے موضوعات پر لیکچر دیتے اور عملی مشقیں کراتے ہیں۔ انھیں سمجھایا جاتا ہے کہ ظلم و زیادتی پر پردہ ڈالنا، ہر وقت اسے نظر انداز کرنا، جسم پر لگی ہوئی چوٹوں کے جھوٹے اور نت نئے جواز تراشنا، حد سے زیادہ صبر اور برداشت کا مظاہرہ کرنا، گربہ کشتن روزاول کی پالیسی پر عمل نہ کرنا اور زندگی گزارنا مردانیت کے جلوے کو نسوانیت کے تلوے میں رکھنے کے برابر ہے۔ گالیاں کھا کر بے مزہ نہ ہونا بزدلی ہے، تو عورت سے مار کھا کر مسکرانا خودکشی۔ پس، اپنی خودی کو اتنا بلند کرو کہ فریق ثانی خود تمہارے قدموں میں گر کر کہے ”بتائیری رضا کیا ہے؟“ ”مرد کو گھر میں سرتاج کی حیثیت حاصل ہے۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ

سرتاج کے بغیر رہے۔ الغرض انھیں پوری طرح باور کرایا جاتا۔ دنیا میں قتل اس سا منافق نہیں کوئی جو ظلم تو سہتا ہے، بغاوت نہیں کرتا

اے حسن اتفاق کہیے یا حالات کی ستم ظریفی کہ ”بیداری نسواں“ کی لہر مغرب سے اٹھی تھی، لیکن دامن کے تار اور گریباں کے تار میں کچھ فاصلہ نہ رہا، تو اب وہیں سے ”بیداری مرداں“ کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ مغربی عورت مرد کے بارے میں ”خیر سگالی“ کے کتنے جذبات رکھتی ہے، اس کا اندازہ ان چند اقوال دریں سے لگائیے۔

سابق برطانوی وزیراعظم اور خاتون آہن (Iron Lady) آنجنابی مارگریٹ تھیچر نے ایک بار یہ گورافشانی فرمائی ”سیاست میں آکر میں نے جو باتیں سیکھیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مرد کوئی معقول جنس نہیں۔“ ان کا بس چلتا اور ووٹ بینک کھونے کا ڈرنہ ہوتا، تو کہتیں کہ مرد کوئی باقاعدہ مخلوق ہی نہیں۔ یہ تو وہ کوزا ہے جسے ”ری سائیکل“ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اور نامور ”مدبرہ“ نے اپنی بھڑاس یوں نکالی ”مرد موٹر کار کے ہارن کی طرح ہے۔ دونوں اس انداز میں شور مچاتے ہیں جسے کوئی نہیں سنتا۔“ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ مردوں کو شور مچانے پر مجبور کون کرتا ہے؟ ایک شعلہ بیان مقررہ نے یہ میزائل دغا ”میں جتنا مردوں کے بارے میں سوچتی ہوں اتنی ہی کتوں سے میری محبت بڑھ جاتی ہے۔“

کتا بے شک مغربی معاشرے میں انتہائی معزز مقام رکھتا ہے جس کا اندازہ اس واقعے سے لگائیے۔ ایک عورت نے دیکھا کہ اس کی پڑوسن بیگم ٹیلر کا کتا سڑک پر ایک تیز رفتار ٹرک کے نیچے آکر ”اوپر“ چلا گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کتے کی مالکن کو اس کے بارے میں کس طرح آگاہ کرے۔ اس نے ایک دوسری پڑوسن سے مشورہ کیا۔ پڑوسن نے کہا ”واقعی بیگم ٹیلر کو اپنے کتے سے بہت لگاؤ تھا اور وہ دل کی مریضہ بھی ہے۔ اگر تم نے اسے ایک دم اس سانچے کے بارے میں بتایا، تو ممکن ہے وہ یہ صدمہ

فرمایا حضرت سلمان فارسیؓ نے

- ☆ بانٹنے سے خوشی اس طرح بڑھتی ہے جس طرح زمین میں بویا بیج فصل بنتا ہے۔
 - ☆ ہمیشہ سچ کہو اور امانت کو ادا کرو۔
 - ☆ ہر اچھا کام پہلے ناممکن ہوتا ہے۔
 - ☆ انسان کا سب سے بڑا دشمن گناہ ہے۔
- (اقوال زریں، انتخاب: سعدیہ اسلم، سنانواں)

کمپنی کو اظہار تشکر کا خط لکھا ”جناب عالی، دو ہفتے قبل تک بیماری نے مجھے اتنا نڈھال کر رکھا تھا کہ بڑی مشکل سے بستر چھوڑ پاتی۔ گھر کا کوئی کام کرنے کے قابل نہ تھی۔ آپ کی دوائے نہ صرف مجھے صحت بخشی بلکہ میری توانائی بھی بحال کر دی۔ اب میں تمام گھریلو کام کاج، بشمول شوہر کی پٹائی باسانی انجام دے رہی ہوں۔“

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل صاحب اس خط پر غور فرمائیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ”عورتوں کو با اختیار بنانا ہوگا۔“ حضور وہ اور کتنی با اختیار ہوں گی؟ مردوں کا بھر کس تو پہلے ہی نکال رہی ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ غربا و مساکین کا بھرتا بھی بنانے لگیں۔

چونکہ مغربی عورتیں مردوں کی مذمت کے ساتھ ساتھ ان کی مرمت بھی کرنے لگی ہیں، شاید اسی لیے وہاں کے مرد خالص دفاعی ضروریات کے تحت، اب مردوں سے شادیاں کر رہے ہیں۔ کئی ملکوں نے باقاعدہ قانون سازی کر کے ایسی شادیوں کو ”حقوق مردوں“ کا حصہ بنا دیا۔ شیکسپیر نے اپنے شہرہ آفاق ڈرامے ”انٹونی اور کلوپٹیرا“ میں یہ یادگار ڈائیلاگ لکھا تھا ”Frailty Thy Name is Woman“ (عورت، تیرا نام کمزوری ہے)۔ آج شیکسپیر صاحب زندہ ہوتے، تو اپنے اس الہ لوک ٹائپ نظریے سے توبہ کر کے نیا ڈائیلاگ یوں لکھتے ”Cruelty Thy Name is Woman“ (بے رحمی، تیرا نام عورت ہے)۔

برداشت نہ کر سکے۔ لہذا تم ایسا کرو کہ پہلے جھوٹ موٹ اسے شوہر کی موت کی خبر دو۔“

برطانوی رکن پارلیمنٹ لیڈی آسٹرنے، جن کی مرد دشمنی ضرب المثل تھی اور جن کی چرچل سے اکثر نوک جھونک رہتی تھی، ایک بار ایوان میں یہ زہرا گلا ”آدم کو جیسے ہی پہلا موقع ملا، سارا الزام عورت کے سر تھوپ دیا۔“ نرم سے نرم الفاظ میں لیڈی آسٹرن کا یہ موقف مرد کے خلاف کینہ پروری کا مظہر تھا۔ دراصل یہ خصوصی صلاحیت صرف عورتوں کو حاصل ہے کہ اپنی غلطی کبھی تسلیم نہیں کرتیں۔ اور غلطی کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے، اس کا ملہ مردوں پر ڈال کر اپنے ضمیر کو ہلکا کر لیتی ہیں۔ ایک صاحب نے گھر میں بیگم کے ساتھ کھانا شروع کیا۔ دو تین نوالوں کے بعد انھوں نے شکایت کی ”یہ آج تم نے کھانے کا کیا حشر کر دیا ہے، نہ گوشت گلا ہے نہ سبزی۔ مجھ سے تو یہ کھایا ہی نہیں جا رہا۔“ بیگم صاحبہ تنک کر بولیں ”غلطی اپنی اور غصہ مجھ پر اتار رہے ہو۔ کھانا تو میرے بھی حلق سے نہیں اتر رہا۔“

”میری غلطی؟“ شوہر کا پارہ اور چڑھ گیا ”کیا کھانا میں نے پکایا ہے؟“

”کھانا پکانے کی ترکیبوں والی کتاب کس نے مجھے لا کر دی تھی؟“ بیوی نے پلیٹ سے ہاتھ کھینچتے ہوئے جوابی وار کیا ”اسی میں سے ایک پکوان کی ترکیب پڑھ کر میں نے یہ کھانا تیار کیا۔ وہ ترکیب چار آدمیوں کے لیے تھی۔ ہم دو ہیں اس لیے میں نے ہر چیز آدھی کر دی۔ برا کیا؟ میں نے تو اتنی احتیاط برتی کہ پکنے کا وقت بھی آدھا رکھا۔ اب اگر گوشت اور سبزی نہیں گلی تو قصور میرا ہے یا تمہارا؟“

شوہر کی ٹھکانی اب مغربی عورت کے پسندیدہ مشاغل میں شامل ہو چکی۔ پہلے جو بیوی اپنے میاں کو دھمکی دیتی تھی ”اب تم میری زبان نہ کھلو“ اب وہ آنکھیں میٹکا کر آستینیں چڑھاتے ہوئے ڈانٹتی ہے۔ ”دیکھو میرا ہاتھ نہ کھلوانا۔“

نیویارک میں ایک بیمار عورت نے صحت یابی کے بعد دوا ساز

چمن میں کھلا نیارا پھول

نٹ کھٹ پوتی کی محبت سے سرشار ایک
دادا کے جذبات بھرے اوراقِ زیست

محمد اسلم لودھی

آج میرا وہی بیٹا جوانی کی منزلیں طے کرتا شادی شدہ
ہو چکا اور میرے گھر میں مثالی بہو کی حیثیت سے بیٹی، تحسین بانو
آچکی۔ بہو کی آمد پر جس قدر شادیانے بچے اور خوشیاں منائی
گئیں اس کا ذکر تو الفاظ میں ممکن نہیں، لیکن گھر کی عزت، شان
اور رونق بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس کا سب سے بہترین تحفہ ہم
سب کے لیے ایک نٹ کھٹ، ذہین، حاضر دماغ اور انتہائی
خوبصورت شکل و صورت کی حامل بچی شرمین فاطمہ لودھی کی
صورت سامنے آیا۔ شرمین فاطمہ اپنے والدین کی اولین اولاد اور
میری پوتی ہے۔

شیخ زید اسپتال کے گائنی وارڈ میں ۲۶ دسمبر ۲۰۱۰ء کی سہ پہر
جب شرمین کی ولادت ہوئی، تو شاہد نے مجھے ٹیلی فون پر یہ
خوشخبری سنائی: ”ابو آپ دادا بن گئے ہیں۔“ میرے بدن میں
خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دیر تک مجھے اس خوشگوار حیرت نے گھیرے
رکھا کہ کیا میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں کہ اب میرا شمار دادا کی حیثیت
ہونے لگا ہے جہاں پہلے میرے والدین فائز تھے۔

میں فوراً اسپتال پہنچا۔ چاندی سرخ و سفید رنگ بچی کو دیکھ
کر سر سے پاؤں تک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے پیار سے
بوسے لیتے ہوئے اس کے دو نام اپنی طرف سے
تجویز کیے۔ تحسین بانو کی چھوٹی بہن فرح
نے بھی ایک دو نام بتائے۔ لیکن

بزرگوں
کی زبانی سنا تھا کہ اصل سے سود پیارا! تب
ہمیں اس بات کی سمجھ نہیں تھی۔ شادی کے
بعد جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد کی نعمت

سے نوازا، تو اکثر میرا بیٹا شاہد اور بیٹی تسلیم
اپنے دادا، محمد لشاد خان لودھی کی
آغوش میں اکھیلیاں کرتے دکھائی
دیتے جو ریٹائر ہو کر گھر تک ہی
محدود ہو گئے تھے۔ تب میں اندازاً
نہیں کر پاتا کہ دادا کو اپنے پوتے سے
اتنا پیار کیوں ہوتا ہے کیونکہ شاہد مجھ سے
زیادہ اپنے دادا کے قریب تھا۔ بلکہ
اس کی پرورش کی مجھ سے زیادہ
ذمے داری دادا دادی نے
سنجھال رکھی تھی۔



تھمیں نے یہ کہتے ہوئے میرا بتایا ہوا نام ”شرمین فاطمہ“ نہ صرف پسند کیا بلکہ کہا کہ یہ انگل کی صوابدید ہے، جو چاہیں میری بیٹی کا نام رکھیں۔ چنانچہ متفقہ طور پر طے پایا کہ بیٹی کا نام ”شرمین فاطمہ لودھی“ رکھا جائے۔

پھر میں نے ہی اللہ تعالیٰ کی واحدیت اور عظمت کا پیغام بچی کے کانوں میں اذان کی صورت دیا۔ ایک کان میں اذان دی اور دوسرے میں تکبیر پڑھی۔ علما کے بقول اس عمل میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ جب انسان دنیا میں آئے، تو کان میں اذان دے اللہ کی وحدانیت کا اظہار کرتے ہوئے بچے کو بتایا جائے کہ تم مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہو۔ تم مسلمان ہو جس کے ایمان کی پہلی بنیاد خدائے ذوالجلال کی وحدانیت کا اقرار ہے۔ دوسرے کان میں تکبیر پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ اذان اور تکبیر ہو چکی، اب صرف باجماعت نماز ہونے والی ہے۔ اور یہ نماز اس وقت ہوتی ہے جب انسان موت کی صورت دنیا سے رخصت ہو جائے۔ گویا اذان اور نماز کی تکبیر بھی ہو چکی صرف جماعت کھڑی ہونے کا وقت ہی انسان کی زندگی قرار پاتا ہے۔

چند دنوں بعد شرمین اپنی والدہ کے ساتھ گھر منتقل ہو گئی۔ گھر میں اس کی آمد کے ساتھ ہی ہر جانب خوشیوں کے پھوارے پھوٹ پڑے۔ مینا شاید باپ بننے پر بہت خوش تھا۔ ماں کی حیثیت سے میری بہو کی خوشیاں اپنی جگہ عروج پر تھیں کیونکہ وہ ایک تخلیق کار کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ ماں بننے کے بعد عورت کی دعاؤں میں ولی کامل کا اثر شامل ہو جاتا ہے۔

اسی دوران اچانک ایک سانحے نے سب کو سوگوار کر دیا، وہ آنا فانا شرمین کے نانا (نثار احمد خاں) کی وفات تھی۔ وہ بھی شرمین سے اتنی محبت کرتے تھے کہ پیدائش کے لمحات سے لے کر ڈسچارج ہونے تک اسپتال کے باہر رات گئے تک موجود رہے اور ملاقات کے وقفے میں اپنی بیٹی کو دیکھنے وارڈ پہنچ جاتے۔ آخری بار جب میں بچی کو شرمین کا نام دے کر اور اس کے کانوں میں اللہ کی وحدانیت کی گواہی دے کر اسپتال سے گھر

واپس آ رہا تھا، تو شام کو سخت سردی کے عالم میں بھی نثار احمد سیمنٹ کے ٹھنڈے بچ پر بیٹھے اپنی بیٹی اور نواسی کی بلائیں لے رہے تھے۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ انھیں بخار نے آگھیرا اور وہی چار پانچ دنوں بعد ان کی موت کا سبب بن گیا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ وہ اپنی نواسی کو نہ جی بھر کے پیار کر سکے اور نہ ہی اس سے کھیلنے کی آرزو پوری ہو سکی۔ قدرت کا بلاوا آنے پر وہ چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ کے کاموں میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب شرمین نے ہوش سنبھالنا شروع کیا۔ وہ ابتدائی دنوں ہی سے ہر دلعزیز بن گئی۔ اس کا چہرہ ہر لمحے مسکراہٹ سے لبریز ہوتا۔ عام بچوں کی طرح وہ بات بات پر رونے دھونے والی نہیں تھی۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے ماں باپ کے ساتھ ساتھ میری توجہ بھی حاصل کر لی۔ جب بھی میں اسے پیار سے اٹھاتا، تو وہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے مجھ سے لپٹ جاتی۔ اس لمحے میرے لاشعور سے آواز اٹھتی کہ یہی وہ محبت ہے جو ہر دادا کو اپنے پوتے پوتیاں سے دور نہیں ہونے دیتی۔ جس کی موجودگی میں ہر انسان اپنے دکھ اور تکلیف بھول کر خوشی خوشی اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

دن ہفتوں اور مہینوں کی صورت میں گزرتے رہے۔ شرمین نے ریگنا شروع کر دیا۔ وہ ریگتے ریگتے قریب آ کر اپنی موجودگی کا نہ صرف احساس دلاتی بلکہ آغوش میں اٹھا کر مجھے پیار کرنے پر مجبور بھی کرتی۔ یہ عام بچوں کے برعکس بہت ذہین اور محبت کرنے والی تھی۔ وہ بہت جلد گھر کے لیے لازمی قرار پا گئی۔ جب وہ اپنی والدہ کے ہمراہ نانی کے گھر جاتی، تو ہمارا مکان ویرانے کی شکل اختیار کر لیتا۔ بطور خاص میں اس کی کمی شدت سے محسوس کرتا۔ میری آنکھوں میں ہر وقت اس کی تصویر قفس کرتی۔ بینک سے گھر پہنچتے ہی میں بلند آواز سے شرمین فاطمہ پکارتا۔ میری آواز سنتے ہی وہ دوڑی چلی آتی۔ چند لمحوں ہی میں میری تھکاوٹ اور پریشانیاں رفع

کرنے کا فن اسے آتا تھا۔

قدر و منزلت عقل و محنت سے نہیں ملتی

خلیفہ ہارون الرشید نے جب ملک مصر پر قبضہ کر لیا، تو اس نے کہا کہ یہاں پر فرعون بادشاہ نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ میں اپنے کم ترین درجے کے غلام کو یہ صوبہ عطا کر دوں گا۔ کیونکہ مجھے یہ سرزمین پسند نہیں ہے۔

اس کے دربار میں ایک کم درجہ حبشی غلام تھا جس کا نام خضیب تھا۔ اسے بلا کر یہ ملک عطا کر دیا۔ اس غلام کے دور حکومت میں ایک دفعہ دریائے نیل میں طغیانی کی وجہ سے تباہی ہو گئی۔ اب زمین داروں کی ایک جماعت اپنے نقصان کی تلافی کے لیے اس کے دربار میں درخواست لے کر گئی۔ اس نے جماعت سے کہا کہ تمہیں اون کاشت کرنی چاہیے تھی تاکہ تلف نہ ہوتی۔ یہ بات ایک بزرگ نے سنی، تو کہا کہ اگر روزی عقل کی وجہ سے بڑھتی، تو بے وقوف سے بڑھ کر کوئی تنگ حال نہ ہوتا، لیکن یہ نظام اللہ تعالیٰ کے اپنے اختیار میں ہے۔ وہ بے وقوف کو بھی اس طرح روزی عطا کر دیتا ہے کہ عقل مند اس کے انتظام پر حیران رہ جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ روزی اور نصیب ہنرمندی اور عقل پر منحصر نہیں ہے تو نظام الہی کے تابع ہے۔ ممکن ہے کیمیا گر اپنی محنت سوچ اور عقل کے باوجود بھوکا ہی مر جائے اور بے وقوف کو کسی دیرانے سے وافر رزق جاملے۔ دنیا میں یہ دیکھا گیا ہے کہ نالائق بلند مرتبے پر رہے اور عقل والے زوال میں گزر بسر کر کے دنیا سے چل بے ہیں۔ (شیخ سعدی شیرازی، انتخاب: اصدق امین، اسلام آباد)

گھر کی صفائی کرنے لگتی اور فرش پر ٹاکی پھیرتی اور کبھی بستر کی چادر کو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پکڑ کر ماں کی طرح اس طرح اچھالتی کہ سلوٹیں دور ہو جاتیں۔ گھر میں موجود کمپیوٹر پر جب میں کام کرنے لگتا، تو وہ نہ صرف کمپیوٹر کے کی بورڈ کو ہاتھوں سے دبائے اور ماؤس کو استعمال کرنے کا جنون کی حد تک شوق رکھتی بلکہ مانیٹر کی اسکرین پر لگی اپنی تصویر ہاتھ سے بوسہ لے کر ہونٹوں کو لگاتی۔ کبھی اپنا چہرہ اپنی ہی تصویر پر رکھ کر

میں سمجھتا ہوں کہ ہر بچے کی نشوونما میں ماں کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ بچی بھی تو ماں کے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ اس لیے شرمین کی بہت سی خوبیاں اور عاداتیں ماں سے ملتی جلتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بہو کی شکل میں، میں نے تحسین بانو کو ایک سلیقہ شعار ماں کے روپ میں بھی دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جتنی سمجھ، شعور اور عقل دی ہے، وہ اپنی ان خوبیوں کو شرمین میں منتقل کرنے کا مصمم ارادہ رکھتی ہے۔ اس عمل کا آغاز تو ہو چکا، لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ سیکھنے اور سکھانے کا یہ عمل زیادہ رفتار سے جاری رہ سکے گا۔

میرے نزدیک اگر کوئی بچہ دنیا میں نامور ہو، تو اس کا سب سے پہلا کریڈٹ ماں کو جاتا ہے جو اپنی تمام خوبیاں بچے میں ودیعت کرنے کا جذبہ رکھتی ہے۔ جبکہ زندگی کی شاہراہ پر کامیابی سے چلنے کا سلیقہ باپ سیکھاتا ہے۔ شرمین فاطمہ کی عمر جب ایک سال ہوئی، تو مجھ سمیت گھر کے تمام افراد کو وہ شرارتوں اور مسکراہٹوں سے اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگی۔ اس کی سب سے زیادہ توجہ اپنے والد پر مرکوز ہو گئی۔ اس وقت شرمین کی آنا جانیاں اور حرکتیں دیکھنے والی ہوتی ہیں جب باپ گھر کے دروازے پر موٹر سائیکل کا بارن بجاتا۔

پہلے وہ ڈرائنگ روم میں ایک طرف سے دوسری جانب بھاگتی پھر کھڑکی میں سے باپ کو دیکھنے کی کوشش کرتی۔ باپ کی شکل نظر آتے ہی بھاگ کر دروازے پر پہنچتی اور دیکھتے ہی ٹانگوں سے چمٹ جاتی۔ شاہد بھی باپ کی حیثیت سے شرمین کو جان سے زیادہ پیار کرتا۔ وہ اپنی تھکاوٹ بھول کر اسے موٹر سائیکل پر بٹھاسیر کروانے نکل جاتا۔ کچھ دیر بعد دونوں باپ بیٹی مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے گھر لوٹ آتے۔

شرمین فاطمہ لودھی جوں جوں بڑی ہوئی، اس کی شخصیت کے بے پناہ پہلو نمایاں ہونے لگے وہ اپنی ماں کو کام کرتا دیکھ کر وہی کام خود کرنے کی کوشش کرتی۔ کبھی ماں کی طرح جھاڑو پکڑ

چٹکلا

ایک شخص کی بیوی نے شوہر پر الزام لگایا کہ اس نے چوری چھپے دوسری شادی کر لی ہے۔ مقدمہ عدالت میں چلتا رہا۔ آخر جج نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا ”چونکہ تم پر دو شادیوں کا الزام ثابت نہیں ہو سکا، لہذا تم گھر جاسکتے ہو۔“ اس شخص نے بے اختیار سے پوچھا ”جناب! پہلی بیوی کے گھر جاؤں یا دوسری کے؟“ (حبیب احمد، کوہاٹ)

چومنا شروع کر دیتی۔ وہ یہ سب کچھ اس قدر پیار سے کرتی کہ اسے دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔

نماز پڑھنے کے لیے جب ہم تینوں باپ بیٹے کھڑے ہوتے، تو شرمین کا اصرار ہوتا کہ وہ بھی نماز پڑھے گی بلکہ سر پر موتیوں والا سیاہ دوپٹہ پہن مصلے پر ہم سے پہلے ہی سجدہ ریز ہو جاتی۔ کبھی وہ اپنے باپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر نقل اتارنے کی کوشش کرتی ہے تو کبھی مجھے دیکھ کر دعا مانگنے کے انداز میں بیٹھ جاتی، پھر ہاتھ میں تسبیح لے کر اللہ اللہ کرتی ہوئی پورے گھر میں گھومتی۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ پنسل اور ربڑ ہاتھ میں لیے چلی آرہی ہے جیسے کچھ لکھنے اور مٹانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جستجو اس بات کی شاہد ہے کہ اللہ نے اگر چاہا، تو شرمین تعلیمی میدان میں بھی اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے گی ان شاء اللہ۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان کے اپنے بچے شاید اتنی محبت نہیں لیتے جتنی توجہ اور پیار پوتے اور پوتیاں لے جاتے ہیں۔ درحقیقت جب اپنے بچے چھوٹے ہوں، تو انسان کو بے شمار معاشی ذمے داریاں گھیرے رکھتی ہیں۔ تعلیمی اخراجات اور ان کی دیگر ضروریات پورا کرنا ہی سب سے اہم فریضہ بن جاتا ہے۔ پھر وقت یوں پر لگا کر اڑتا ہے کہ اس وقت فراغت کے لمحات میسر آتے ہیں جب اپنے بچے جوان ہو جائیں۔ لیکن ڈھلتی عمر کے اس پہر جب اپنے بچوں کی اولاد ہو، تو وہ اپنی شرارتوں اور مسکراہٹوں سے تمام کمی پورا کرنے کی جستجو کرتی ہے۔ وہ تمام اصول و ضوابط جو انسان نے اپنی اولاد کی تربیت کے لیے وضع کر رکھے ہوتے ہیں، پوتے پوتیاں انھیں نہایت محبت سے کچھ اس طرح پامال کر دیتے ہیں کہ دادا کی حیثیت سے انسان سب کچھ دیکھنے کے باوجود کچھ نہیں کہہ سکتا بلکہ اس پر شفقت پدری غالب آ جاتی ہے۔

کتابیں پھاڑنا، تصویریں پنسل سے خراب کرنا، کپڑے مٹی سے آلودہ کرنا، گھر کی دیوار پر الٹی سیدھی تصویریں بنا کر مصورانہ خوبیوں کا اظہار کرنا سب بچوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔

اگر یہ سب کچھ نہ ہو، تو یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس گھر میں کوئی بچہ موجود نہیں۔ میری نظر میں وہ بچہ ہی نہیں جو شرارتیں نہ کرتا ہو۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان خود بھی اپنے بچپن کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ تب بچے اور بوڑھے میں کوئی خاص فرق نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ ننھے فرشتے ایک طرح سے دادا کے دوست اور ہم جولی قرار پا کر بڑھاپے کا سہارا بنتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہ شخص بہت خوش نصیب ہے جو بڑھاپے میں پوتے پوتیوں سے کھیلتا ہو ا موت کی دہلیز تک ہنستا کھیلتا جا پہنچے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جہاں انسان کو بیماریاں گھیر لیتی ہیں وہاں وہ خود کو گھر میں بیکار تصور کرنے لگتا ہے۔ لیکن ہر کمی ہنستے مسکراتے اور شرارتیں کرتے پوتے پوتیاں بہت کامیابی سے پوری کر دیتے ہیں۔

میری شرمین فاطمہ کو اللہ تعالیٰ نے ہر خوبی اور صلاحیت سے نوازا رکھا ہے۔ میں ہر نماز کے بعد بطور خاص اس کے لیے دعا کرتا ہوں کہ مالک دو جہان میری شرمین فاطمہ کو ارفع کریم جیسی ذہین اور باصلاحیت بنا اور اس کی ذہانت کے چرچے پوری دنیا میں ہوں۔ لیکن اس کو صحت اور درازی عمر بھی عطا فرمانا تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور مہارتوں کے جوہر دکھا اور کائنات میں خوبصورت اضافوں کا باعث بن سکے۔ مجھے یقین ہے، اللہ تعالیٰ میری دعا کو ضرور شرف قبولیت عطا فرمائے گا اور میری شرمین فاطمہ لودھی، ارفع کریم جیسی ذہین اور باصلاحیت ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ

ٹھیلے والا شہزادہ

جاہ و شہرت سے غربت تک کے کٹھن سفر کا عبرت نامہ

خواجہ حسن نظامی

میں دہلی کے دن پھرے اور نئے شہر کی تیاریاں
۱۹۱۱ء شروع ہوئیں۔ نقشے بنے۔ نامور انجینئروں کی
دماغ آرائیاں اپنے جوہر دکھانے لگیں۔ شاہان
اودھ کے مورث اعلیٰ، منصور علی خاں صفدر جنگ کے مقبرے
کے آس پاس اینٹ بنانے اور پکانے کے کارخانے جاری
ہوئے۔ ہزاروں غریبوں کا روزگار
چمکا۔ پکی ہوئی اینٹوں
کے انبار ریل گاڑی
اور ٹھیلوں پر لاد کر
اپریل سٹی (نئی
دہلی) کی تعمیرات
میں جانے لگے۔

۱۱ مئی ۱۹۱۷ء کا ذکر ہے۔ ٹھیک دوپہر کی دھوپ اور حواس
کھونے والی گرمی میں ایک بوڑھا ٹھیلے والا خان بہادر سیٹھ محمد
ہارون کے بھٹے سے اینٹیں لے کر نئی دہلی جا رہا تھا۔ سر پر سورج
کی تیز کرنیں، سفید ڈاڑھی اور مونچھوں پر راستے کا گرد و غبار،
پیشانی پر پسینے میں اینٹوں کی سرخی جمی ہوئی۔

پیچھے سے ایک موٹر غالباً قطب صاحب (مرزا مختیار کاکی)
سے آرہی تھی۔ ڈرائیور نے ہر چند بگل بجایا، مگر بوڑھے اور
بہرے ٹھیلے والے نے اس کی آواز نہ سنی اور ٹھیلے کو سڑک سے نہ
ہٹایا۔ موٹر قریب آئی اور ٹھیلے سے ٹکرائی۔ ڈرائیور ہوشیار تھا۔ فوراً
موٹر کو روک لیا۔ ٹھیلے کی ٹکر سے موٹر کو کچھ نقصان نہ پہنچا۔

اس موٹر میں ایک سوداگر جوانی اور شراب کے نشے میں
چور کسی بازاری عورت کو لیے بیٹھا تھا۔ ٹھیلے والے کو غریب،
بوڑھا اور کمزور دیکھ کر غصے سے بے تاب ہو گیا۔ ہاتھ میں بطور
فیشن کے ایک کوڑا تھا، اسی کو لیا۔ موٹر سے اترا اور بچارے ٹھیلے
والے کو مارنے لگا۔

ٹھیلے والا اکیلا تھا۔ ضعیف اور ناتواں تھا اور سب سے بڑھ
کر ایک مفلس اور نادار تھا۔ مگر خبر نہیں دل میں کیا ہمت اور جرأت
رکھتا تھا کہ دو چار کوڑے تو پہلے حملے میں اس
نے کھالیے، لیکن پھر بیل ہانکنے کا چابک



پاگل خانے بھیجنا چاہیے۔“

☆☆

سٹی مجسٹریٹ کے ہاں بوڑھا ٹھیلے والا پولیس کی حراست میں حاضر تھا اور دونوں مدعی بھی موجود تھے۔ کورٹ انسپکٹر نے واقعات پیش کیے، تو عدالت نے مدعا علیہ کا بیان لینا چاہا اور یہ معلوم کر کے کہ وہ بہرا ہے، چپراسی نے چیخ چیخ کر اس کا اظہار کیا۔ بوڑھے نے بیان کیا:

”میرا نام ظفر سلطان ہے۔ میں بہادر شاہ بادشاہ کے بھائی، مرزا بابر کا بیٹا ہوں۔ میرے دادا ہندوستان کے شہنشاہ معین الدین اکبر شاہ ثانی تھے۔ غدر کے بعد میں نے ہزاروں پریشانیاں اٹھائیں۔ ملکوں ملکوں پھرتا ہوا دہلی میں آ گیا اور ٹھیلہ چلانے کا کام کرنے لگا۔“

”۱۱ مئی ۱۹۱۷ء جو ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی طرح گرم اور سخت، اس واقعے کی تاریخ ہے۔ میں بہرا ہوں۔ میں نے موٹر کی آواز نہیں سنی۔ موٹر والوں نے میری عمر اور حالت پر رحم نہ کیا اور مجھے چار کوڑے مارے۔ میرے بدن میں جو خون ہے اس کو مار کھانے کی اور ظلم و جوت سہنے کی اب تو عادت ہو گئی ہے، مگر پہلے نہ تھی۔ جس جگہ عدالت کی کرسی ہے اسی مقام پر غدر سے پہلے میرے حکم سے بارہا بہت سے شریروں اور سرکشوں کو سزائیں دی گئی ہیں۔“

میرے دل و دماغ نے ماضی فراموش نہیں کیا۔ گو میری آنکھوں نے ان نظاروں کی یاد مدت سے ترک کر دی ہے۔ میں کیونکر چار کوڑوں کی مار برداشت کر سکتا تھا۔ میں نے بے شک بدلہ لیا اور ان دونوں جوانوں کے سر پھاڑ ڈالے۔ اگر آپ شریف لوگوں جیسا انصاف کرنا چاہتے ہیں، تو میں آپ کے فیصلے کے سامنے سر جھکانے کو تیار و آمادہ ہوں۔“

بوڑھے کی تقریر سن کر عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ مجسٹریٹ صاحب جو یورپی تھے، قلم منہ میں لے کر بوڑھے کو دیکھنے لگے

لے کر اس نے بھی اس مخمور نو جوان پر حملہ کیا اور چابک کے بانس کا ڈنڈا ایسا مارا کہ شرابی عیاش کا دماغ پھٹ گیا۔ موٹر ڈرائیور نے چاہا کہ وہ اس بوڑھے کو سزا دینے کو آگے بڑھے، مگر قدم بڑھانے سے پہلے ہی چابک کی لکڑی اس کے سر پر بھی پڑی جس نے اس کا چہرہ خون سے لال کر دیا۔ موٹر نشین طوائف نے گھبرا کر رونا شروع کیا اور بلبلاتا کر چیخی کہ خدا کے لیے موٹر میں آ جاؤ ورنہ یہ گنوار تم کو جان سے مار ڈالے گا۔

یہ سن کر جوان اور موٹر بان گاڑی میں بیٹھ گئے اور ٹھیلے والے کو گالیاں دینے لگے۔ بوڑھا خاموش کھڑا مسکراتا اور کہتا رہا ”بس ایک ہی وار میں بھاگ نکلے۔ تیموری طمانچہ کھانا آسان نہیں۔“

ٹھیلے والا اس قدر بہرہ تھا کہ موٹر والوں کی گالیاں نہ سنیں اور پھر ٹھیلے پر آن بیٹھا۔ موٹر بھی دہلی چلی گئی اور ٹھیلہ بھی رائے سینا کی طرف روانہ ہو گیا جہاں نئی دہلی تعمیر ہو رہی تھی۔ رائے سینا کے تھانے میں دوسرے دن دوزخی اور چند ٹھیلے والے جمع تھے۔ وہ بوڑھا ٹھیلے والا بھی کھڑا تھا۔ داروغہ پولیس نے پوچھا ”کیا تم نے ان کو زخمی کیا ہے؟“

دوسرے ٹھیلے والے بولے ”حضور یہ بہرا ہے۔“ تب ایک سپاہی نے بوڑھے کے پاس جا کر کان میں زوردار آواز سے یہی سوال کیا، تو بوڑھے نے جواب دیا ”ہاں میں نے مارا ہے۔ انھوں نے پہلے مجھ پر حملہ کیا۔ چار کوڑے مارے، تو میں نے بھی جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ یہ امیر لوگ غریبوں کو گھاس پھوس سمجھتے ہیں۔ آج سے ساٹھ برس پہلے ان زخمیوں کے ماں باپ میرے غلام تھے اور یہی نہیں سارا ہندوستان میرا محکوم تھا۔“

داروغہ پولیس ہنسا اور اس نے کہا ”شاید یہ پاگل ہو گیا ہے۔ بڑھاپے نے اس کی عقل کھودی۔ اچھا اس کو حوالات میں لے جاؤ۔ کل عدالت میں چالان جائے گا۔ ایسے دیوانے کو

اور ان کا مسلمان سرشتہ دار آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ دونوں مدعی بھی یہ بیان سن کر دم بخود رہ گئے۔

عدالت نے حکم دیا ”تم کو رہا کیا جاتا ہے اور مدعیوں پر دس دس روپے جرمانہ۔ کیونکہ خود ان کے بیان سے ظاہر ہے کہ انھوں نے نشے کی حالت میں پہلے مدعا علیہ پر حملہ کیا تھا۔“

اس کے بعد مجسٹریٹ نے چپراسی کے ذریعے بوڑھے شہزادے سے پوچھا، کیا تمھاری پنشن سرکار سے مقرر نہیں ہوئی؟ تم ٹھیلے کا معمولی کام کیوں کرتے ہو؟“

شہزادے نے جواب دیا ”مجھے معلوم ہے کہ انگریزی سرکار نے ہمارے خاندان والوں کی پانچ پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے۔ مگر میں اول تو برسوں دہلی سے غیر حاضر رہا۔ اس کے علاوہ جب تک میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں، کام کر کے محنت کی روزی کمانا فرض سمجھتا ہوں۔“

”جناب! مجھے ٹھیلے کے کام سے تین چار روپے روزانہ مل جاتے ہیں۔ دو روپے روز بیلوں وغیرہ کا خرچ ہے جس میں گھر کا کرایہ بھی شامل ہے اور روپے دو روپے مجھے بچ جاتے ہیں۔ میں پانچ روپے مہینہ لے کر کیا کرتا۔ آج کل میں بہت خوش ہوں اور مجھے ہر طرح کی آزادی اور بے فکری ہے۔ جو لوگ آپ کی کچہریوں میں نوکریاں تلاش کرتے پھرتے اور بی اے، ایم اے پاس ہونے میں عمریں برباد کرتے ہیں، ان سے مجھ ٹھیلے والے کی حالت لاکھ درجے بہتر ہے۔ ٹھیلہ چلانے میں کچھ ذلت نہیں کیونکہ میں بیلوں پر حکومت کرتا ہوں اور خود بیل بن کر محکوم نہیں بنتا۔“

☆☆

ٹھیلے والا شہزادہ پہاڑ گنج کی مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اسی کے قریب اس کا گھر تھا۔ جب وہ نماز پڑھ چکا، تو ایک شخص اس کے پاس گیا اور کہا، میں آج کچہری میں موجود تھا اور میں نے آپ کے بیان کا چرچا سنا۔ کیا آپ مجھے غدر

کے حالات سن سکتے ہیں کہ آپ تب کہاں کہاں رہے اور آپ پر کیا کیا مصیبت پڑی؟

ٹھیلے والے نے مسکرا کر کہا ”کیا آپ وہ حالات سن سکتے ہیں؟ اور کیا آپ کو ان باتوں پر یقین آ سکتا ہے؟ کیونکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ جو بات گزر جائے خواہ وہ خوشی کی ہو یا تکلیف کی، جھوٹی ہے۔ اس کا بیان کرنا جھوٹ بولنا ہے۔ آنے والا زمانہ وہم ہے۔ گزرنے والا وقت جھوٹا ہے اور صرف موجودہ گھڑی سچی ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ جو وقت سامنے ہے، اس پر یقین کروں اور نہ ہی خوشی اس کو گزار دوں۔ نہ گزرے وقت کی یاد دل میں آنے دوں۔ نہ آنے والے زمانے کی فکر ذہن میں لاؤں۔ بس جو کچھ سمجھوں، اسی وقت کو سمجھوں جو آنکھوں کو نظر آتا ہو اور جس میں موجودہ سانس کی آمد و رفت ہو۔“

سائل نے کہا ”یہ تو آپ کے ذاتی تجربے کی باتیں ہیں۔ آپ کے دل کو صدموں اور حادثوں نے دنیا سے اداں کر دیا ہے، مگر میں تو واقعات غدر کی یادداشت مرتب کرنے کو آپ سے حالات پوچھتا ہوں۔ میں نے اور بھی اسی طرح کے بہت سے واقعات جمع کیے ہیں اور آپ بیتی کی کیفیت شہزادوں سے پوچھ پوچھ کر لکھی ہے۔“

یہ سن کر شہزادے نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا ”شاید آپ اخبار والے ہیں؟ میں ان لوگوں سے سخت بیزار ہوں۔ یہ بہت ہی جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ اچھا آپ میرے گھر پر چلیے، میں مہمان کی دل شکنی نہیں کروں گا اور آپ جو پوچھیں گے، بتاؤں گا۔“

شہزادہ سائل کو لے کر اپنے گھر میں گیا۔ چھپر کا ایک مکان تھا۔ باہر صحن میں دو بیل اور ایک گائے بندھی تھی۔ اندر والاں میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ برابر ایک پلنگ تھا۔ دونوں پر سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں جن سے غریب مگر محنتی اور کماؤ شہزادے کی نفاست مزاجی ظاہر ہوتی تھی۔ شہزادے نے سائل کو

تخت پر بٹھایا اور خود باورچی خانے سے کھانا لایا اور کہا ”آؤ پہلے کھانا کھا لو پھر باتیں کریں گے۔“

کھانا اگرچہ ایک آدمی کا تھا مگر دو قسم کا سالن، دال چٹنی اور کچھ مٹھاس یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ شہزادہ اس حالت میں بھی مکلف زندگی بسر کرتا ہے۔ سائل نے ہر چند عذر کیا مگر شہزادہ نہ مانا اور دونوں نے کھانا کھایا اور پھر شہزادے نے خود حقہ بھر سائل کے آگے رکھا۔ اُس نے حقہ نہ پینے کا عذر کیا، تو شہزادے نے نال اپنے آگے رکھ یہ داستان کہنی شروع کی:

”میں میرزا بابر کا بیٹا ہوں۔ میرزا بابر بہادر شاہ کے بھائی تھے۔ غدر سے پہلے بہادر شاہ کی حکومت تو ہندوستان میں نہ تھی، مگر عزت بادشاہوں کی سی ہر صوبے، شہر اور آبادی میں ان کے نام کی تھی۔ دہلی میں تو ہر شخص بہادر شاہ اور ان کے خاندان کا وہی ادب و لحاظ کرتا تھا جو شاہ جہاں اور عالمگیر کے وقت میں ہوتا تھا۔ میں اپنے باپ کا بہت لاڈلا تھا۔ اگرچہ ان کے اولاد اور بھی تھی، مگر اپنی ماں کا میں اکلوتا تھا۔ میرے والد کا غدر سے پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ جب غدر پڑا اور باغیوں کی فوج دہلی میں گھسی، تو جیسی ستم کاریاں اس نے انگریزوں اور ان کی عورتوں اور بچوں پر کیں، ان کے کہنے سے کلیجا کا نپتا ہے۔ اس کے بعد جب انگریز پنجاب سے مدد لے کر دہلی آئے اور ان کو مغلوب کر لیا، تو بادشاہ سمیت سارا شہر بھاگ نکلا۔ میری والدہ نابینا تھیں اور آئے دن کی بیماریوں سے بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ رتھ میں سوار ہونا بھی ان کو دُور بھرتھا۔ مگر دو عورتوں کی مدد سے میں نے ان کو سوار کیا اور خود بھی اس میں سوار ہو کر دہلی سے نکلا۔ بادشاہ وغیرہ تو مقبرہ ہمایوں گئے تھے، مگر میں نے کرنال کا رخ کیا کیونکہ وہاں میرے ایک دوست رہتے تھے جن سے دہلی میں اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ کرنال کے علاقے میں صاحب حیثیت زمیندار تھے۔

ہمارا رتھ اجمیری دروازے سے باہر نکلا (راستہ تولابوری

دروازے سے تھا مگر ادھر انگریزی فوج کا ڈرتھا) تو دیکھا ہزاروں آدمی، عورتیں، بچے بوڑھے بچیاں سروں پر رکھے حیران پریشان چلے جا رہے تھے۔ رتھ والے نے کہا، گوڑگانوہ ہو کر کرنال چلنا چاہیے تاکہ فوج والوں کے ہاتھ سے امن رہے۔ گوڑگانوہ تک تو ہم امن سے چلے گئے۔ اگرچہ راستے میں گوجرہ وغیرہ ملے، مگر ہم حیلے کر کے ان کے ہاتھوں سے بچ گئے لیکن جب گوڑگانوہ سے کرنال کی طرف مڑے، تو دو کوس کے بعد ہی گوجروں کے ایک غول نے رتھ کو گھیر لیا اور لوٹنا چاہا۔

ابھی انھوں نے ہاتھ نہ ڈالا تھا کہ سامنے سے انگریزی فوج کا ایک دستہ آگیا۔ یہ سب گورے تھے۔ ان کو دیکھ کر گوجر تو بھاگ گئے۔ گورے گھوڑے دوڑا کر رتھ کے پاس پہنچے۔ انھوں نے مذاق کے انداز سے انگریزی زبان میں کچھ کہنا شروع کیا جس کو میں نہیں سمجھا۔ میں مشرقی رخ تھا۔ مغربی رخ سے ایک گورے نے رتھ کا پردہ اٹھا کر دیکھا۔ والدہ کو نابینا اور بڑھیا دیکھ کر قہقہہ لگایا اور اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا جسے سن کر وہ آگے بڑھ گئے اور ہمیں کچھ تکلیف نہ دی۔

جب وہ چلے گئے، تو ہم آگے بڑھے اور شام تک چلتے رہے۔ رات کو ایک گاؤں کے پاس قیام کیا۔ وہاں آدھی رات کو چور ہمارا بیل کھول کر لے گئے۔ گاڑی بان بھی کہیں غائب ہو گیا۔ صبح کو میں بہت فکر مند ہوا اور گاؤں سے جا کر کرائے کی گاڑی مانگی۔ یہ جاٹ تھے۔ ان کا چودھری میرے ساتھ آیا اور بولا ”گاڑی تو ہمارے گاؤں میں نہیں۔ تم اپنی ماں کو ہمارے گھر ٹھہرا دو۔ دوسرے گاؤں سے گاڑی منگوا دیں گے۔ میں نے اسی کو غنیمت سمجھا اور والدہ کو لے کر چودھری کے گھر چلا گیا۔ ہمارے پاس ایک پٹاری تھی اور ایک صندوقچہ اور ان دونوں میں اشرفیاں اور جڑاؤز یور تھا۔

چودھری نے گھر میں اتار سب سامان رکھ کر ایک آدمی کو دوسرے گاؤں سے گاڑی لانے بھیجا۔ تھوڑی دیر میں گاؤں

آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں؟ آپ کالا ہو جانے والا پروگرام نہیں، آپ ہمیں بھگانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ لاہور جا رہے ہیں، تو ہمارے ٹکٹ بھی خرید لیں۔“

میں نے کہا ”بہت اچھا!“ جب میں ان کے ٹکٹ خرید لایا تو کہنے لگے، واقعی آپ جا رہے ہیں، تو پھر ہم آپ کے ساتھ ہی لاہور چلتے ہیں۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ آپ جھوٹوں کو جھوٹوں کے گھر تک تو پہنچاتے تھے۔ ہمیں یہ نہیں پتا کہ آپ مہمانوں کو بھی گھر تک پہنچاتے ہیں۔“

اسی ضمن میں بن بلائے مہمان کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ ہم ایبٹ آباد ہی میں مقیم تھے۔ ایک روز رات کو عشا کے بعد کھانا کھا کر سونے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ کال بیل بجی۔ دروازہ کھولا تو دفتر کا چوکیدار کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ دو گاڑیاں تھیں جس میں خواتین اور بچے سوار تھے۔ چوکیدار نے کہا کہ یہ آپ کے مہمان ہیں۔ آپ کا پتا پوچھ رہے تھے، میں گھر لے آیا۔ گاڑی کے قریب گیا، تو دیکھا کہ ہمارے بہت دور کے عزیز جنھوں نے تین شادیاں کر رکھی تھیں۔ اب دو بیویوں اور بچوں کے ساتھ آئے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے، کہنے لگے، ہم کاغان جا رہے تھے۔ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی جواب ٹھیک ہو گئی۔ رات کو سفر کرنا خطرناک تھا۔ آپ کے دفتر کا بورڈ نظر آیا، تو ہمیں آپ یاد آ گئے۔ اب چوکیدار کی مدد سے آپ کے گھر تک پہنچ چکے۔ رات یہیں قیام کریں گے۔“

میں نے کہا ”خوش آمدید!“ ہم نے ان کی گاڑیاں اپنے پڑوس میں کھڑی کرائیں۔ پھر ان سے پوچھا ”آپ کھانا کھائیں گے؟“

کہنے لگے کہ ہم نے سوچا، ہوٹل سے کھانا کھا لیتے ہیں۔ لیکن تمام ہوٹل بند تھے۔ میں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں، ابھی کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ وہ تقریباً بارہ لوگ تھے۔ بیگم سے پوچھا کہ گھر میں کھانا وغیرہ ہے یا بازار سے لے آؤں؟ انھوں نے کہا کہ بازار سے کچھ لانا پڑے گا اور باقی

گھر میں انتظام ہو جائے گا۔ میں گھر سے برتن لے کر موٹر سائیکل پر بازار چلا گیا تاکہ کوئی سالن وغیرہ بنوا کر لاؤں۔ تقریباً سب ہوٹل بند ہو چکے تھے۔ لاری اڑا گیا، وہاں ایک ہوٹل کھلا تھا۔ اس کو میں نے بالٹی گوشت بنانے کا کہا۔ مالک ہوٹل بولا ”میں نے یہ دو کلو گوشت ابھی بنایا ہے۔ ایک گاہک کے کہنے پر، مگر وہ نہیں آیا، بالکل تازہ ہے۔ میں بالٹی گوشت لے کر آ گیا۔ گھر آ کر گرم کیا تو اس میں سے بدبو کے بھبکے آنے لگے۔ پتا چلا کہ باسی گوشت تھا۔ چناں چہ دوبارہ اسے برتن میں ڈالا اور واپس کرنے جانے لگا۔ ہمارے مہمان کہنے لگے کہ میں بھی ساتھ چلتا اور اس دکاندار کو اچھا سبق سکھاتا ہوں۔ چناں چہ وہ میرے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ گئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں برتن تھا۔ جب ہم آدھے راستے تک پہنچے تو موٹر سائیکل پٹنچر ہو گئی۔ اب آدھی رات کے وقت میں موٹر سائیکل گھسیٹتے ہوئے چل رہا تھا اور مہمان کے ہاتھ میں برتن تھا۔ جب میں موٹر سائیکل گھسیٹتا ہوا تھک جاتا تو وہ گھسیٹنے لگتے۔ تب برتن میں پکڑ لیتا۔ جب وہ تھک جاتے تو میں برتن پکڑ لیتا۔ جدوجہد اور پریشانی کے بعد ہوٹل پر پہنچے تو مالک اسے بند کر رہا تھا۔ ہم نے اسے جا کر سالن سنگھایا اور اسے بڑا برا بھلا کہا۔ اس سے بڑی مشکلوں سے رقم واپس کی۔ ایک دکان سے انڈے لیے پھر ایک سوزو کی کرائے پر لی۔ اس پر موٹر سائیکل کو چڑھایا اور بڑے کشت اٹھا کر گھر پہنچے۔ انڈوں کا آملیٹ بنوایا اور کچھ گھر میں سالن وغیرہ تھا۔ مہمانوں کو رات گئے کھانا کھلا کر فارغ ہوئے۔ صبح ناشتا وغیرہ کا انتظام کیا۔ پھر مہمانوں نے ایبٹ آباد کے تفریحی مقامات کی تفصیل پوچھی۔ جب بتائی تو کہنے لگے کہ اب ہم سب ان مقامات کی سیر کر کے کاغان ناران جائیں گے۔ چناں چہ وہ لوگ دو روز اور ٹھہرے اور مہمان داری کا حق ادا کرنے کے بعد آگے روانہ ہوئے۔ اس کو کہتے ہیں: ”مان نہ مان میں تیرا مہمان!“

انگریزنی جب ساس بنی

ایک پاکستانی بہو کا دلچسپ ماجرا، اس
نے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر
برطانیہ میں اپنی دھاک بٹھادی

نوید اسلام صدیقی



پاکستان سے اپنی بیگم رافعہ کو بھی بلا لیا۔
امریکا آئے ابھی دو تین ہفتے ہی ہوئے تھے کہ بیگم نے
اعلان کر دیا، میں یہاں نہیں رہ سکتی، مجھے پاکستان
بھجوادیں۔ پروفیسر فاروق نے ان سے پوچھا کہ تمہیں
یہاں کیا تکلیف ہے؟ رافعہ نے کہا ”اس فلیٹ میں قید رہ کر
میں زندگی نہیں گزار سکتی۔ تنہا رہتے رہتے میں پاگل ہو
جاؤں گی۔ آپ تو صبح سویرے پڑھانے چلے جاتے اور
مغرب کے بعد واپس آتے ہیں۔ میں اس اثنا میں کیا
کروں۔ کیا دیواروں سے ٹکریں ماروں؟“

فاروق صاحب مسکرائے اور کہا ”یہ کوئی مسئلہ نہیں، یہاں
بوڑھے مرد و خواتین جو اپنے گھروں میں تنہا رہ رہے ہوتے ہیں،
انہیں کمپنی دینے کے لیے کئی این جی اوز بنی ہوئی ہیں۔ میں آج
ہی معلومات لے کر آتا ہوں۔ اسی علاقے میں قریب ہی ایسی

اتوار چار پانچ احباب ہمارے گھر آکھٹے
گزر شیعہ ہو گئے۔ گپ شپ چل رہی تھی، باتوں باتوں
میں یہ موضوع چھڑ گیا کہ ہم لوگ مسلمانوں کی
بشری کمزوریوں پر تو نظر رکھتے ہیں، لیکن کبھی ان اسلامیوں کے
بارے میں نہیں سوچا جو اپنے قول و فعل سے اسلام کے متعلق
پھیلے شک و شبہات غیر مسلموں کے دل سے صاف کرتے
ہیں۔ اس موقع پر میرے دوست، راشد صاحب نے ایک سبق
آموز داستان سنائی جو انہی کی زبانی پیش خدمت ہے۔

☆☆

میرے واقف کار، پروفیسر فاروق احمد امریکا سے پی
ایچ ڈی کر کے آئے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ ایک امریکی
یونیورسٹی میں پڑھانے گئے۔ چند ماہ بعد انہوں نے
یونیورسٹی کے نزدیک ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا اور

کوئی خاتون ہوئی جو تنہا رہ رہی ہے، تو میں تمہیں اس کے گھر چھوڑ جایا کروں گا۔“ شام کو یونیورسٹی سے واپس آتے ہوئے تمہیں لے لوں گا۔“ رافعہ نے کہا، یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ آج ضرور اس سلسلے میں معلومات حاصل کر کے آئیں۔

شام کو فاروق یونیورسٹی سے واپس آئے، تو رافعہ بے قراری سے ان سے اس سلسلے میں کچھ سننا چاہتی تھی۔ فاروق صاحب نے کہا کہ لو، بھئی مبارک ہو، تمہارا کام ہو گیا اور بہت خوبصورت انداز میں ہوا ہے۔ میں نے آخر ایک محترمہ تمہارے لیے ڈھونڈ نکالی ہیں۔ میں ابھی ان سے مل کر آ رہا ہوں۔ ان کی رہائش یہاں سے بیس پچیس منٹ کی پیدل مسافت پر ہے۔ ان کا اپنا دو منزلہ عالیشان مکان ہے جس میں وہ تنہا رہتی ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، لیکن کوئی ان سے ملنے نہیں آتا۔ میں اتوار کے دن تمہیں ان کے گھر لے جاؤں گا۔ اگر تم کو پسند آگئیں تو ٹھیک ورنہ پھر کوئی اور محترمہ ڈھونڈیں گے۔

اتوار کو فاروق اور رافعہ مارگریٹ سے ملنے ان کے گھر پہنچ گئے۔ مارگریٹ نے اپنے بارے میں بتایا ”میں ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر ہوں۔ دنیا کی کسی چیز کی مجھے کمی نہیں، بس مسئلہ تنہائی کا ہے۔ تنہا رہنے سے ایک بوریت جنم لیتی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے مجھے کمپنی چاہیے۔ سرکاری افسر ہونے کی وجہ سے یا تو کسی میری طبیعت میں غصہ بہت زیادہ ہے، ذرا سی بات پر طیش آ جاتا ہے۔“

”دوسری بات یہ کہ مجھے کسی دوسرے کا کیا ہوا کام کبھی پسند نہیں آتا، میں اپنا ہر کام خود کرتی ہوں۔ اپنا کھانا خود پکاتی ہوں، آپ اپنا کھانا پکا سکتے ہو۔ میرا خیال ہے اس عمر میں انسان کچھ احمق بھی ہو جاتا ہے، میں بھی تھوڑی سی احمق ہی ہوں۔ گھر میں جو چیز جہاں پڑی ہے، وہاں سے ایک انچ آگے پیچھے کرنا میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اوپر کی منزل میرے مرحوم شوہر نے بڑے شوق سے بنوائی تھی۔ لیکن وہ جب مکمل ہوئی تو ان کو اگلے جہان سے بلاوا آ گیا۔ مجھ سے نچلا حصہ نہیں سنبھلتا، مزید کیسے سنبھالوں

اس لیے اسے تالا لگا دیا۔ کرائے دار میں نے کبھی رکھا نہیں، مفت کا سر درد، اور یہ بھی کہ مجھے مزید پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں حضرت عیسیٰ کو مانتی ہوں، لیکن میں سیکولر خاتون ہوں، کبھی گرجے نہیں گئی، آپ لوگ مسلمان ہیں۔ میرے سامنے مذہب کی بات نہیں ہونی چاہیے، کوئی مذہبی رسم (جیسے نماز یا قرآن پڑھنا) میری آنکھوں کے سامنے نہیں ہونی چاہیے، مذہبی بحث کسی قسم کی بھی ہو، میں پسند نہیں کرتی۔ بات اصول کی کر رہی ہوں کہ اگر اس گھر کی کوئی چیز بے پروائی سے ٹوٹی تو اسے ٹھیک کروا کر دینا یا اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ ہاں، میں اپنی ایک کمزوری کا ذکر بھی کر دوں۔ میں بولتی بہت زیادہ ہوں لیکن سنتی کسی کی نہیں۔ میرے ساتھ وہی چل سکتا ہے جو میری عادات کو برداشت کرے۔ اس کے علاوہ.....“

پروفیسر صاحب نے سوچا، یہاں سے چلا جائے کیونکہ اس پاگل عورت کے ساتھ میری بیوی کا گزارا مشکل ہے۔ انھوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ رافعہ بول پڑی: ”مجھے آپ کی یہ صاف گوئی اور اصول پسندی بہت پسند آتی ہے، میں ان شاء اللہ کل صبح آ جاؤں گی۔“

باہر نکلے، تو فاروق نے کہا کہ میں تم پر حیران ہوں، اس خبیث عورت کے ساتھ کیسے گزارا کرو گی؟ رافعہ ہنسی اور کہنے لگی ”یہ تو مجھے ایک روایتی پاکستانی ساس محسوس ہوئی۔ ماں ساس کی اٹھتے بیٹھتے جو تصویر کشی کیا کرتی تھی، یہ اس پر پوری اترتی ہے۔ دوسرے ایسی ساس کو رام کرنے کے کچھ طریقے بھی ماں نے بتائے تھے، وہ تجربات بھی اس عورت پر کیے جاسکتے ہیں۔ میری تو جب آپ سے شادی ہوئی، اس سے مل ہی اماں جی (پروفیسر صاحب کی والدہ) جو ایک فرشتہ سیرت خاتون تھیں، اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔ میں مارگریٹ کی باتیں سن رہی تھی تو یہی سوچتی رہی کہ یہ بیٹھے بٹھائے ساس مل رہی ہے۔ اب آپ دیکھتے جائیں میں کیا کرتی ہوں۔“

اگلے دن پروفیسر صاحب اور رافعہ صبح صبح مارگریٹ کے گھر

پہنچ گئے۔ مارگریٹ گھر سے ملحق باغیچے میں ورزش کر رہی تھی۔ اُس نے ان میاں بیوی کو آتے دیکھا تو آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا۔ پروفیسر صاحب نے کہا، مجھے اجازت دیں، میں نے یونیورسٹی میں کلاس لینے ہے، اب شام کو ملاقات ہوگی۔

پروفیسر کے جاتے ہی مارگریٹ رافعہ سے مخاطب ہوئی اور کہنے لگی: ”تم اندر ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھو، وہاں کسی چیز کو چھیڑنا نہیں، آرام سے ایک جگہ بیٹھی رہنا، میں پندرہ منٹ بعد تمہارے پاس آؤں گی۔ پھر مزید باقی ضروری ہدایات میں تمہارے گوش گزار کروں گی۔“ رافعہ نے کہا کہ آپ کا یہ باغیچہ دیکھ کر مجھے اپنا پاکستان وال مکان یاد آ گیا، سبزہ دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ والد محترم ہمیں روزانہ صبح باغیچے میں لے جاتے تھے وہ کہتے انسان اور پودے میں ایک بہت بڑی مشابہت ہے، ان سے جتنی محبت کرو، اتنی ہی یہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ پودے بچوں کی طرح معصوم اور بھولے بھالے ہوتے ہیں، انھیں جدھر موڑو مڑ جاتے ہیں۔ آپ ورزش کریں میں پودوں سے باتیں کرتی ہوں۔

مارگریٹ ورزش کرنے لگی اور رافعہ کیا ریوں میں پڑے گلے سڑے پتے جمع کر کے اپنے پاس موجود ایک تھیلے میں ڈال رہی تھی۔ رافعہ اس خیال میں مگن مر جھائے پتے جمع کر رہی تھی کہ مارگریٹ خود ہی اس کو آواز دے گی، لیکن نہ اس نے آواز دی اور نہ رافعہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس طرح تقریباً آدھا گھنٹا گزر گیا۔ رافعہ نے محسوس کیا کہ مارگریٹ اُس کے سر پر کھڑی ہے۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مارگریٹ کہنے لگی کہ میں خاصی دیر سے تمہیں دیکھ رہی ہوں کہ تم کتنی باریک بینی سے اس بورکام میں مصروف ہو۔

رافعہ نے کہا: ”آئی! آپ کے پاس آنے کا مقصد ہی بوریٹ سے نجات حاصل کرنا ہے، ہم پاکستانیوں کی گھروں اور اسکولوں میں یہی تربیت دی جاتی ہے کہ ہر وقت مصروف رہو، ورنہ بوریٹ کا بھوت تمہیں چمٹ جائے گا اور تمہارے اعصاب

شل کر دے گا۔ ہمارے ہاں تو ہر بچے کو ہوش سنبھالتے ہی سکھا دیا جاتا ہے:

بیکار مباح کچھ کیا کر
کچھ نہ ہو تو کپڑے پھاڑ کر سیا کر
رافعہ نے جب شعر کا ترجمہ انگریزی میں کر کے مارگریٹ کو بتایا تو ہنس کر اُس کے پیٹ میں ہل پڑ گئے۔ وہ بار بار کہتی کتنی زبردست قوم ہے۔ (marvelous, marvelous)
مارگریٹ نے پھر پوچھا کہ تم جس تھیلے میں سوکھے ہوئے پتے جمع کر رہی تھی، یہ تھیلا کیا سوچ کر گھر سے لائی؟ رافعہ نے بتایا، اس میں تو میرا یہ لٹچ تھا۔ مارگریٹ نے کہا، یہ تھیلا تو بلاوجہ تم نے گندا کیا۔ رافعہ نے کہا کہ آپ نے منع کر دیا تھا کہ اندر جا کر کوئی چیز چھیڑنی نہیں ہے۔ اس مسئلے کا آسان ترین حل مجھے یہی سمجھ آیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے ”سوچی پیاتے بننا گیا۔“ پھر اُس نے ترجمہ کر کے بتایا کہ اس کا مطلب ہے کہ ہر معاملے میں غیر ضروری سوچ بچار آدمی کو کسی کام کا نہیں چھوڑتی۔

مارگریٹ نے رافعہ کو کہا کہ آؤ اندر چلتے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں جا کر وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ مارگریٹ کہنے لگی کہ میں اب ایک گھنٹے کے لیے غسل خانے جا رہی ہوں۔ میں جسم کی مالش پھر غسل کروں گی۔ تم یہ وقت کیسے گزارو گی کہ تم بیکار بیٹھ نہیں سکتی۔ رافعہ نے جواباً کہا: جب آپ نے ایک گھنٹے کے لیے غسل خانے جانے کی بات کی، تو میرے ذہن میں فوری طور پر کئی کام آئے۔ مارگریٹ نے پوچھا: مثلاً؟ رافعہ نے کہا: اگرچہ آپ نے کل منع کیا تھا، لیکن یہ ایک بنیادی بات ہے۔ ہم لوگوں کی زندگی کا بنیادی اصول ہے، ہمیں پیدا ہوتے ہی یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ ’صفائی نصف ایمان ہے‘۔ مجھے اس گھر میں صفائی کا بہت سا کام نظر آ رہا ہے۔ مثلاً یہ کھڑکیوں کے شیشے صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ مارگریٹ نے کہا، ٹھیک ہے، تم اپنا شوق پورا کرنے کے لیے، یہ ہی صاف کرلو۔

گھنٹے بعد جب مارگریٹ غسل خانے سے باہر آئی تو حیران

والوں نے غل مچا دیا کہ انگریزی فوج آئی ہے۔ چودھری میرے پاس آیا اور کہا جاؤ تم گھر سے باہر جاؤ ورنہ ہم بھی تمہارے ساتھ مارے جائیں گے۔“

میں بہت گھبرایا اور چودھری سے کہنے لگا کہ اندھی ماں کو لے کر کہاں جاؤں؟ تم کو میرے حال پر ترس نہیں آتا۔ یہ سن کر اس جاٹ نے ایک مکہ مارا اور کہا، ہم تیرے لیے گردن کٹوا دیں؟ میں نے بھی اس کو تھپڑ رسید کیا۔ یہ دیکھتے ہی جاٹ جمع ہو گئے اور ان سب نے مل کر مجھے خوب مارا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش میں آیا، تو ایک جنگل میں پڑا تھا اور والدہ میرے سر ہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔

والدہ نے کہا ”وہ جاٹ تجھے ایک چار پائی پراٹھا کر یہاں ڈال گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے اسباب لوٹنے کا بہانہ کیا، فوج ووج کچھ نہ آئی تھی۔“

وہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ جنگل بیابان، دھوپ کی شدت، ایک میں، ایک میری ناتواں آنکھوں سے محتاج ماں، چاروں طرف سناٹا اور دشمنوں کا ڈر، راستے کی بے خبری اور زخموں کی تکلیف سونے پر سہاگا! والدہ نے کہا ”بیٹا ہمت کر کے آگے بڑھو۔ یہاں جنگل میں پڑے رہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ سر میں اور بازو پر زخم تھے۔ پیروں پر بھی چوٹ آئی تھی، مگر اندھی ماں کا ہاتھ پکڑ کے راستہ چلنا شروع کیا۔ کانٹے دار جھاڑیاں سارے میدان میں پھیلی ہوئی تھیں جنھوں نے بدن کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور پیروں کو لبو لبہان کر دیا۔ والدہ ٹھوکر کھا کر گر پڑیں اور میں انھیں سنبھالتا تھا، مگر کمزوری کے باعث مجھ میں بھی چلنے کی ہمت نہ تھی۔ دو وقت سے ہم نے کچھ بھی نہ کھایا تھا۔ غرض ایسا وقت تھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

جب دوپہر کا سورج سر پر آیا، تو میرے سر کے زخم میں ایسی تکلیف ہوئی کہ میں چکرا کر گر پڑا۔ ہوش تھا، مگر اٹھنے اور

چلنے کی طاقت نہ تھی۔ والدہ نے میرا سراپے زانوں پر رکھ لیا اور یہ دعا مانگنی شروع کی:

”اللہ مجھ پر رحم کر! میرے گناہ معاف کر دے اور میرے بچے کی جان بچالے۔ خدایا یہ اندھی شہزادی تیرے آگے ہاتھ پھیلاتی ہے، اس کو محروم نہ کر۔ ہمارا تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔ آسمان زمین ہمارے دشمن ہیں، تجھ بن کس سے کہوں۔ تو جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے۔ کل ہم ملکوں، ہاتھی گھوڑوں اور لونڈی غلاموں کے مالک تھے، آج کچھ بھی ہمارے پاس نہیں۔ کس برتے پر دنیا والے اس فانی جہان میں جینے کی آرزو کرتے ہیں؟ تو بہ ہے! گناہوں کی توبہ ہے۔ رحم! رحم! اے اللہ رحم!“

اماں دعا مانگ رہی تھیں کہ ایک گنوار ادھر آنکلا اور اس نے کہا ”بڑھیا تیرے پاس جو کچھ ہو ڈال دے۔“

والدہ بولیں ”بیٹا میرے پاس تو سوائے اس زخمی بیمار کے کچھ بھی نہیں۔“

یہ سن کر اس گنوار نے ایک لٹھ والدہ کے سر پر مارا۔ لٹھ پڑنے ہی والدہ کے منہ سے چیخ نکلی اور انھوں نے کہا ”ہائے ظالم میرے بچے کو نہ مار یو۔“ میں ہمت کر کے اٹھا، مگر پھر چکرا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ گنوار نے میرے اور والدہ کے کپڑے اتار لیے۔ مجھے ہوش آیا، تو گنوار جا چکا تھا اور ہم دونوں برہنہ پڑے تھے۔ والدہ دم توڑ رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا: ”اماں کیا حال ہے؟“

انھوں نے اکھڑی آواز میں کہا ”میاں مرتی ہوں۔ تم خدا کے سپرد۔ آہ کفن بھی میسر نہ آیا! ارے گور بھی نہ ملے گی۔ میں شہنشاہ ہند کی بھانجی ہوں۔“ انھوں نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا اور مر گئیں۔ میں نے ریت سمیٹی، اپنی بے کس ماں کی لاش کو اس میں چھپا دیا اور خود بمشکل گھسٹ گھسٹ کر ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔

نمکین غزل

روح اقبال سے معذرت کے ساتھ

ڈوبا ہے کہاں میرے مقدر کا ستارا
چینی کا بھی مارا ہوں میں آٹے کا بھی مارا
راش نہیں ملتا نہ ملے مفت کی کھاؤ
اپنا بھی کئی دن سے ”ہوا“ پر ہے گزارا
”غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں“
لیکن تگ و دو کو بھی تو کرنا ہے گوارا
بندوں کو پکڑوا کے لگیں ہاتھ جو ڈالر
”ہے ایسی تجارت میں مسلمان کا خسار“
”ڈالر“ پہ مچا شور تو بولے یہ مشرف
”آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدار“
”حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر“
ہو جائیں گے اطفال ترے گھر میں بھی بار
”دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش“
کیل نے جسے اور بھی گھر گھر ہے ابھارا
نزلے کی طرح جم کے جو بیٹھی ہے بُرائی
اے عاصی لیا جائے دعاؤں کا بھپارا
(مرزا عاصی اختر، میرپور خا)

سائل نے یہ ماجرائے عبرت سن کر کہا ”کیا میں

کتاب میں لکھ دوں؟“

شہزادے نے کہا، ضرور لکھ دو۔ مگر یہ بھی لکھ دینا

”ہر گزرنے والی بات، گزرنے والا وقت

والی راحت و تکلیف جھوٹی اور بے اصل ہے

عبرت ضرور ہے۔“

تھوڑی دیر میں ایک فوجی سوار کا وہاں سے گزرا۔ مجھے دیکھ
کر قریب آیا۔ میں نے سارا حال اس سے کہا۔ اس نے نہ کمر کا
رومال کھول کر مجھے دیا جس سے میں نے تہ بند باندھا۔ اس کے
بعد سوار نے مجھے اٹھا کر گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھالیا اور اپنی
چھاؤنی میں لے گیا۔ وہاں اس نے میرا علاج کرایا جس سے
میرے زخم اچھے ہو گئے۔ پھر میں اس کی خدمت کرنے لگا۔

یہ مسلمان سوار بہت نیک مزاج تھا۔ اس کا مکان
پٹیا لے میں تھا۔ اس کے ساتھ کچھ دن تو میں پٹیا لے میں رہا
اور پھر فقیر ہو کر شہر بہ شہر پھرنے لگا۔ جب بمبئی پہنچا، تو خیراتی
قافلے کے ساتھ مکہ معظمہ چلا گیا اور وہاں دس برس
گزارے۔ پھر مدینہ شریف حاضری دی اور وہاں بھی پانچ
برس بسر کیے۔ اس کے بعد شام اور بیت المقدس کی زیارتیں
کر کے حلب ہو کر بغداد شریف گیا۔ دو سال وہاں کاٹے۔
بغداد سے ایک میمن کے ہمراہ کراچی آیا اور وہاں سے دہلی آ
گیا کیونکہ اس شہر کی یاد مجھے ہر جگہ بے چین رکھتی تھی۔

یہاں ریل پر میں نے مزدوری کرنا شروع کی جس
سے مجھے کھانے پینے کے بعد کچھ بچت ہونے لگی۔ دو سال
میں میرے پاس تین سو روپے ہو گئے، تو میں نے ایک ٹھیلے
والے کی شرکت میں ٹھیلا بنایا۔ اس کی آمدنی سے آہستہ
آہستہ سا جھمی کا حصہ ادا کر کے اپنا مستقل ذاتی ٹھیلا بنالیا اور
اب اسی پر میری گزراوقات ہے۔

سائل نے کہا ”بہراپن کب ہوا اور اس سے تو آپ کو تنہائی
میں بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہوگی؟“

شہزادے نے ہنس کر جواب دیا۔ ”خدا کا شکر ہے کچھ
تکلیف نہیں ہوتی۔ سارے جہان کے عیب سننے سے کان بند
ہیں۔ گاؤں میں جب جاٹوں نے مارا تھا، اسی وقت دماغ پر ایسی
چوٹ آئی تھی جس سے کان کی قوت جاتی رہی۔ اب صرف
”کسم کسم“ سے کچھ سن سکتا ہوں۔ دایاں بالکل بے کار ہے۔“

آپ بیتی

مان نہ مان میں تیرا مہمان

بن بلائے مہمانوں کا شگفتہ تذکرہ

حبیب اشرف صبوحی

نام چودھری صاحب تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں یہاں بہت تھوڑے عرصہ رہا ہوں۔ اپنے بچوں کو بھی یہاں کی سیر نہیں کر اسکا۔ موقع ملا تو میں ان کو لے کر آؤں گا، یہ بڑی پُرفضا جگہ ہے۔ بڑی پرسکون اور قابل دید مناظر ہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ چودھری صاحب جب کبھی ٹیلی فون کرتے یا میں سرکاری طور پر لاہور جاتا، تو وہ اس بات کی یاد دہانی کراتے کہ میں اور میری بیگم ایک دوروز کے لیے آپ کے پاس آئیں گے۔ میں ان کو خوش آمدید کہتا۔ وقت گزرتا گیا۔

چند سال بعد چودھری صاحب کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ فلاں تاریخ کو اسلام آباد ایک شادی میں آرہے ہیں۔ ایک دوروز کے لیے ایبٹ آباد آنا چاہتے ہیں۔ اس روز سرکاری گاڑی اسلام آباد بھیج دیں، تو میں اور میری بیگم چلے آئیں گے۔ اسلام آباد پہنچ کر ان کا ایک روز بیچ فون آیا کہ میں آگیا ہوں۔ آپ ۱۲ بجے تک گاڑی مقررہ جگہ بھیج دیں۔ دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ آپ کے گھر پر کھاؤں گا۔ میں نے ان سے اسلام آباد کا مکمل پتہ لے لیا تاکہ ڈرائیور اور گاڑی بھیج دوں۔ ہمارے دفتر کے مینیجر نے یہ نوٹیفکیشن جاری کیا تھا کہ ایبٹ آباد سے باہر اگر کوئی گاڑی گئی، تو وہ میری اجازت سے

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، اردو ڈائجسٹ کو اپنے گھر آتے دیکھا۔ اس کے مضامین خاص طور پر لوگوں کی آب بیتیاں اور جگ بیتیاں عوام میں بہت مقبول ہوتی تھیں۔ بعض واقعات اتنے دلچسپ اور دل پذیر ہوتے کہ مدتوں بعد نہیں بھولتے تھے اور ان واقعات کو ریفرنس کے طور پر پیش کیا جاسکتا تھا۔ اب بھی اس کا معیار اسی طرح قائم ہے۔ انہی واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک آپ بیتی رقم کر رہا ہوں۔ امید ہے قارئین پسند فرمائیں گے۔

۱۹۹۰ء میں دوران ملازمت میرا تبادلہ ایبٹ آباد ہو گیا۔ جہاں میں چھ سال مقیم رہا۔ جن صاحب سے چارج لیا ان کا



جائے گی ورنہ نہیں۔ اتفاق سے ایک روز قبل میں نے ریجنل مینیجر سے اجازت لے کر گاڑی اسلام آباد بھیجی تھی۔ اگر اگلے روز اجازت مانگتا تو مینیجر اعتراض لگاتے کہ ابھی کل ہی تو گاڑی اسلام آباد گئی ہے، آج پھر تم دوبارہ بھیج رہے ہو۔

میں نے سوچا، ایک بجے تک گاڑی اسلام آباد سے واپس آ جائے گی، اس لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔ میں نے ڈرائیور کو بتا دیا کہ تم ہر حالت میں ایک بجے تک پہنچ جانا اور اس کو روانہ کر دیا۔ گھر میں کہہ دیا کہ دو مہمانوں کے لیے کھانا تیار کر دیں۔ میں کھانے پر مہمانوں کا انتظار کرتا رہا پھر وقت گزرتا گیا اور ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوتی گئیں۔ مغرب کا وقت ہو گیا۔ جلد بارش اور ٹالہ باری بھی شروع ہو گئی۔

موسم تبدیل ہونے سے سردی شروع ہو گئی اور عشا کی اذانیں ہونے لگیں۔ ساتھ میرے بلڈ پریشر کا معیار بھی بلند ہونے لگا اور ہاتھ میں تسبیح آ گئی۔ مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ گاڑی کسی حادثہ کا شکار ہو چکی۔ میں دفتر کے کسی آدمی کو اس پریشانی میں حصہ دار نہیں بنا سکتا تھا۔ دوپہر سے میں نے مہمانوں کے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ لہذا بڑی مصیبت میں گرفتار تھا۔ سوچا کہ اگر حادثہ ہو گیا، تو سب سے پہلے ذمہ داری مجھ پر آئے گی کہ بغیر اجازت گاڑی اسلام آباد کیوں بھیجی؟ اس کے علاوہ کئی اور انتظامی معاملات بھی پیش نظر تھے۔ بارش اور ٹالہ باری اتنی تیز تھی کہ رکنے کا نام نہ لیتی۔ اسی دوران بجلی بھی چلی گئی۔

رات تقریباً سو اگیارہ بجے ہارن کی آواز آئی، تو سانس میں سانس آئی۔ چھتری اور لائٹیں لیتے ہوئے دروازہ کھولا۔ گاڑی کو ٹھیک حالت میں پایا تو شکر کی سانس لی۔ لیکن دوسرے لمحے ساری خوشی کافور ہو گئی جب گاڑی سے پوری بارات اترتے دیکھی۔ چھوٹے بڑے افراد کو ملا کر بارہ نفوس تھے۔ میرا بلڈ پریشر پھر بلندی پر پہنچ گیا۔ میرے مہمان جان گئے کہ میں پریشان ہوں۔ میرے گلے لگتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں

بولے، میرے ساس سر ہیں، لندن سے آئے ہیں۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ ہم ایبٹ آباد جا رہے ہیں تو وہ کہنے لگے کہ ہم بھی ساتھ چلیں گے، باقی میرے بچے وغیرہ ہیں۔

میں نے کہا ”بھائی آپ نے تو دوپہر کو آنا تھا۔“ کہنے لگے ”جب ہم نکلنے لگے تو شادی کے گھر والوں نے کہا کہ آپ ولیمہ کھا کر جانا۔ کھانا دیر سے شروع ہوا، واپسی پر اس طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک جگہ ٹھہرنے رہے، طوفان کم ہوا تو چل دیے۔“

جلے دل کے ساتھ سب کو گھر کے اندر لائے۔ پوچھا، کھانا کھائیں گے؟ بولے ہاں! وہ تو ہم کھائیں گے۔ اس سے قبل کہ ان کے لیے کھانا تیار کیا جاتا، میری بیگم کہنے لگی کہ سردی شدید ہو گئی ہے۔ ان کے لیے لحاف اور گدوں کا انتظام کرنا ہوگا۔ چناں چہ محلے والوں کو اٹھایا گیا۔ ان کے گھروں سے لحاف وغیرہ اکٹھے کیے گئے۔ پھر ان کے لیے کھانا تیار ہوا۔ رات دو بجے فارغ ہوئے۔ صبح ان لوگوں کے لیے ناشتا تیار کیا گیا۔ دوپہر کو گاڑی دی گئی تاکہ وہ ایبٹ آباد کی سیر کر لیں۔ دو روز بعد ہمیں لاہور ایک شادی میں جانا تھا۔ تیسرے روز مہمانوں سے کہا ”جناب کل ہم لاہور جا رہے ہیں ایک شادی میں!“ آپ کا کیا پروگرام ہے؟

کہنے لگے، آپ لاہور بخوشی جائیں، ابھی ہم ایک ہفتہ اور رہیں گے۔ گھر کی چابی ہمیں دے دیں۔ جب ہم یہاں سے گئے تالا لگا چابی پڑوس میں دے جائیں گے۔ اطمینان رکھیں! آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

انھیں بتایا کہ میری بیگم اس بات کی اجازت نہیں دے گی۔ ہمارے گھر کا ماحوال بھی خراب ہو رہا ہے۔ ہمارے دفتر کے بھی لوگ آپ کو جانتے ہیں۔ آپ کسی دوسرے گھر منتقل ہو جائیں۔ کہنے لگے، جو سکون آپ کے گھر ملا، وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ہمیں بے سکون کر کے انھیں کتنا سکون مل رہا ہے۔

جب انھیں مجبور کیا، تو ہمارے مہمان کہنے لگے ”لگتا ہے

پیارے نبی کی پیاری باتیں

۱۔ اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی ہیبت سے کسی بندے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، تو اس وقت اس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے کسی پرانے سوکھے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

۲۔ اے اللہ کے نبی! بتلائیے کہ آدمیوں میں کون زیادہ ہوشیار اور دوراندیش ہے؟ آپ نے فرمایا جو موت کو زیادہ یاد کرتا ہے اور موت کے لیے زیادہ سے زیادہ تیاری کرتا ہے جو لوگ ایسے ہیں وہی دانشمند اور ہوشیار ہیں۔ انھوں نے دنیا کی عزت بھی حاصل کی اور آخرت کا اعزاز و اکرام بھی۔

۳۔ آپ نے فرمایا، ہوشیار اور توانا وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور موت کے بعد کے لیے (یعنی آخرت کی نجات و کامیابی کے لیے) عمل کرے اور ناداں و ناتواں وہ ہے جو اپنے کو اپنی خواہشات نفس کا تابع کر دے (اور بجائے احکام خداوندی کے اپنے نفس کے تقاضوں پر چلے) اور اللہ سے امیدیں باندھے (جب اس کو کسی چیز کی تمنا ہو)۔

۴۔ قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر (اللہ کے قمر و جلال اور قیامت و آخرت کے لرزہ خیز ہولناک احوال کے متعلق) تمہیں وہ سب معلوم ہو جائے جو مجھے معلوم ہے، تو تمہارا ہنسنا بہت کم ہو جائے اور رونا بہت بڑھ جائے۔

۵۔ بے شک اللہ کا خوف اور اس کے عذاب اور اس کی پکڑ سے ڈرنا ہی نجات کی کنجی ہے۔

۶۔ خدا کا خوف اور تقویٰ ہی فضیلت اور قرب کا معیار ہے۔ (یا سر رضا، لاہور)

میں ساس کی عجیب و غریب تصویر بنی رہی۔ جب میری شادی پروفیسر صاحب سے طے ہوئی، تو مجھے معلوم ہوا کہ میری ساس تو کئی سال قبل وفات پا چکی ہیں۔ مجھے ساس دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میں اسے اپنی خدمت، محبت، خوش اخلاقی سے اپنا گرویدہ بنانا چاہتی تھی۔ ہم جس دن پہلی دفعہ آپ کے گھر آئے اور آپ

رہ گئی کہ گھر کے تمام شیشے ایسے چمک رہے تھے جیسے آج ہی لگائے گئے ہوں۔ شام تک اور بہت سے کام انجام پائے۔ رافعہ کے پہلے دن کی داستان لکھی جائے تو محدود صفحات معترض ہوں گے۔

شام مغرب کے بعد پروفیسر صاحب بیگم کو لینے آئے، تو مارگریٹ نے ان سے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی کہا کہ آپ کی بیگم نے ایک ہی دن میں مجھ سے اپنی عظمت منوالی۔ میں تو وہ ہوں جس نے کبھی کسی کی سنی نہیں اور خود ہی بول بول کر اگلے کا مغز کھاتی رہتی ہوں، لیکن آپ کی بیگم نے آج ایسی ایسی دلچسپ اور نصیحت آموز باتیں کی ہیں کہ میں نے اس کے سامنے ہار مان لی۔

☆☆

قصے کو غیر ضروری طوالت سے بچاتے ہیں۔ ایک مہینے کے اندر اندر جو واقعات ہوئے، وہ آپ کو بتاتے ہیں۔ گھر کی بالائی منزل جو کئی سالوں سے بند پڑی تھی، وہ رافعہ نے کھلوائی۔ مارگریٹ کو سمجھایا کہ گھر کے کسی گوشے کو بھی اگر صاف نہ کیا جائے تو وہاں کیڑے مکوڑے، چوہے، چھپکلیاں اور نجائے کیا کیا کچھ جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ پھر آہستہ آہستہ گھر کے دوسرے کمروں میں آنا جانا شروع کر دیتے ہیں۔

ایک دن مارگریٹ نے رافعہ سے پوچھا کہ تم میری اتنی خدمت کیوں کرتی ہو جبکہ میں تم کو اس کا کوئی معاوضہ بھی نئی دیتی؟ رافعہ نے کہا اس کے پیچھے اصل میں ایک بہت دلچسپ داستان چھپی ہے۔ ہمارے ہاں مشترکہ خاندانی نظام ہے، جس میں ساس بہو کا ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں لڑکی نے ابھی پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا ہوتا کہ اس کی ماں صبح شام اس کے کان میں یہ بات ڈالتی رہتی ہے کہ بیٹی جہاں تو رہ رہی ہے، یہ تیرا اصلی گھر نہیں، اصل گھر وہ ہے جہاں تو نے شادی کے بعد جانا ہے۔ ساس کے ساتھ جب تیرا واسطہ پڑے گا، تو تجھے دن میں تارے نظر آجائیں گے۔ تو جب وہاں آنا گوندھے گی اور تیری ساس تجھے ہلتے ہوئے دیکھے گی، تو وہ اس پر بھی معترض ہوگی۔

ماں کی ساس کے بارے میں باتیں سن سن کر میرے ذہن

نے جب اپنا تعارف کرایا، تو میرا دل بہت خوش ہوا، کیونکہ وہ باتیں تقریباً اسی طرح کی تھیں جو میری ماں نے ساس کے بارے میں بتائی تھیں۔

اسی طرح تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ مارگریٹ پروفیسر صاحب سے کہنے لگی، میں آپ سے ایک درخواست کرنے لگی ہوں جو آپ نے نامنظور نہیں کرنی۔ فاروق صاحب حیران و پریشان اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مارگریٹ کہنے لگی، سچی بات ہے میں رافعہ کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی، آپ شام کو جب اسے لے جاتے ہو، تو مجھے یہ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ بانی گاڈ، اتنی محبت، اتنا احترام اور اتنی خدمت میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ بالائی منزل میں بغیر کرائے کے آپ لوگوں کو پیش کر رہی ہوں۔

پروفیسر صاحب نے کہا کہ سوچ کر بتائیں گے۔ مارگریٹ نے کہا کہ رافعہ تو مجھے روزانہ یہی سبق پڑھاتی ہے کہ سوچی پیا تے بندہ گیا۔ رافعہ کو بھی بلا لیں اور ابھی فیصلہ کریں۔ مارگریٹ باورچی خانے سے رافعہ کو پکڑ کر خود ہی لے آئی۔ مارگریٹ نے ساری بات دوبارہ دہرائی۔ رافعہ نے کہا کہ آنٹی (مارگریٹ) کی ہر بات میرے لیے حکم کے مانند ہے۔ ہم اگلے اتوار یہاں منتقل ہو جائیں گے۔ پروفیسر صاحب نے گھر سے نکلتے ہی رافعہ سے غصے میں کہا کہ تمہارا دماغ خراب ہے۔ یہ بڑی ٹیڑھی عورت ہے مجھے اس بات کا اندازہ پہلے ہی دن ہو گیا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ سیکولر مزاج کی مالک ہے جبکہ ہم چاہے جتنے بھی گناہ گار ہوں، اپنے رب سے ناتا نہیں توڑ سکتے۔

سامنے ایک چائے خانہ نظر آ رہا تھا۔ رافعہ نے کہا کہ ادھر کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب چائے خانہ میں جا کر بیٹھ تو گئے، لیکن ان کا موڈ آف تھا۔ رافعہ نے کہا: ”پروفیسر صاحب شاید آپ سے کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی کہ مارگریٹ سیکولر نہیں ہے، لیکن وہ کہتی ہے کہ میرا دل اس مذہب کو قبول کرنے کے لیے کسی صورت بھی تیار نہیں ہو سکتا جو ایک میں تین اور تین میں ایک جیسے غیر سائنسی عقائد پر انحصار کرتا ہو۔ میں نے

اسے بتایا کہ جہاں تک حضرت عیسیٰ کا تعلق ہے، ہم مسلمانوں کا ان کے بارے میں عقیدہ بالکل واضح ہے۔ وہ کہتی ہے کہ آپ کی بات میرے دل کو اپیل کرتی ہے۔

”پروفیسر صاحب! میں نے جو انگریزی قرآن آپ کے ساتھ جا کر بک شاپ سے خریدا تھا، وہ مارگریٹ کے لیے خریدا تھا۔ پہلے میں نے قرآن میں سے اسے ان تمام آیات کا ترجمہ سنایا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، پھر اس کی خواہش پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیائے کرام کے بارے میں جو آیات ہیں، وہ اسے بتائی ہیں۔“

پروفیسر صاحب نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ جلد ہی مسلمان ہو جائے گی؟

رافعہ نے کہا: ”نہیں، میرا یہ مطلب نہیں، لیکن ایک بات یقینی ہے کہ وہ اگر مسلمان نہیں تو وہ عیسائی یا سیکولر بھی نہیں۔ یہ بھی آپ کو بتا دوں کہ اب میں گھر میں جہاں چاہوں، نماز پڑھ سکتی ہوں۔ اور ہاں نماز پڑھنے کے لیے مارگریٹ میرے لیے جانماز بھی خرید کر لائی تھی۔ گھر میں تمام حرام چیزوں کا داخلہ بند کیا جا چکا، آپ کو اور کیا چاہیے۔“ پروفیسر صاحب نے کہا کہ اللہ تمہیں جزا دے۔

مارگریٹ کے گھر میں آنے کے بعد، رافعہ نے اپنی والدہ کو خط میں لکھا: امی جان! آپ کی تربیت کے طفیل، آج ہم مارگریٹ کے گھر کی بالائی منزل پر چلے آئے ہیں۔ مارگریٹ ہم سے کوئی کرایہ بھی نہیں لے گی۔ آپ کو میں نے بتایا تھا کہ میں نے مارگریٹ کو مصنوعی ساس بنا رکھا ہے۔ آپ نے ساس کو قابو کرنے کے لیے جو ایک درجن اصول بتائے تھے ان میں سے میں نے صرف پہلا اصول، یعنی محبت کے ناقدر دانوں میں جا کر محبت جتاؤ تو جانیں، ہی آزمایا تو اس سے حیران کن نتائج برآمد ہوئے۔ اب دعا کریں مارگریٹ کے دل میں ہماری وجہ سے اسلام کے بارے میں کوئی غلط تصور جڑ نہ پکڑنے پائے۔

پروفیسر صاحب بتاتے ہیں، ایک دن میں گھر داخل ہوا

تو دیکھا کہ رافعہ قرآن مجید کی تلاوت باواز بلند کر رہی ہے اور مارگریٹ دوپٹہ اوڑھے، سر جھکائے، آنکھیں بند کیے خاموشی سے سن رہی ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد رافعہ ادھر آگئی۔ پروفیسر صاحب نے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا تھا؟ رافعہ نے بتایا کہ ایک دن میں اپنی کتاب تاریخ اسلام اوپر اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ مارگریٹ میرے پاس آگئی اور پوچھنے لگی کہ تم کیا پڑھ رہی ہو؟ میں نے بتایا کہ یہ تاریخ اسلام ہے اور حضور ﷺ کے دور کا ایک واقعہ پڑھ رہی ہوں۔

مسلمانوں پر کفار نے جب بہت ستم ڈھائے، تو انھوں نے اسلامیوں کو اجازت دے دی کہ وہ حبشہ ہجرت کر جائیں۔ حبشہ ایک عیسائی ریاست تھی اور نجاشی وہاں کا بادشاہ تھا۔ مارگریٹ کو میں نے بتایا کہ وہ قصہ میں پڑھ رہی ہوں۔ کہنے لگی کہ پورا قصہ سناؤ۔ اب ہر دوسرے تیسرے دن مجھے کہتی ہے کہ نجاشی والا قصہ سننے کو دل کر رہا ہے۔ میں اس کو وہ آیات جب سناتی ہوں جو نجاشی نے بھی سنی تھیں، تو کہتی ہے کہ میں ان آیات کو نہیں سمجھتی لیکن میرے دل کو کچھ کچھ ہوتا ہے۔ شاید میرے دل کو ان آیات کی سمجھ آ جاتی ہے۔ ایسے بہت سے قصے پروفیسر صاحب اور ان کی بیگم کو یاد تھے۔

قصہ مختصر، یہ لوگ تین چار سال اس گھر میں رہے۔ مارگریٹ کہتی کہ رافعہ میں تم کو مرنے تک نہیں بھولوں گی۔ تم نے تو میرے خیالات، میری سوچ، غرض ہر چیز کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ رافعہ ہی تھی جس نے مارگریٹ کو بتایا کہ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانون چلتا ہے، اور وہ قانون ہے مکافات عمل کا آپ نے اگر اپنے والدین کو وقت نہیں دیا تو آپ کی اولاد بھی آپ کو وقت نہ دے گی اور دوسری بات ہمارے ہاں یہ کہی جاتی ہے کہ پیار کا بدلہ پیار ہے، تالی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی، جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ آج کی جوان اولاد سے دوستوں جیسا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ آپ ایک تھانیدار یا

ہیڈ ماسٹر بن کر ان کے دلوں کو قابو نہیں کر سکتے۔ رافعہ نے کہا کہ یہ کیا ہوا کہ بچے ہی خط لکھیں، بچے ہی فون کریں، بچے ہی تحفے بھیجیں، بچے ہی ملنے آئیں۔ آپ یہ کام کریں اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔ آج مارگریٹ ہر وقت اپنے چاروں بچوں سے رابطے میں ہے، ان کی غمی اور خوشی میں حصہ دار ہے، وہ بھی اپنی ماں سے تعلقات بحال ہونے پر خوش ہیں۔

پاکستان واپس آنے سے قبل رافعہ نے شوہر سے مشورہ کرنے کے بعد مارگریٹ سے بات کی کہ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے تمام بچے اپنے اہل خانہ سمیت یہاں تشریف لائیں اور میں ان کی میزبانی کروں۔ وجہ اس کی یہ ہے، ہر وقت آپ کے منہ سے ان کے بارے میں باتیں سن کر جی چاہتا ہے کہ ایک یادگار ملاقات ہو جائے۔ وہ سب یہاں کے رواج کے مطابق ہوٹلوں میں نہیں بلکہ یہاں گھر پر رہیں گے اور میرے مہمان ہوں گے جو ان کو اپنے بھائی بہنوں کی طرح سمجھتی ہے۔

مارگریٹ نے کہا کہ خیال تو اچھا ہے، اگر ان بچوں کو پسند آجائے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ رافعہ نے سب کو خط لکھے، فون کیے اور فیصلہ ہوا کہ کرسس کی چھٹیوں میں سب یہاں جمع ہوں گے۔ سب سے بڑا بیٹا آسٹریلیا میں تھا، وہ وہاں سے اپنی فیملی کے ساتھ آیا۔ دوسرا بیٹا جرمنی سے آیا۔ دو بیٹیاں امریکا کے دور دراز شہروں میں تھیں، وہ بھی آگئیں۔ پورے گھر میں عجیب و غریب سماں تھا۔ بچوں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ وہی مارگریٹ جو کسی چیز کو ادھر سے ادھر کرنا پسند نہ کرتی تھی، آج اپنے پوتے پوتیوں اور نواسوں کی الٹی پلٹی حرکات سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ سب بیٹے بیٹیاں اپنی ماں سے محبت اور الفت کا بے پناہ اظہار کر رہے تھے۔

ماں بار بار کہہ رہی تھی کہ سچی بات یہ ہے، اس اکٹھ کا سارا کریڈٹ میری پیاری، لاڈلی، فرمانبردار، مخلص بیٹی رافعہ کو جاتا ہے، یہ میری استاد ہے۔ اس نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ اس نے مجھے انسانیت سکھائی ہے، اس نے ایک ماں کے

فرائض سے مجھے آگاہ کیا ہے۔ یہ انسان کے روپ میں کوئی فرشتہ ہے۔ یہ باتیں نہیں کرتی، اس کے منہ سے تو صرف اقوال زیریں ہی نکلتے ہیں۔ تم کہو گے کہ میں نے اسے فرشتہ کیوں کہا، وہ اس لیے کہ ہر انسان ہر وقت صرف اپنی خوشی، اپنا مفاد دیکھتا ہے، لیکن میں اس پر حیران ہوں جو دوسروں کی خوشی کے لیے دیوانی اور پریشان ہو رہی ہے۔

۱۹۶۵ء میں جون یا جولائی میں اس فیملی نے پاکستان آنا تھا۔ سال کے آغاز میں پروفیسر صاحب نے اپنی کارنچ دی۔ امریکا سے پاکستان کے لیے روانہ ہونے سے چند دن قبل مارگریٹ نے کہا کہ میں آپ کو تحفہ دینا چاہتی تھی۔ آپ نے اپنی کارنچ کر میرا مسئلہ حل کر دیا۔ اب میں اپنی بیٹی رافعہ کو اپنی کار تحفے میں دے رہی ہوں۔ جب آپ لوگ پاکستان میں یہ گاڑی چلایا کرو گے، تو میں چشم تصور میں دیکھ دیکھ کر نہال ہوا کروں گی۔ پروفیسر صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ کیا ہوائی جہاز جتنی بڑی گاڑی پلے پڑ گئی۔ چھوٹی سی چار افراد پر مشتمل ہماری فیملی ہے اور یہ بلاوجہ اچھا خاصا پٹرول کا خرچہ کر ڈالتی ہے۔ رافعہ کے سامنے جب بھی بیچنے کی بات کرو، یہ رونے بیٹھ جاتی ہے کہ میری ساس کا تحفہ ہے، میں اسے کبھی نہ بیچنے دوں گی۔

رافعہ سے محبت بڑھتے بڑھتے پاکستان اور اسلام سے محبت میں تبدیل ہوئی۔ ۱۹۶۸ء میں 'مصنوعی ساس' پاکستان کے شہر فیصل آباد تشریف لائیں۔ پروفیسر صاحب ان دنوں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے منسلک تھے۔ کافی ضعیف ہو چکی تھیں، لیکن کہتیں کہ میری خواہش تھی کہ وہ سرزمین مرنے سے قبل ضرور دیکھوں جہاں لڑکیوں کی ایسی تربیت کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ماں سے بھی زیادہ ساس کی اور ساس سے بھی زیادہ 'مصنوعی ساس' کی خدمت کر کے خوش ہوتی ہیں۔ پاکستان سے جاتے ہوئے ان کے الفاظ تھے 'آج تک مجھے اجنبی لوگوں کی اتنی محبت کبھی نہیں ملی جتنی اس ایک ماہ کے دوران پاکستانیوں نے مجھے دی۔'

جنوری ۲۰۱۳ء میں رافعہ کا انتقال ہو گیا۔ اسلام آباد کے

غزل

آئے دن کی شورش و آواز سے
ہوں پریشاں ایٹھی یلغار سے
ہم دھماکے، گھن گرج ہر سو بپا
کوئی واقف ہی نہیں ملہار سے
اب مسماں کیا کریں، کیسے جہیں
سیکھنا ہے اُن کو یہ گُفتار سے
نکلے نکلے پر ہے سودا روح کا
گر گئی انسانیت معیار سے
بک رہا ہے جب سبھی دینار سے
لا دے اک جنگل مجھے بازار سے
جو محبت میں گریباں چاک تھے
کر گئے رحلت وہی دیدار سے
کچھ بھلا کیا آپ کا احوال تھا
مل گیا کیا اُن کی جے جے کار سے
صبح تک ہم اُن کی رہ تکتے رہے
دوستی اب ہو گئی بیگار سے
یہ فضا میں بھینی بھینی سی مہک
کوئی آیا تھا یہاں گلزار سے
ہم پہ اسرارِ حقیقت کھل گئے
اللہ اللہ اللہ کی تکرار سے
باتوں باتوں میں ادا تادیب کی
ہے چھلکتی آپ کی گُفتار سے
(ادامہ فی، کراچی)

ایک قبرستان میں تدفین ہوئی۔ مرتے دم تک مرحومہ کا اپنی مصنوعی ساس (مارگریٹ) کے بچوں سے رابطہ تھا۔ فوتیدگی کی اطلاع ملنے پر پروفیسر صاحب کو اُن لوگوں کے تعزیتی فون اور کارڈ موصول ہوئے۔

کھیل کھلاڑی

چھوٹے سے شیطان ہیں۔ یہ (انگریزی) لفظ دو الفاظ "Aggravating" (اشتعال انگیز) اور "annoying" (اذیت بخش) کا مخفف ہے۔ جب میں اپنی والدہ کو تنگ کرتا اور ان کا صبر آزماتا، تو دق ہو کر یہ مخفف استعمال کرتیں۔ اگر آپ جاوید کے مخالف ہیں، تو یہ لفظ ان کی شخصیت کا مل انداز میں بیان کرتا ہے۔

۱۹۷۸ء میں آسٹریلیا میں کیری پیکر سیریز کے مقابلے کھیلے گئے۔ تب جاوید عالمی ایون میں شامل تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں ان کے خلاف کھیلا۔ جب بھی میں چوکا یا چھکا مارتا، تو وہ مایوسی کے عالم میں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے۔ یہ دیکھ کر مجھے کچھ غصہ آ جاتا۔

جب جاوید بیننگ کرتے، تب بھی اپنے ہتھکنڈوں سے مخالف کھلاڑیوں کو اشتعال دلاتے رہتے۔ ان کا خاص ہتھیار کریز سے باہر نکل کر منہ گشت کرنا تھا۔ یوں وہ فیلڈر کو اکساتے کہ گیند وکٹوں پر دے مارے تاکہ نشانہ چوکے اور جاوید مزید رن لے سکیں۔ جب گیند فیلڈر کے ہاتھ میں آ جاتی، تب بھی وہ کریز کے اندر جانے کی سعی نہ کرتے۔ سونے پہ سہا گایہ کہ اس دوران ان کے ہونٹوں پر غوغ مسکراہٹ مچلتی رہتی اور وہ شرارتی لڑکے سے دکھائی دیتے۔

میں نے شروع میں ان کی نٹ کھٹ حرکات یہ سوچ کر نظر انداز کر دیں کہ وہ اترائے ہوئے بانگے ہیں۔ لیکن برسین میں مقابلے کے دوران ایک واقعے نے میرا ذوق یہ نظر تبدیل کر ڈالا۔

میں تب بلے بازی کر رہا تھا۔ جاوید میرے پیچھے، نوٹ دور اسکوائر لیگ پہ کھڑے تھے۔ میں نے گیند بلے سے روکی اور رن

جاوید میاں داد

مشہور آسٹریلوی کپتان کی نظر میں

آئن چیپل / ابو ہادی

جاوید میاں داد آپ کی ٹیم میں شامل ہیں، تو انہیں اگر ٹیمپن کا اولین نمونہ سمجھئے۔ مخالف ٹیم میں ہیں، تو قابل نفیس مد مقابل!

دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ "Aggrannoying" (اشتعال انگیز اذیت بخش)



جاوید میاں داد

پاکستان کے بہترین بلے باز، جاوید میاں داد ۱۲ جون ۱۹۵۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۹۶ء دنیا کے کرکٹ میں سرگرم رہے۔ اس دوران ۱۲۳ ٹیسٹ کھیل کر ۸۸۳۲ رنز بنائے۔ ۲۳۳ وٹے بھی کھیلے اور ۳۸۱ رنز بنائے۔ آپ کا شمار دنیا کے عظیم بلے بازوں میں ہوتا ہے۔

انھوں نے فیصلہ تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ چناں چہ ہوگ کو پولیس جاننا پڑا۔ اس واقعے سے بہر حال ہم نے یہی نتیجہ

اخذ کیا کہ جاوید میں ”اسپورٹس مین شپ“ کم پائی جاتی ہے۔

تاہم مجھے کئی برس بعد عمران خان کی آپ بیتی (All Round View) پڑھنے کا موقع ملا، تو افشا ہوا کہ جاوید میاں داد کی



جب جاوید اور ڈینس لٹی کی لڑائی ہوئی

چالوں کے پیچھے راز کیا تھا۔ عمران خان نے لکھا ہے:

”جب میرے ساتھی غیر روایتی طریقوں سے مخالف کھلاڑیوں کو آؤٹ کرتے، تو میں بہت حظ اٹھاتا۔ دراصل جاوید میاں داد سمیت اکثر پاکستانی کھلاڑی گلیوں میں کھیلی جانے والی کرکٹ کی پیداوار ہیں۔ اس ”اسٹریٹ کرکٹ“ میں مخالفین کو آؤٹ کرنے اور جیتنے کے لیے ہر ممکن حربے اختیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً فیلڈر بلے باز کو کہتا ہے کہ اس کی کوئی چیز تچ پر گر گئی ہے۔ جب وہ دیکھنے جائے، تو پیچھے سے اس کی بیلز گرا دی جاتی ہیں۔“

درج بالا بیان سے عیاں ہے کہ جاوید میاں داد کے

لینے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے علم تھا کہ جاوید خاصی دور ہیں۔ مگر وہ چیتے کی سی تیزی کے ساتھ گیند پر چھٹے۔ یہ دیکھ کر میرے ساتھی نے چیخ کر مجھے پلٹنے کا کہا۔ میں بروقت کریز پر پہنچ گیا اور نہ جاوید نے مجھے رن آؤٹ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

اس واقعے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ جاوید سوچ بچار کرنے والا کھلاڑی ہے۔ وہ ہر وقت مخالف کھلاڑی کو آؤٹ کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا ہے۔ اس احساس کے بعد میرے نزدیک جاوید نٹ کھٹ بے وقوف نوجوان نہ رہا بلکہ ایک ذہین وطن کھلاڑی بن گیا جو میدان سے باہر اپنی باتوں اور شرارتوں سے کبھی کو محظوظ کرتا تھا۔

جاوید میاں داد نے ۱۹۷۹ء میں بھی آسٹریلوی ٹیم کا ناک میں دم کیے رکھا۔ تب پاکستانی ٹیم آسٹریلیا آئی ہوئی تھی۔ میلبورن ٹیسٹ میں ہمارے بلے باز، روڈنی ہوگ نے ایک شاٹ کھیلی۔ گیند پوائنٹ پر کھڑے جاوید

میاں داد کی طرف گئی اور ان سے چند قدم دور رک گئی۔

روڈنی ہوگ یہی سمجھا کہ گیند ”ڈیز“ ہو گئی۔ چناں چہ وہ کریز سے نکل کر بلے سے تچ پہ آئی مٹی صاف کرنے لگا۔ ادھر جاوید نے گیند اٹھائی، لپک کر وکٹوں تک پہنچا اور بیلز اڑا دیں۔ امپائر نے ہوگ کو آؤٹ دے دیا۔ اس پر اسے اتنا غصہ آیا کہ اس نے ٹھوکر مار کر وکٹیں گرا دیں۔

پاکستانی ٹیم کے کپتان مشتاق محمد تھے۔ انھوں نے ہوگ کو غصے میں دیکھا، تو اسے دوبارہ کھیلنے کی دعوت دی۔ مگر کلیرنس ہاروے اپنے پہلے ٹیسٹ کی امپائرنگ کر رہے تھے،

آئن چپیل



آسٹریلیا کے مشہور
کھلاڑی آئن چپیل کا شمار اپنے
وقت کے بہترین کھلاڑیوں
میں ہوتا ہے۔ آپ نے دسمبر
۱۹۶۴ء میں پاکستان کے
خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلا۔

جنوری ۱۹۸۰ء تک میدان کرکٹ میں سرگرم رہے۔ اس
دوران ۵ ٹیسٹ کھیل کر ۵۳۴۵ رنز بنائے۔ ۱۶ ایک روزہ
مقابلے کھیلے۔ میدان سے رخصت ہونے کے بعد مبصر
(کمنٹیٹر) بن گئے۔ آپ اپنے معلومات افروز، جامع اور
بے لاگ تبصروں کی بدولت پاک و ہند میں بہت مشہور
ہوئے اور عزت پائی۔ آپ کے بھائی، گریگ چپیل کا شمار
بھی ممتاز کرکٹ کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔

علاوہ کراچی میں اور بہت سے ”aggrannoying“
چھوٹے شیطان پائے جاتے ہیں۔

۱۹۸۱ء میں جاوید سے ایک ”جرم“ سرزد ہو گیا۔ وہ یہ کہ
انھوں نے آسٹریلیویوں کے گھر ہی میں ان کے ایک دیوتا سے
پزنگا لے لیا جسے وہ بڑی عقیدت سے پوجتے تھے۔

پاکستانی ٹیم تین ٹیسٹ کھیلنے آسٹریلیا آئی تھی۔ اس کے
کپتان جاوید میاں داوہی تھے۔ پہلا ٹیسٹ ۱۳ تا ۱۷ نومبر کو پر تھ
میں کھیلا گیا۔ دوسری انگ میں جب جاوید کھیلنے آئے، تو
آسٹریلیا کا پلہ بھاری تھا۔ تب بالر ڈینس لئی کا دنیا کے کرکٹ
میں طوطی بول رہا تھا اور آسٹریلیویوں کے تو وہ راج دلارے تھے۔
لئی نے جاوید کو آؤٹ کرنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ چٹان
کی طرح جھے رہے۔ اس کشمکش کو لئی نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔
ایک بار جاوید کا راستہ روک کر اس نے چاہا کہ انھیں طیش میں
لے آئے۔ لئی اپنے پلان میں کامیاب رہا اور جاوید غصے میں آ
گئے۔ انھوں نے بلا اٹھا کر لئی کو مارنا چاہا، تو وہ ڈر کے مارے
دبک گیا۔ بہر حال دونوں کھلاڑیوں کے اس مناقشے کو پوری دنیا
میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

دونوں غصیلے کھلاڑیوں کے درمیان آکر امپائر ٹونی کارٹر
نے بیچ بچاؤ کرایا۔ بہر حال اس واقعے سے سبھی پر عیاں ہوا
کہ جاوید ان کھلاڑیوں سے خوفزدہ نہیں ہوتا جو ”پزنگا“ لینے
کے شوقین ہوتے ہیں۔

جاوید میاں داد کی بے خوفی و دلیری ۱۹۸۷ء میں بھی
نمایاں ہوئی۔ اس سال یہ قانون منظور ہوا کہ جو شارٹ پیچ
گیند بلے باز کے کاندھے سے اوپر ہوئی، اسے نوبال قرار دیا
جائے گا۔ جاوید نے اس قانون کی مخالفت کی۔ جاوید کا کہنا
تھا کہ یہ قانون تیز رفتار بالروں کا گلا گھونٹ ڈالے گا۔
دلچسپ بات یہ ہے کہ جاوید ایسے وقت قانون کا مخالف بنے
جب ویسٹ انڈین ٹیم میں نہایت خطرناک فاسٹ بالر شامل
تھے۔ وہ ہر بال شارٹ پیچ کرانے کی قدرت رکھتے۔ مگر

جاوید کو ایسی ہی بالیں کھیلتے ہوئے مزہ آتا۔
جاوید نے تو بھارتی لیجنڈ، سنیل گواسکر کو بھی نہیں بخشا۔
گواسکر کی عادت تھی کہ جب وہ پاکستانی ٹیم کے خلاف کھیلتے،
تو بلے بازی کرتے ہوئے ایک عجیب حرکت دہراتے۔ وہ یہ
کہ جب گیند قریب ہی رکتی، تو وہ جھکتے، کریز سے کچھ اٹھاتے
اور پھر پھینک دیتے۔

میں نے ایک بار گواسکر سے پوچھا کہ وہ گیند کے قریب
سے کیا اٹھاتے تھے؟ وہ کہنے لگے، میری عادت تھی کہ گیند کے
قریب آگے تھوڑی سی گھاس اکھیرتا اور پھر وہیں ڈال دیتا۔
لیکن گواسکر کی یہ عجیب حرکت شرارتی جاوید میاں داد کی
نگاہوں میں آگئی۔ چناں چہ جب بھی گیند بیننگ کرتے گواسکر
کے قریب رک جاتی، وہ آواز لگاتے:
”چلو، چلو، گیند اٹھاؤ بڈھے۔“

ان کی شرارتوں سے مخالف ٹیم کے بعض کھلاڑی برا

مناتے، کچھ لطف اندوز ہوتے۔ بہر حال جاوید نے اپنی خداداد صلاحیتوں، محنت اور مستقل مزاجی کے بل بوتے پر خود کو دنیا کے کرکٹ کے بہترین بلے بازوں میں سے ثابت کر دیا۔

ان کے دامن پر اگرچہ ایک سیاہ دھبہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ جاوید بحیثیت کپتان اپنی ٹیم کو متحد نہ رکھ سکے۔ کبھی کرکٹ بورڈ نے انھیں فارغ کیا کبھی وہ خود کپتانی سے مستعفی ہو گئے۔ کبھی کھلاڑیوں نے ان کی زیر قیادت کھیلنے سے انکار کیا۔ تاہم کھلاڑی کے طور پر انھوں نے ہمیشہ جیت کی خاطر جان تک لڑا دی۔ وہ کہتے ہیں: ”میں ایک جارحانہ مزاج معاصر ہوں اور فخر مند پاکستانی۔“

ناخوشگوار واقعات کے باوجود خصوصاً ایک روزہ کرکٹ میں جاوید کی کپتانی میں پاکستانی ٹیم نے کئی یادگار مقابلے کھیلے۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۱ء میں پاکستانی ٹیم نے آسٹریلیا میں ٹیسٹ اینڈ بھجور ورلڈ سیریز کپ

کے ایک روزہ مقابلوں میں حصہ لیا۔ اس کا مقابلہ آسٹریلیوی اور ویسٹ انڈین ٹیموں سے ہوا۔ کپ میں جاوید کی بہترین کپتانی کے باعث پاکستان نے کم از کم تین میچ جیتے۔ ان کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ جیت دشمن کے جبروں سے کھینچ لائیں۔

جب کپتانی کا بار کاندھوں پر نہ ہوتا، تو جاوید اپنے آپ اور دوسروں کو بھی لطف دینے کی خاطر پھلجھریاں چھوڑتے رہتے۔ ۱۹۹۲ء کے عالمی کپ میں پاک بھارت ٹاکرا ہوا۔ دوران میچ بھارتی وکٹ کیپر، کرن مورے اچھل اچھل کر جاوید کے خلاف اپیلیں کرتے رہے۔ انھوں نے

پھر جس مزاحیہ انداز میں بھارتی وکٹ کیپر کی نقل اتاری، یہ تاریخ کا انمٹ نقش بن چکی۔

عالمی کپ ۱۹۹۶ء کا کوارٹر فائنل پاکستان اور بھارت کے مابین بنگلور میں کھیلا گیا۔ جب تک جاوید میاں داد آؤٹ نہیں ہوئے، ہر بھارتی شہری کا سانس سینے میں اٹکا رہا۔ دراصل دس سال قبل شارجہ میں انھوں نے محیر العقول انداز میں چھکا مار کر بھارتیوں کو یقینی جیت سے محروم کر دیا تھا۔ اسی لیے بھارتیوں کو خطرہ تھا، جاوید دوبارہ وہ کرشمہ نہ دکھادیں۔

جاوید میاں داد تادیر مقابلہ کرتے رہے، مگر پاکستان میچ جیت نہ سکا اور عالمی

کپ سے باہر ہو گیا۔ لاہور میں فائنل سے قبل جاوید نے عالمی کپ کی کورٹیج کے لیے دنیا بھر سے آنی ٹیلی ویژن کی شخصیات کو ایک پارٹی دی۔ اس پارٹی میں جاوید نے مختصر تقریر کی اور



جاوید بھارتی وکٹ کیپر، کرن مورے کی نقل اتارتے ہوئے

بھارت میں بذریعہ ٹیلی ویژن کرکٹ کو مقبول بنانے والے بھارتی شہری، مارک مسکار بناس کو خراج تحسین پیش کیا۔ وہ فخر مند پاکستانی ہیں، لیکن دوسروں کے کارناموں پر تعریف کرنے سے گریز نہیں کرتے چاہے مدوح بھارتی ہی ہو۔

رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ جاوید غیر معمولی کھلاڑی ہی نہیں، بلکہ ان کی کمپنی میں وقت بہت خوشگوار گزرتا ہے۔ ان کی حقیقی شخصیت اس ”aggrannoying“ چھوٹے شیطان سے بالکل مختلف ہے جسے میں نے پہلی ملاقات کے وقت دیکھا تھا۔



جوہر قابل

فاروق کی دوسری بیٹی مریم کی زندگی کا آج سب سے اہم دن ہے۔ وہ بے حد خوش ہے، لیکن حالات کی تلخی کا زہر بھی رگ و پے میں گھل رہا ہے۔

مریم پنجاب یونیورسٹی میں بی بی اے آنرز کے آخری سیمسٹر میں زیر تعلیم ہے۔ میٹرک اور انٹر میں وہ امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس ہوئی تھی۔ بی بی اے آنرز کے سات سیمسٹر میں بھی وہ شاندار رزلٹ پیش کر چکی تھی۔ پنجاب حکومت کی طرف سے طلبہ کو ۲۳ مارچ کو لیپ ٹاپ دینے کی تقریب میں جن دس طالبان علم کو اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر وزیراعظم نواز شریف سے لیپ ٹاپ وصول کرنے کے لیے منتخب کیا گیا، اس فہرست میں مریم کا نام دوسرے نمبر پر تھا۔

تقریب میں یونیورسٹی کے ہزاروں طلبہ شریک ہو رہے تھے۔ یونیورسٹی کے تمام اساتذہ اور والدین بھی مدعو تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے لاکھ لاکھ میدان شرکا سے بھرا ہوا تھا۔ پہلی قطار میں مریم فاروق اپنی والدہ شمیم اور بہن کرن کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ جب مریم اپنا اعزاز لینے اسٹیج پر گئی، تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ آنسوؤں کی

مارچ ۲۰۱۲ء کی صبح لاہور کی ایک غریب بستی کے تین ۲۳ مرلے کے مکان پر بے بسی کے گہرے احساس نے دستک دی۔ اس صبح تک گھر کے مکینوں کو نامساعد حالات کی چکی میں پستے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ روح کو گھائل کر دینے والے اس عرصے میں انہیں غربت کی تند و تیز لہروں کے برعکس تیرنا پڑا، لیکن ان کے عزم کی پختگی میں کمی نہیں آئی۔ اولاد کے دل میں علم کی جوت جلانے والے فاروق احمد اور شمیم

ماں کی جیت

ایک غریب علم دوست گھرانے کی سبق آموز داستان جہاں بیٹیوں کو پڑھانے کے لیے والدین نے ان گنت قربانیاں دیں اور آخر کار سرخرو ہوئے

خالد ارشاد صوفی



ایک جھڑی اس باہمت اور باصلاحیت طالبہ کے من آنگن پر بھی
برسنا شروع ہو گئی۔ ان آنسوؤں کے پیچھے حصول علم کے لیے جہد
مسلل کی ایک حیران کر دینے والی کہانی ہے۔

☆☆

فاروق احمد کا تعلق خوشحال گھرانے سے تھا۔ وہ لاڈلو پیار کی
وجہ سے مڈل تک ہی تعلیم حاصل کر سکا۔ بڑے بھائی نے سفارش
کر کے ایک بینک میں ڈرائیور کی ملازمت دلوا دی۔ برسر روزگار
ہونے کے بعد گوجرانوالہ کی شمیم ہٹ سے شادی ہو گئی۔ شمیم کی
تعلیم بھی مڈل تھی۔ شادی کے بعد دونوں سمن آباد میں فاروق احمد
کے آبائی گھر میں رہنے لگے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ شادی کے
دو سال بعد اللہ نے ایک بیٹی سے نوازا۔ انھوں نے اس کا نام
کرن فاروق رکھا۔ اس کے بعد مریم، نانک، عمر، عثمان اور ماہ نور
پیدا ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ فاروق احمد میں سنجیدگی آئی اور
روپے کمانے کی جستجو پیدا ہوئی۔ بینک کی ملازمت کے ساتھ
ساتھ انھوں نے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے چھوٹے پیمانے
پر نجی کاروبار بھی شروع کر دیا۔

انہی دنوں اس کی برانچ میں ایک نوجوان منیجر تعینات ہوا۔
نوجوان اچھے کردار کا مالک تھا۔ فاروق احمد کی اس افسر سے اچھی
علیک سلیک ہو گئی۔ دوران گفتگو اس نوجوان منیجر نے بتایا کہ میری
تعلیم اور قابلیت کی بنا پر مجھے بینک انتظامیہ نے میری مرضی کے
مطابق گھر کے قریب برانچ میں تعینات کیا ہے اور مجھے کسی قسم کی
سفارش نہیں کرنا پڑی۔ اس معمولی سی بات نے فاروق احمد کے
دل میں یہ بات ڈال دی کہ اگر بچوں کو معیاری تعلیم دلوائی جائے
اور وہ باصلاحیت ہوں، تو انھیں آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک
سکتا۔ اسی شام اس نے اپنی بیوی سے کہا ”میرے ساتھ عہد کرو
ہم اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے اور ان کے ذہن میں ہر
جماعت میں ٹاپ کرنے کا جذبہ پیدا کریں گے۔“

سادہ اور کم پڑھے لکھے میاں بیوی نے اپنے عہد کو ساری
زندگی یاد رکھا اور اسے پورا کرنے کے لیے ہر دکھ اور درد کو خوش دلی

سے برداشت کیا۔ فاروق احمد نے اپنی بیٹیوں کو معیاری اسکول
میں داخل کروا دیا۔ دونوں میاں بیوی نے بیٹیوں کے دل میں علم
حاصل کرنے اور ہمیشہ جماعت میں ٹاپ کرنے کی جوت
جگائی۔ فاروق احمد اور شمیم کو اپنے اپنے والدین سے جائداد میں
حصہ ملا، تو انھوں نے اس رقم سے پرانی گاڑیاں فروخت کرنے کا
شوروم بنالیا۔ کاروبار نے روز بروز ترقی کی، انھوں نے دس
مرلے کا ایک خوبصورت گھر خرید لیا۔ آنے والے دنوں میں شہر
کے مختلف حصوں میں مزید دو گھر خرید کر کرائے پر چڑھا دیے۔
فاروق احمد نے نئے گھر تعمیر کر کے فروخت کرنے کا کام بھی
شروع کر دیا۔ خوشحالی کے ان دنوں میں دونوں میاں بیوی نے
اپنے غریب بہن بھائیوں کی ہر ممکن مدد کی۔ شمیم کی بڑی بہن
صفیہ کے حالات بہت خراب تھے۔ ان کے پاس اپنا گھر نہیں
تھا۔ شمیم نے بڑی بہن کو آٹھ لاکھ روپے کا مکان تعمیر کر کے تحفے
میں دیا۔ رشتہ داروں میں کسی کو بھی رقم کی ضرورت ہوتی، تو وہ
بلا تکلف ان سے رابطہ کر لیتے۔

فاروق احمد اور شمیم کی خوشحالی کے یہ دن عارضی نکلے۔
۲۰۰۲ء کے دوسرے مہینے کا واقعہ ہے، ان دنوں کرن فاروق
نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ اس کے چہرے پر ورم ہو گیا
تو والدین نے سمجھا شاید جلد کی معمولی بیماری ہے، لیکن یہ تو ایک
طویل مرض کی ابتدا تھی۔ روز بروز کرن کی حالت خراب ہوتی
گئی۔ اس کے پورے چہرے پر زخم بن جاتا جس سے مواد نکلتا
رہتا۔ عام ڈاکٹروں سے لے کر ماہر امراض جلد تک کو دکھایا،
لیکن مرض کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ مختلف ٹیسٹ کروائے گئے۔ شیخ
زید اسپتال لاہور میں میڈیکل بورڈ بیٹھا تو Systemic
lupus erythematosus نامی مرض کی تشخیص ہوئی۔

یہ جلد کے کینسر کی ایک بیماری ہے جس کا پاکستان میں
علاج ممکن نہیں تھا۔ آنے والے دنوں میں کرن فاروق کے
چہرے کے ساتھ ساتھ سر کی جلد پر بھی زخم ہونا شروع ہو گئے۔ سر
کے بال زخم والی جگہ سے جڑ گئے۔ اس نہایت تکلیف دہ مرض

کے باوجود کرن کے والدین اسے اسکول بھیجتے رہے۔ کرن فاروق نے بھی مرض اور تکلیف کو تعلیم کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ اسکول کی اساتذہ اور سہیلیوں نے بھی اس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ بعض اوقات وہ کئی کئی دن اسکول نہ جاپاتی، تو اس کی والدہ اسکول سے لڑکیوں کی ہوم ورک کی کاپیاں لے آتی اور کرن بستر پر لیٹے ہوئے بھی پڑھائی جاری رکھتی۔ میٹرک کے سالانہ امتحانات سے ایک ہفتہ قبل اس کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ وہ کئی دن تک بے ہوشی کی حالت میں پڑی رہی۔ جس دن پہلا پرچہ تھا، اس کے چہرے اور سر پر پٹیاں بندھی تھیں اور بائیں بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ جب میٹرک کا رزلٹ آیا، تو اس باہمت لڑکی نے ۸۵۰ میں سے ۸۸ نمبر حاصل کیے تھے۔

ہوگیا۔ اب اس کے سامنے دو راستے تھے، ایک یہ کہ وہ کہیں معقول معاوضے پر ملازمت کرے اور دوسرا یہ کہ اپنے اثاثے بیچ کر اولاد کی تعلیم مکمل کروائے۔ اچھے معاوضے پر ملازمت ملنا ممکن نہیں تھا لہذا اثاثے بیچ کر بڑی بیٹی کا علاج اور دیگر بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کی کوشش کی گئی۔ دو سال کے عرصے میں گاڑیاں اور مکان بک گئے۔ چار سال کے مسلسل علاج اور لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد آخر کرن فاروق صحت یاب ہوگئی۔ کرن سے چھوٹی مریم فاروق کو بھی خدا نے اعلیٰ صلاحیتوں سے نواز رکھا ہے۔ میٹرک کے امتحانات میں اس نے ۸۲ فی صد نمبر حاصل کیے۔

مالی مشکلات سے تنگ آکر شمیم نے بھی ملازمت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کئی دن مختلف

دفتروں کے چکر کاٹنے کے بعد اسے اشیا صرف کے حوالے سے سروے کرنے والی ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اس کا کام گھر گھر جا کر مختلف کمپنیوں کے صابن، سرف، ٹوتھ پیسٹ،



بیٹی کا علاج کروانے کے لیے فاروق احمد نے بینک سے گولڈن شیک بینڈ لے لیا۔ فاروق احمد کو ۸ لاکھ روپے ملے۔ انھوں نے اپنے ایک قریبی دوست انور بھٹی کو ڈیفنس میں پلاٹ خریدنے کے لیے ۷ لاکھ

شمیم وغیرہ کے بارے میں رائے معلوم کرنا تھا۔ ایک دن شمیم اور اس کی تین ساتھی خواتین کو ملتان اور بہاولپور میں سروے کرنے بھیجا گیا۔ جب یہ چاروں ملتان پہنچیں، تو شمیم ہوٹل میں رات گزارنے کے لیے اس خوف سے تیار نہ ہوئی کہ کہیں اس ہوٹل میں کوئی جرائم پیشہ لوگ یا پریمی جوڑے قیام پذیر ہوں۔ پولیس دھاوا بول دے اور وہ چاروں بھی پھنس جائیں۔

حسن اتفاق سے ان دنوں حضرت شاہ شمس تبریز کے عرس کی تقریبات جاری تھیں۔ شمیم نے وہ رات وہاں جاگ کر گزاری۔ دوسرے دن ان کی ٹولی بہاولپور پہنچی، تو شمیم نے وہ رات ڈائوبلس کے اڈے پر بیداری میں گزاری۔ صبح فجر کے

دے دیے اور ایک لاکھ بیٹی کے علاج معالجے کے لیے پاس رکھ لیا۔ فاروق احمد ڈیفنس میں پلاٹ خرید کر اپنی جمع پونجی کو محفوظ کرنا چاہتا تھا، لیکن جس دن فاروق احمد نے اپنے دوست کو پلاٹ خریدنے کے لیے رقم دی۔ اس سے اگلے دن اس کا انتقال ہو گیا۔ اس رقم کا سراغ نہیں مل سکا۔ میاں بیوی نے اس نقصان کو قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا۔

کرن کی میٹرک میں عمدہ کارکردگی دیکھتے ہوئے اسے ایک نجی کالج میں داخل کروادیا گیا۔ فاروق احمد بیٹی کا علاج اور چھوٹی بیٹیوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کی مصروفیت میں اپنے شوروم کو مناسب توجہ نہ دے سکے اور کاروبار چند ماہ میں ختم

وقت دوراتوں کے جگہ رتے اور کئی کلومیٹر پیدل چل کر سروے رپورٹ تیار کرنے کے بعد شمیم تھکن سے نڈھال ہو چکی تھی۔ تکلیف کے ان لمحوں میں شمیم نے نماز فجر ادا کی اور اللہ سے مشکلات سے نجات کی دعا مانگی۔ ایک دن قصور میں سروے کرتے ہوئے اس کا شوگر لیول گر گیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ لوگوں نے اسپتال پہنچایا۔ اس طرح کئی چھوٹی چھوٹی مزدوریاں کرتے ہوئے دونوں میاں بیوی نے گھر کا چولہا جلانے رکھا، لیکن بچوں کی تعلیم میں کوئی رکاوٹ نہ آنے دی۔

وقت کے ساتھ ساتھ گھر کی چیزیں بھی بکنا شروع ہو گئیں حتیٰ کہ تین مرلے کے گھر کا نچلا حصہ گروی رکھنا پڑا۔ یوں دو کمروں میں خاندان کے سات لوگوں کو سمانا پڑا۔ اب اس خاندان پر مشکل ترین دور شروع ہو چکا تھا۔ گرمی اور لوڈ شیڈنگ کے عذاب میں انھوں نے ان دو کمروں میں گزر بسر کیا۔ چار سال تک ایک چار پائی پر دو دو بہنیں سوتی رہیں۔ یہ دو کمرے ہی ان کا کچن، صحن اور سنڈی روم تھا۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے، دونوں میاں بیوی کے لیے مشکلات بڑھ رہی تھیں۔ مریم کے بعد چھوٹی بیٹی بھی میٹرک میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو گئی۔ بیٹا عمر میٹرک میں پہنچ چکا تھا۔ جب کہ عثمان اور ماہ نور بھی اسکول جا رہے تھے۔ اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے خواہش مند میاں بیوی کی ہمت کا اب نیا امتحان شروع ہو گیا تھا۔ چھ بچے زیر تعلیم تھے۔ تین بڑی بیٹیاں لاہور کے مختلف تعلیمی اداروں میں پڑھ رہی تھیں۔ بچوں کی تعلیمی ضروریات اور گھریلو اخراجات کے مقابلے میں آمدن بہت کم تھی۔ گھر کے قریب سے پبلک ٹرانسپورٹ ان کے کالج کی طرف نہیں جاتی تھی اور کالج وین لگوانے کی سکت نہیں تھی۔ کرن فاروق نے ایف ایس سی پری انجینئرنگ میں کی۔ وہ انجینئرنگ میں گریجوایشن کرنا چاہتی تھی، لیکن بیماری اور گھریلو حالات کی بنا پر مطلوبہ نمبر حاصل نہ کر سکی اور انجینئرنگ یونیورسٹی میں صرف نو نمبروں کے فرق سے داخلے سے محروم ہو گئی۔

اس کونجی کالج میں بی بی کام میں داخل کر دیا گیا۔ یہ داخلہ گھر کا فریج اور دیگر سامان بیچ کر کروایا گیا۔ اس کی چھوٹی بہن مریم فاروق نے ایف ایس سی پری میڈیکل کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ لیکن میڈیکل تعلیم کے اخراجات اس کے والدین کے لیے برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ لہذا پنجاب یونیورسٹی میں ڈی فارمیسی اور بی ایس آنرز بائیو کیمسٹری کے شعبہ جات میں داخلے کے فارم جمع کر دے گئے۔ دونوں شعبہ جات میں پہلی فہرست میں اس کا نام آ گیا تھا۔ داخلہ کے لیے رشتہ داروں سے ادھار مانگا، لیکن کہیں سے کوئی مدد نہ مل سکی۔ یوں یہ باہمت اور باصلاحیت طالبہ کسی بھی شعبے میں داخلہ نہ لے سکی۔ ایک سال بعد اسے لیٹ امیدوار ہونے کی بنا پر میڈیکل کے کسی بھی شعبے میں داخلہ نہ مل سکا اور یوں ایک باصلاحیت طالبہ کا میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ مریم فاروق کو ہیلے کالج آف کامرس پنجاب یونیورسٹی میں بی بی اے آنرز میں داخلہ دلوا دیا گیا۔

کرن فاروق نے بی بی کام کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ وہ ایم بی اے کرنا چاہتی تھی، لیکن نامساعد حالات کی بنا پر اس نے ایک بینک میں تین ماہ کے کنٹریکٹ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ وہاں اس کی ایک دفتری ساتھی نے اسے کاروان علم فاؤنڈیشن کا بتایا۔ فاروق احمد اور شمیم نے اپنی بیٹیوں کی مالی اعانت کے لیے ادارے سے رابطہ کیا۔

کاروان علم فاؤنڈیشن نے اس علم دوست گھرانے کی باصلاحیت بیٹیوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے مالی اعانت دینے کا فیصلہ کیا۔ کرن فاروق نے ملازمت چھوڑ کر بی بی کام آنرز میں داخلہ لے لیا۔ مریم فاروق کو بی بی اے آنرز اور نائلہ فاروق کو بی ایس آنرز (اسلامیات) کے تعلیمی اخراجات بھی کاروان علم فاؤنڈیشن نے فراہم کرنا شروع کر دیے۔

کرن فاروق اور مریم فاروق نے گھریلو اخراجات اور چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیمی ضروریات پورا کرنے کے لیے

والدین کا ہاتھ بٹانے کا فیصلہ کیا۔ مریم فاروق یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ایک ٹیوشن سنٹر پر پڑھانے جاتی۔ اس کے بعد ایک ہوم ٹیوشن پڑھاتی اور شام کو گھر پر اپنی بڑی بہن کے ساتھ مل کر ٹیوشن پڑھاتی۔ چار سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں مریم فاروق کے دل میں اکثر یہ حسرت سراٹھاتی رہتی کہ کاش وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنی پڑھائی کو دے سکے۔ گھریلو پریشانیوں اور ٹیوشنیں پڑھانے کے باوجود بی بی اے آنرز کے ہر سیمسٹر میں اس نے ٹاپ کیا۔ ۲۰۱۲ء میں جب وہ آخری سیمسٹر میں زیر تعلیم تھی حکومت پنجاب کی طرف سے پنجاب یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلبہ کو جنھوں نے سابق امتحانات میں ۷۰ فی صد نمبر حاصل کیے، انھیں لیپ ٹاپ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

مریم کا نام ان دس طلبہ کی فہرست میں دوسرے نمبر پر تھا جنھیں اسٹیج پر بلوا کر لیپ ٹاپ دیا جانا تھا اور کارڈ آف آنرز بھی ملنا تھا۔ یہ تقریب ۲۳ مارچ کو منعقد ہو رہی تھی۔ یہ مہینے کے آخری دن تھے۔ مریم فاروق کا المیہ یہ تھا کہ اس تقریب کے لیے اس کے پاس ڈھنگ کا جوڑا بھی نہیں تھا۔ اس نے لباس تو ایک سہلی سے مانگ لیا، لیکن اس کی خواہش تھی کہ اس انمول لمحے کی تصویر بن جائے۔ لیکن اس کے پاس کوئی کیمرہ بھی نہیں تھا۔ مریم کے ساتھ اس کی والدہ بھی تقریب میں شرکت کرنا چاہتی تھی اور اس دن یونیورسٹی آنے جانے کے لیے کرائے کا انتظام بھی بمشکل ہوا تھا۔

مریم نے جب اسٹیج پر لیپ ٹاپ وصول کیا، تو سامنے بیٹھی اس کی والدہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ کئی سالوں کی جہد مسلسل کا ثمر آج مل رہا تھا۔ مریم فاروق نے بمشکل آنسو ضبط کیے۔ قدرت نے مریم کی دوسری خواہش کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ دوسرے دن حکومت پنجاب کی ویب سائٹ پر لیپ ٹاپ وصول کرتے ہوئے اس کی تصویر موجود تھی۔ اس آرزو کے پورا ہونے پر پورے گھرانے نے سجدہ شکر ادا کیا۔ اس کے چند دنوں بعد مریم فاروق نے بی بی اے آنرز میں پوری یونیورسٹی میں ٹاپ

کیا اور جس دن اسے گولڈ میڈل ملنا تھا، غربت ایک بار پھر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ کانوکیشن میں شرکت کے لیے اس کے پاس نیا گاؤن خریدنے کے لیے گیارہ سو روپے بھی نہیں تھے۔ وہ اس گاؤن کو یادگار کے طور پر رکھنا چاہتی تھی، لیکن مجبوراً اسے اڑھائی سو روپے کرایہ پر یہ گاؤن لینا پڑا۔

اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے جدوجہد کرنے والے والدین کی محنت ثمر آور ہو رہی ہے۔ کاروان علم فاؤنڈیشن کے تعاون سے کرن فاروق نے ایم فل تک کی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ مریم فاروق بی بی اے آنرز کرنے کے بعد ایم بی اے کر رہی ہے۔ نانکہ فاروق بی ایس آنرز (اسلامیات) اور ایل ایل بی کی تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی کا آغاز کرنے جا رہی ہے۔ کرن فاروق کو ایک سرکاری کالج میں عارضی لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت مل چکی ہے۔ مریم فاروق انسٹی ٹیوٹ آف بزنس مینجمنٹ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں بحیثیت لیکچرار تعینات ہو گئی ہیں۔ فاروق احمد نے پراپرٹی ڈیلر کی دکان کھول لی ہے۔ مہینے میں دو تین مکان کرائے پر چڑھانے میں کامیاب ہو جائیں، تو دس پندرہ ہزار روپے وہ بھی کمالتے ہیں۔

شمیم نے بیٹیوں کی تنخواہ سے گھر میں تین لاکھ روپے کی ایک کمیٹی شروع کر لی تھی۔ پہلی کمیٹی سے مکان کا گروی حصہ واپس لیا۔ اس علم دوست گھرانے کی بیٹیوں نے ایک قابل تقلید کام یہ بھی کیا ہے کہ ان دونوں بہنوں نے اپنی آمدنی کا دس فیصد خیرات کرنا شروع کر دیا ہے۔ کرن فاروق اور مریم فاروق کی کہانی میں سیکھنے کے کئی پہلو ہیں۔ اگر والدین خلوص نیت سے اولاد کے دل میں علم کی جوت جگادیں، تو حالات کی آندھیاں اس جوت کو بجھا نہیں سکتیں۔ اگر جذبہ سچا ہو، تو منزل آسان ہو جاتی ہے اور سفر لاکھ رکاوٹوں کے باوجود کٹھن نہیں رہتا۔ انسانی عزم میں وہ طاقت ہے جس کے سامنے نامساعد حالات کے پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور اس کا عملی ثبوت کرن اور مریم کی کہانی میں عیاں ہے۔

انسائیکلو پیڈیا مکتوبات رحمة للعالمین

نبی آخر زماں ﷺ کے تمام خطوط مبارک فرامین و معاہدات انتہائی خوبصورت انداز سے شائع ہو گئے ہیں خطوط مبارک کو تقسیم کرنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اسماء گرامی اور حالات زندگی بھی شامل ہیں یہ کتاب اعلیٰ کاغذ دیدہ زیب ٹائٹل اور نفیس جلد پر مشتمل ہے عاشقان رسول اُس مقدس کتاب کو اپنے علاقے کی لائبریریوں اور گھروں میں تقسیم کروا کر لامتناہی اجر حاصل کریں۔ یہ خطوط جن گھروں، دفاتر، کاروباری مراکز میں موجود ہونگے وہ مقام آفات الارضی و سماوی سے محفوظ رہیں گے۔ انشاء اللہ

مرتب علامہ عبدالستار عاصم

قائد اعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی پر علامہ عبدالستار عاصم کی معرکہ آرا کاوش

انسائیکلو پیڈیا

جہان قائد

مکمل 5 جلد - 15000/-

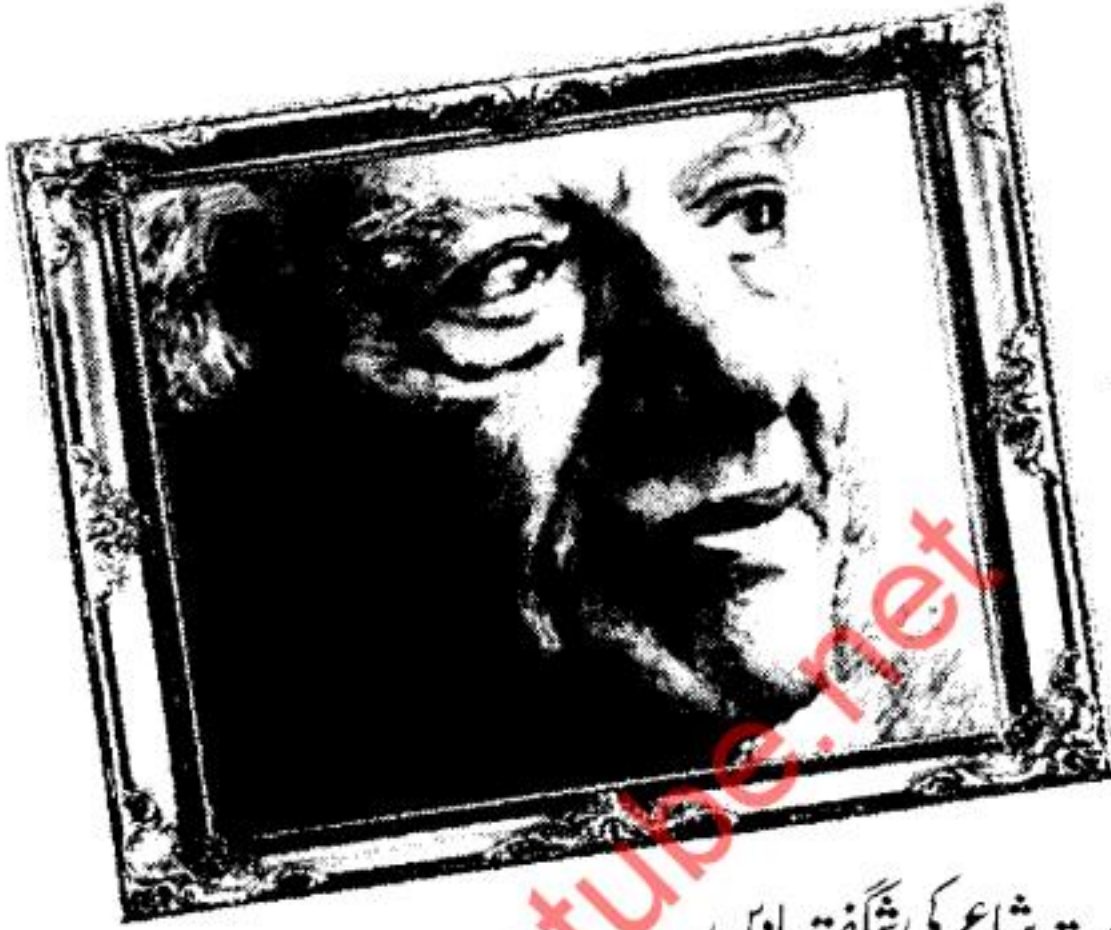
تعارف ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی

تقدیم ڈاکٹر عبدالقدیر خان

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

0300-0515101, 0333-0323/4393422 مقبول اکیڈمی چوک اردو بازار لاہور

E-mail: qalamfoundation3@gmail.com



عہد رفتہ کی نشانی

دھیمے مزاج کا آدمی

نئے آہنگ اور ندرت خیال سے آراستہ

شاعری کر کے دھوم مچا دینے والے انسان دوست شاعر کی شگفتہ یادیں

آغا ناصر

میری بڑی تعریف کی۔ مگر اس شام میرا سب سے بڑا انعام فیض صاحب سے تعارف اور ان سے عقیدت مندی کا اظہار تھا۔ فیض صاحب کے بارے میں ان کی مخالف لابی کے لوگ عام طور پر ایک بات کا بڑا چرچا کرتے اور وہ تھا ان پر غیر محبت وطن ہونے کا الزام!

وہ اپنی دلیلوں کا آغاز راولپنڈی سازش کیس سے کرتے جب فیض صاحب کو نوچی انصروں کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔ اس گروہ پر پاکستان میں کمیونسٹ انقلاب لانے کا الزام تھا۔ کہا جاتا کہ انھیں روس کی اشتراکی حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ فیض صاحب کو دوسرے ”سازشیوں“ کے ساتھ مجرم قرار دے کر قید کا حکم سنایا گیا۔ اس طرح وہ برسوں پس زنداں رہے۔ یہ الگ بات کہ قید و بند کا یہ زمانہ ان کی شاعری کے لیے انتہائی بار آور اور مفید ثابت ہوا۔ ان کی بہت سی شاہکار نظمیں اسی دور کی تخلیق ہیں۔

صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۵۵ء میں ہوئی، جب وہ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں سزا کاٹ کر کراچی آئے۔ انہی دنوں ہم چند طالب علموں نے جو تازہ تازہ سندھ مسلم کالج سے بی اے کر کے کراچی یونیورسٹی میں آئے تھے، یونیورسٹی کلب کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی۔ پروگرام یہ تھا کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو بطور مہمان مدعو کران کے ساتھ شام منائی جائے۔ میں یونیورسٹی کلب کا پہلا سیکرٹری منتخب ہوا تھا اور اس کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تقریب کے پہلے مہمان فیض احمد فیض تھے۔

تقریب کے اختتام پر چائے کے دوران فیض صاحب سے باتیں ہوئیں۔ وہ اپنے جیل کے شب و روز کا حال مسکرا مسکرا کر اس طرح سناتے رہے جیسے کسی دلچسپ تفریحی سفر کا قصہ ہو۔ یونیورسٹی کلب کی پہلی تقریب بڑی کامیاب رہی جس پر سبھی نے

ان کی جیل والی زندگی کے احوال و واقعات چند ایسے لوگوں نے قلم بند کیے جو ان کے ساتھ تھے۔ ان تحریروں کے علاوہ مجھے یعنی شاہد کے طور پر ارباب نیاز محمد سے قصے کہانیاں سننے کا موقع ملا جو ۱۹۸۰ء میں مارشل لا حکومت میں وزیر ثقافت مقرر ہوئے۔ میں ان دنوں نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا سربراہ تھا۔ چند ہی ملاقاتوں میں مجھے احساس ہو گیا کہ وہ اپنے ڈھب کے آدمی ہیں، ان سے ہماری خوب نہجے گی اور ہوا بھی یہی۔ ارباب صاحب سے میرا تعلق سرکاری ربط و ضبط سے بڑھ کر ذاتی تعلقات کی نوعیت اختیار کر گیا۔

مارشل لا میں وزارت

یہ تو بعد کی بات ہے کہ مجھے معلوم ہوا، وہ بھی راولپنڈی سازش کیس میں پکڑے گئے تھے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جن میں فیض صاحب بھی شامل تھے، حیدر آباد جیل میں رہے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے تو شعر و شاعری سے کوئی رغبت نہیں تھی مگر فیض صاحب کی شخصیت ایسی دلاویز تھی کہ میں ان کا گرویدہ ہوا اور پھر یہ رشتہ دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ انھیں فیض صاحب کی صرف ایک نظم یاد تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ نظم حیدر آباد جیل میں فیض صاحب نے انہی کی تحریک پر لکھی۔ ارباب صاحب بڑے سچے اور کھرے پٹھان تھے۔

ایک دفعہ سرکاری مشائے سے واپسی پر انھوں نے کافی پینے کے لیے مجھے اپنے کمرے میں مدعو کیا۔ بڑی لمبی گپ لگی۔ اسی ملاقات میں موقع غنیمت جان کر ان سے بڑا کڑا سوال کر ڈالا جو بڑی دیر سے میرے ذہن میں کلبل رہا تھا۔ پوچھا ”ارباب صاحب! آپ، تو اس انقلاب کے حامیوں میں سے تھے جو ملک میں اشتراکی نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ آپ سازش کیس میں مجرم قرار دیے گئے اور سزا کاٹی۔ پھر کیسے ممکن ہوا کہ آپ نے مارشل لا کے دور میں وزارت قبول کر لی؟“

ارباب صاحب بہت موڈ میں تھے۔ پہلے تو خوب ہنسے، پھر بولے ”یار میں کہاں کا اشتراکی تھا۔ مجھے نہ سیاست سے کوئی تعلق

تھا، نہ انقلاب سے۔ میں تو ایک بڑا وفادار خالص فوجی تھا جس کا ایمان اپنے افسر کا حکم ماننا ہے۔ میں جنرل اکبر کا اسٹاف افسر تھا۔ میرے فرائض میں یہ شامل تھا کہ افسر جو کہے وہی کرو لہذا جب جنرل اکبر گرفتار ہوئے، تو اس کے اسٹاف افسر کو بھی قصور وار گردانا گیا۔ ورنہ میرا تعلق ان باتوں سے بالکل نہیں تھا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ جب پوچھ گچھ ہوئی، تو میں نے ایک ذمے دار اور وفادار فوجی کی حیثیت سے صاف الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ کرنل ارباب نیاز محمد نے ہر وہ حکم مانا جو اس کے جنرل نے دیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہر حکم صحیح تھا اور یہ کہ آپ جو کچھ جنرل اکبر کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں، وہی میرے ساتھ کریں.....“

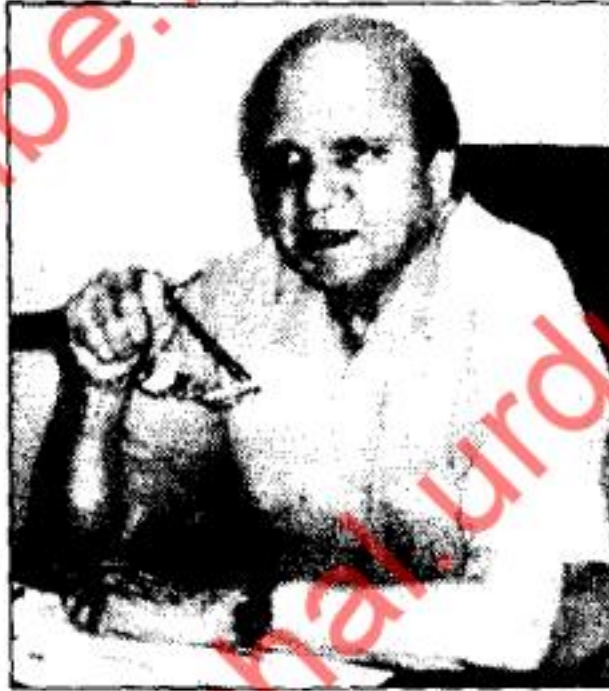
ارباب صاحب خاموش ہو گئے جیسے گزرے وقت کی تصویریں ان کے خیال میں ابھر رہی ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ بولے ”مگر یارا حیدر آباد جیل میں فیض صاحب کی صحبت نے مجھے بھی پڑھا لکھا بنا دیا۔ میں کتابیں پڑھنے، ادب، فلسفہ، سیاست اور ملکی حالات پر گفتگو کرنے لگا۔ یعنی مجھے سزا پہلے ہوئی اور جرم بعد میں سرزد کیا.....“ وہ ہنسنے لگے ”اور یارا یہ وزارت کی کرسی پر براجمان ہونے کی بات، تو بس یوں سمجھو کہ ذاتی تعلق سے ہے۔ جنرل ضیاء الحق اور میں فوج میں ساتھ تھے، لہذا جب انھوں نے مجھے کہا کہ وہ صوبہ سرحد سے کسی غیر متنازع، اچھی شہرت رکھنے والے اور عوام میں مقبول شخصیت کی تلاش میں ہیں جسے کابینہ میں وزیر بنایا جاسکے اور میں اس معیار پر پورا اترتا ہوں، تو انکار نہ کر سکا۔ میں ان دنوں پشاور میونسپل کارپوریشن کا میئر تھا۔ میں نے میئر کی نشست سے استعفا دیا اور وزیر بن گیا۔ میں نے سوچا، اس سخت زمانے میں شاید اسی طرح ضرورت مندوں کے کچھ کام کر سکوں۔“

ارباب صاحب کی شخصیت اور کردار سے واقفیت کی بنا پر میں نے ان کی وضاحت تسلیم کر لی اور پھر فیض صاحب کے جیل کے روز و شب پر گفتگو کرنے لگا۔ میں نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کروائی کہ بہت سے لوگ فیض صاحب کو ملک دشمن قرار دیتے ہیں۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں کہنے لگے ”میں نے اپنی

زندگی میں کم لوگ دیکھے ہیں جنہیں فیض سے زیادہ وطن کی محبت ہو۔ فیض صاحب خود یہ بات سن کر ہنسا کرتے۔ سازش کیس کو غیر حب الوطنی قرار دینے والوں کے بارے میں کہتے تھے کہ بھی اگر اس بات کو صحیح مان لیں، تب بھی ہم نے ملک کے خلاف، تو کوئی سازش نہیں کی۔ ہم پر تو حکومت کے خلاف سازش کا الزام تھا، ایک ایسی حکومت جو عوام میں اپنی مقبولیت کھو چکی تھی۔“

تحریک کشمیر کے حامی

اسی حب الوطنی کے بارے میں مجھے ایک قصہ یاد آتا ہے۔ یہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا کا نیا نیا زمانہ تھا۔ فیض صاحب ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ انہی دنوں ایک اخبار میں فیض صاحب کے بارے میں ایسی خبریں شائع ہوئیں جو ملک سے ان کی وفاداری مشکوک بناتی تھیں۔ ایک خبر تو یہ تھی کہ فیض صاحب کو (جوان دنوں بھارت میں علامہ اقبال کی ولادت کی سو سالہ تقریبات کے سلسلے میں لیکچر دینے گئے ہوئے تھے۔) علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا جا رہا ہے۔ دوسری یہ کہ اس بار فیض صاحب سرینگر میں اپنی شادی کی سالگرہ منانے



مصطفیٰ آغا ناصر

جار ہے ہیں۔ یہ بات اس حوالے سے تھی کہ ایس سے فیض صاحب کی شادی سرینگر میں ہوئی اور شیخ عبداللہ نے ان کا نکاح پڑھایا تھا۔

چونکہ ان خبروں کی کوئی تردید نہیں ہوئی، لہذا فیض صاحب کے احباب اور نیاز مند جو ان کے کردار سے واقفیت رکھتے تھے، بڑے آزرده خاطر ہوئے۔ لیکن ظاہر ہے، مارشل لا کے اس سخت دور میں کوئی کیا کر سکتا تھا۔ کچھ عرصے بعد مجھے کسی سرکاری کام سے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ان دنوں عبدالستار صاحب پاکستانی سفیر تھے۔ وہ وزارت خارجہ کے ان محدودے چند سینئر افسران میں سے تھے جو بڑی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مالک رہے۔ ہر ملنے والے

کے ساتھ بڑی شفقت اور مروت کا رویہ رکھتے۔ میں دہلی میں قیام کے دوران ان سے ملنے گیا۔ بڑی دیر گفتگو ہوتی رہی، پھر اچانک فیض صاحب کا ذکر آ گیا۔ انھوں نے بتایا ”فیض صاحب کافی عرصہ دہلی میں رہے۔ ان کا قیام عبدالستار صاحب ہی کے گھر تھا۔ یہ علم ہونے کے بعد کہ ہمارے سفیر بھی فیض صاحب سے تعلق خاطر رکھتے ہیں، میں نے ان کے بارے میں شائع ہونے والی دو خبروں کا ذکر کیا۔ پھر عبدالستار صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری اور سرینگر میں شادی کی سالگرہ کے سلسلے میں کچھ جانتے ہیں؟

عبدالستار پہلے ہنسے، پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگے ”ان دنوں الزامات کا، تو میں آنکھوں دیکھا گواہ ہوں۔ یہاں جب فیض صاحب اقبال پر لیکچر دینے اہل علم و دانش کی ایک محفل میں گئے، تو وہاں حکومت ہند کے اعلیٰ افسر بھی تھے۔ اسی محفل میں کسی نے فیض صاحب کو یہ پیش کش کی کہ آپ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بننے پر راضی ہوں، تو بات چلائی جاسکتی ہے۔ فیض صاحب نے بلا کسی تاثر کے جواب دیا:

”بھئی ہمارے اپنے ملک میں کیا کم یونیورسٹیاں ہیں۔ اگر وائس چانسلر ہی بننا ہے، تو ان میں سے کسی کے وائس چانسلر بن جائیں گے۔“

سرینگر میں سالگرہ منانے کا قصہ یہ تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ نے ٹیلی فون پر انھیں دعوت دی، اس بار آپ اور ایس کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم آپ کو سرینگر بلانا چاہتے ہیں، جہاں اپنی شادی کی سالگرہ منائیں اور پرانی یادیں تازہ کریں۔ فیض صاحب یہ سن کر مسکرائے اور اپنے مخصوص انداز میں بولے ”بھئی یہ تو ٹھیک ہے، مگر ہم وہاں آ کیسے سکتے ہیں؟ ہم تو کشمیر میں آپ کی حکومت کو ماننے ہی نہیں۔“

پاکستان سے محبت

حجی بات یہ ہے کہ فیض صاحب کو لاہور اور پاکستان سے جتنی محبت تھی، وہ میں نے کم لوگوں میں دیکھی۔ طویل خود ساختہ جلاوطنی کے دوران جب وہ ”لوٹس“ کے ایڈیٹر تھے، میری لندن میں جب بھی ان سے ملاقات ہوئی، میں نے انھیں وطن کی محبت میں سرشار پایا۔ وہ نام لے لے کر ایک ایک دوست اور شناسا کے بارے میں پوچھتے۔ وطن اور اپنے عزیز دوستوں کی دوری نے انھیں افسردہ کر دیا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جیل کی طرح جلاوطنی ان کی شاعری کے لیے بڑا باثر زمانہ تھا۔ اس دور میں انھوں نے معرکتہ الآرائی نظمیں اور جذبات سے معمور شعر لکھے، وہ اردو شاعری کا سرمایہ ہیں:

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدا میں
کہ سراغ پھر سے پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سر کوئے نشانیاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا

جلاوطنی کے آخری زمانے میں جب میں زہرہ نگار کے ہاں لندن میں ان سے ملا، تو اس بار انھیں معمول سے زیادہ مضطرب پایا۔ وہ واپس پاکستان آنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ دوستوں کا مشورہ تھا کہ وہ ابھی نہ جائیں مگر فیض صاحب طویل انتظار سے بیزار ہو چکے تھے۔

ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روز جزا ایسے نہیں ہوتا
ان کی بے چینی دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اب فیض صاحب
زیادہ عرصہ ملک سے باہر نکلنے والے نہیں۔ برسوں پہلے ایک بار
پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں جب ایوب خان کا مارشل لا
لگا، تو فیض صاحب ادیبوں کے کسی وفد کے ساتھ روس گئے
ہوئے تھے۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ ملک میں مارشل لا لگ چکا،
لہذا ان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وفد کے ساتھ وطن واپس نہ
جائیں۔ مجید ملک نے جو فیض صاحب کے بہت قریبی بزرگ
دوست تھے، انھیں پیغام بھجوایا کہ آپ ماسکو سے لندن چلے
جائیں اور فی الوقت وہیں قیام کریں۔

فیض صاحب مشورے کے مطابق لندن چلے گئے، مگر
تھوڑے ہی عرصہ بعد انھیں وطن کی یاد ستانے لگی۔ پھر ایک دن وہ
دوستوں کے مشورے اور بگڑے ملکی حالات یکسر نظر انداز کر
اچانک واپس لوٹ آئے۔ سنا ہے جب کراچی میں وہ مجید ملک
سے ملے اور انھوں نے پوچھا کہ میں نے تمہیں پیغام بھجوایا تھا کہ
ابھی مت آؤ، تو فیض صاحب نے ہنس کر جواب دیا ”پیغام مل گیا
تھا مگر ہم تو آ گئے۔“ ان کے دوستوں کا خدشہ جائز تھا۔ دو چار روز
بعد انھیں لاہور میں ان کے گھر سے گرفتار کر پھر زنداں کی زینت
بنادیا گیا۔

ہوائی اڈے پر تماشا

میرا خیال غلط نہیں تھا۔ اس ملاقات کے بعد جلد فیض
صاحب وطن لوٹ آئے۔ اس سے قبل ایک اور دلچسپ قصہ
بھی ہوا جس سے میرا بھی تعلق رہا۔ ہوائیوں کے ۱۹۸۱ء کے مئی یا
جون کی ایک دوپہر میں اپنی دفتر میں بیٹھا تھا کہ کراچی سے احمد
مقصود حمیدی کا فون آیا جو ان دنوں صوبائی سیکرٹری اطلاعات
تھے۔ احمد مقصود بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں اور بڑی
سے بڑی بیجانی کیفیت میں بھی ان کا مزاج سرد رہتا ہے۔
انھوں نے اپنے مخصوص میٹھے اور نرم لہجے میں مجھے بتایا کہ آج

صبح کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر تماشا ہو گیا۔ فیض صاحب کو جہاز میں سوار ہونے کی اجازت نہیں ملی اور وہ اس وقت غلام رسول تالپور کے گھر ہیں۔

قصہ یہ تھا کہ وہ یونیسکو کی کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے بیروت سے ٹوکیو جا رہے تھے۔ جب جہاز کراچی اتر، تو فیض صاحب بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ ٹرانزٹ لاؤنج میں آ گئے۔ کچھ دیر بعد جب یہ اعلان ہوا کہ فنی خرابی کے باعث جہاز کی پرواز میں چند گھنٹوں کی تاخیر ہوگی۔ فیض صاحب نے سوچا کہ کراچی کے کچھ یار دوستوں سے ٹیلی فون پر بات کی جائے۔ انھوں نے فون تلاش کیا۔ انھیں بتایا گیا کہ ٹرانزٹ لاؤنج میں ٹیلی فون نہیں ہے۔ فیض صاحب ہاتھ میں ٹیلی فون کی چھوٹی سی نوٹ بک لیے باہر آ گئے۔

کچھ قریبی دوستوں کو فون کیا کہ بھئی ہم کراچی کے ہوائی اڈے پر ہیں۔ ہماری پرواز میں تاخیر ہو گئی ہے، آکر ہم سے مل لو۔ اس خبر سے احباب کی عید ہو گئی۔ وہ برسوں کے بچھڑے اپنے محبوب فیض احمد فیض سے ملنے پہنچ گئے۔ جب مرمت کے بعد جہاز کی ٹوکیو روانگی کا اعلان ہوا اور فیض صاحب واپس جانے کے لیے چلے، تو امیگریشن والوں نے انھیں کاؤنٹر پر روک لیا اور بتایا کہ ان کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ پر ہے اور وہ ملک سے باہر نہیں جاسکتے۔ فیض صاحب نے بہت سمجھایا کہ بھئی ہم تو پہلے ہی ملک سے باہر ہیں۔ اس وقت بین الاقوامی مسافر کی حیثیت سے ایک غیر ملکی ایئر لائن سے سفر کر رہے ہیں اور صرف اپنے کچھ دوستوں سے ملنے لاؤنج سے باہر آئے تھے، مگر امیگریشن والوں نے ایک نہ سنی۔

جب ہر طرح کی کوشش ناکام ہو گئی، تو ان کے دوست انھیں شہر لے آئے۔ احمد مقصود نے مجھے بتایا کہ اب مسئلہ یہ ہے کہ صرف وفاقی حکومت سے انھیں جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔ مارشل لا کے اس دور میں وفاقی حکومت کا مطلب تھا: سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ۔ چونکہ معاملہ فیض صاحب کا تھا، لہذا اجازت

تین چیزوں کا روکنا جائز نہیں

☆ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزوں کا روکنا جائز نہیں: پانی، نمک، آگ۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ پانی کو تو ہم سمجھ گئے کہ واقعی بہت مجبوری کی چیز ہے۔ لیکن نمک اور آگ میں کیا بات ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی کو آگ دیتا ہے، تو گویا اس نے وہ ساری چیز صدقہ کی جو آگ پر پکی اور جس نے نمک دیا اس نے گویا وہ ساری چیز صدقہ کی جو نمک کی وجہ سے لذیذ ہو گئی۔ (مشکوٰۃ)

☆ حضرت سعدؓ نے حضور اقدسؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا ”یا رسول اللہؐ میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے ایصالِ ثواب کے لیے کون سا صدقہ زیادہ افضل ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ پانی سب سے افضل ہے۔ اس پر حضرت سعدؓ نے اپنی والدہ کے ثواب کے لیے ایک کنواں کھدوا دیا۔ (مشکوٰۃ)

صرف جنرل ضیاء الحق کی سطح پر ہی دی جاسکتی تھی اور یہ کام ارباب نیاز محمد کرا سکتے تھے جو وفاقی وزیر کے عہدے پر فائز تھے۔ میرے سپرد یہ کام ہوا کہ میں ارباب صاحب کو تلاش کر ساری صورت حال سے آگاہ کروں۔ خدا کا شکر ہے ارباب صاحب مل گئے۔ انھوں نے فی الفور مارشل لا سیکرٹریٹ سے رابطہ کیا اور فیض صاحب اپنی منزل کی طرف پرواز کر گئے۔ غالباً اسی کے بعد فیض صاحب نے یہ نظم لکھی:

دار کی رسیوں کے گلوبند گردن میں پہنے ہوئے
پائلیں بیڑیوں کی بجاتے ہوئے
ناچنے والے دھومیں مچاتے رہے
ہم نہ اس صف میں تھے اور نہ اس صف میں تھے

راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے
 رشک کرتے رہے
 اور چپ چاپ آنسو بہاتے رہے
 لوٹ کر آ کے دیکھا، تو پھولوں کا رنگ
 جو کبھی سرخ تھا زرد ہی زرد ہے
 اپنا پہلو ٹٹولا، تو ایسا لگا
 دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے
 وطن واپسی

اس واقعے کے اگلے برس ۱۹۸۲ء میں فیض صاحب واپس
 وطن آ گئے۔ یہ فیصلہ کرنے سے قبل وہ اسلام آباد آئے اور ارباب
 نیاز محمد کے مہمان ہوئے جنہوں نے جنرل ضیاء الحق سے ان کی
 ملاقات کا انتظام کیا۔ یہ اسی روز کی بات ہے جب جوش ملیح آبادی
 کا انتقال ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ صدر پاکستان سے ملاقات کے
 لیے جانے سے پہلے قبرستان گئے۔ جب جوش صاحب کو جگہ میں
 اتارا جا رہا تھا، وہ دیر تک قبر کے پاس کھڑے ان کی لحد کو تکتے
 رہے۔ چہرے پر شدید غم کے تاثرات تھے۔ واپسی پر انہوں نے
 کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ خاموش خاموش، کھوئے کھوئے
 واپس چلے گئے۔

بعد میں ارباب صاحب نے مجھے بتایا کہ ضیا صاحب
 سے ان کی ملاقات بہت مختصر رہی۔ انہوں نے فیض صاحب
 سے کہا ”آپ تو ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ آخر آپ
 ملک سے باہر کیوں رہتے ہیں؟ آپ کے پاکستان میں رہنے
 پر کوئی پابندی نہیں۔“

اس پر فیض صاحب نے کہا کہ رہنے پر، تو پابندی نہیں مگر
 میں چاہتا ہوں، ملک سے باہر آنے جانے پر بھی کوئی پابندی نہ
 ہو۔ جنرل ضیاء نے کہا، ایسا ہی ہوگا اور بس ملاقات ختم ہو گئی۔ اس
 کے بعد فیض صاحب نے اپنی خود ساختہ جلا وطنی ختم کر ڈالی اور
 واپس آ کر اپنے محبوب شہر لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن اس
 شہر کو دیکھ کر انہیں کچھ بہت خوشی نہیں ہوئی۔

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
 یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا
 گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دوانے
 ہر شخص کا صدچاک لبادہ تو نہیں تھا
 میجر محمد اسحاق نے جو فیض صاحب کے ساتھ راولپنڈی
 سازش کیس میں طویل عرصہ جیل میں رہے، ان پر نزول شعری
 کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے زندان نامہ کے دیباچہ میں لکھا ہے
 ”حیدر آباد میں فیض صاحب، میں اور عطا الحق کمروں میں رہتے
 تھے۔ چنانچہ میں اور عطا ان کے مزاج سے واقف ہو گئے۔
 شعر کا عالم طاری ہوتا، تو فیض خاموش ہو جایا کرتے، البتہ اٹھتے
 بیٹھتے گنگنا چکنے کے بعد ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ ہم بھانپ لیتے
 کہ سامعین کی ضرورت ہے۔“

فیض صاحب کو عربی، فارسی، اردو اور پنجابی شعرا کی
 شاعری سے حد درجہ شغف تھا۔ خاص طور پر غالب اور اقبال
 سے بے حد متاثر تھے۔ یہ بات مشہور تھی کہ جب فیض
 صاحب سے کسی نے ایک بار یہ کہا کہ آپ اس صدی کے
 اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں، تو انہوں نے یہ
 کہہ کر اس بات کو رد کر دیا ”ہر صدی میں ایک ہی بڑا شاعر
 پیدا ہوتا ہے۔ اردو شاعری کے حوالے سے انیسویں صدی کا
 سب سے بڑا شاعر غالب تھا اور بیسویں صدی کا اقبال۔“
 یہی وجہ تھی کہ انہوں نے تمام اساتذہ میں سب سے زیادہ
 مطالعہ ان دو شاعروں کا کیا۔

وہ کہا کرتے تھے کہ دیوان غالب ہمیشہ میرے سر ہانے
 رکھا ہوتا ہے۔ کراچی میں غالب لاہوری کے بانی مرزا ظفر
 الحسن اور فیض صاحب قریبی دوست تھے۔ انہوں نے لکھا ہے،
 فیض صاحب نے گفتگو کرتے ہوئے ایک بار کہا ”غالب کی
 مخصوص اچھائی یہ ہے کہ وہ ایک فرد نہیں، نسل ہے۔ وہ چند
 دلچسپ لمحوں کا ترجمان نہیں، پورے دور کا نمائندہ ہے۔
 غالب کے کلام پر ایک موہوم ہمہ گیر اداسی طاری ہے۔ اس

اداسی میں ماضی کا غم ہے۔ حال سے بے اطمینانی ہے۔ انقلاب کی آرزو ہے۔ کچھ کرنے کی حسرت ہے، نہ کر سکنے کا دکھ ہے۔ ہم سب یونہی محسوس کرتے ہیں۔ ہم میں تقریباً ہر نوجوان کی ذہنی کیفیت یہی ہے اور یہی غالب کی مقبولیت کا بڑا راز ہے۔“

ایک خوش نوا فقیر

جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے جو نسبت فیض صاحب کو ان سے تھی، وہ اردو زبان کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ دونوں کی جائے ولادت سیالکوٹ ہے۔ ابتدائی اساتذہ مشترک ہیں۔ دونوں لاہور گورنمنٹ کالج کے فارغ التحصیل

ہیں۔ دونوں نے مستقل قیام کے لیے ایک ہی شہر، لاہور کا انتخاب کیا۔ فیض صاحب کے والد سے اقبال کے گھر سے مراسم تھے۔ علامہ سے ان کی عقیدت کے اعتراف کے لیے ان کی یہ نظم ہی کافی ہے جو انھوں نے ان کی وفات پر کہی۔

آیا ہمارے دیس میں ایک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیب سنور گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
۱۹۷۶ء میں جب ملک بھر میں علامہ اقبال کی ولادت کی صد سالہ تقریبات منعقد ہو رہی تھیں، یہ سنا گیا کہ فیض صاحب ان کے فارسی کلام سے منتخب غزلوں کا اردو ترجمہ کر رہے ہیں۔ انہی

دونوں ایک روز راولپنڈی کلب میں احمد فراز اور میں، فیض صاحب کو گھیرے بیٹھ گئے۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ آپ چونکہ خود اتنے بڑے شاعر ہیں اور ایک طرح اقبال کے ہم پلہ، اس لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے تخلیقی جوہر کو ترجموں کے کام میں ضائع کریں۔

پہلے، تو فیض صاحب ہنسی مذاق میں ٹالتے اور کہتے رہے ”بھئی آپ لوگ بالکل جاہل ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں، یہ کتنا بڑا کام ہے۔“ ہماری ضد جاری رہی۔ ہم نے اصرار کیا کہ یہ ترجمے کا کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔ آپ جیسے بلند مرتبہ شاعر کو یہ زیب نہیں دیتا، تو وہ سنجیدہ ہو گئے اور یہ کہہ کر بات ختم کر دی ”آپ ترجمہ کو کمتر قسم کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ طبع زاد تخلیق کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ آپ نے ابھی تک وہ ترجمے دیکھے تک نہیں اور فضول قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔“



فیض صاحب اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ

اقبال کی اصل شاعری تو فارسی زبان میں ہے۔ یوں بھی پیام مشرق، تو ہمارے مطلب کی شاعری کی کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ضرور ہونا چاہیے۔ ”پھر کچھ اور ذکر چل نکلا اور پیام مشرق کے ترجمے کی بات ختم ہو گئی۔

پیام مشرق کا ترجمہ

مگر ختم کہاں ہوئی۔ دو تین مہینوں بعد جب میں سرکاری دورے پر لاہور گیا، تو ٹیلی ویژن اسٹیشن پر فیض صاحب کا یہ پیغام ملا، میں شام کو ان سے ملوں اور کھانا بھی ساتھ کھاؤں۔ فیض صاحب کم ہی کسی کو کھانے پر مدعو کرتے تھے، اس لیے یہ خاصی حیرت انگیز بات تھی۔ بہر حال شام کو ان کے داماد، شعیب ہاشمی کے ساتھ فیض صاحب کو ملنے ماڈل ٹاؤن والے گھر گیا۔ وہ سفید

کرتے پاجامے میں ملبوس تھے۔ (فیض صاحب علی گڑھ کٹ کا پاجامہ اور کرتا پہنتے۔) گھر کے باہر ٹہل رہے تھے۔ بڑی شفقت سے ملے۔ ہم دونوں کو اندر لے گئے اور پھر مجھے لابی میں بٹھا دیا جہاں پہلے سے ایک میز اور آسنے سامنے دو کرسیاں بچھی تھیں۔ شعیب کو کہا، اب تم جاؤ، کھانے کے وقت آجانا۔

جب وہ چلے گئے، تو فیض صاحب اندر کمرے میں کچھ لینے گئے۔ اس اثنا میں ایس آئیں، ان سے سلام دعا ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد فیض صاحب ہاتھوں میں کاغذوں کا پلندہ لیے برآمد ہوئے۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے اور کاغذوں کا پلندہ درمیانی میز پر رکھ دیا۔ پھر انھوں نے کہا ”بھئی تم اور احمد فراز نے ایک روز ہم سے پیام مشرق کے ترجمے پر بات کی تھی نا..... تو اب یہ مکمل ہو گیا ہے۔ میں نے صوفی بستم سے اس کی تک سک بھی درست کرائی۔“

میں ان کی بات سمجھ نہیں سکا اور خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ میری نگاہوں کا سوال سمجھ گئے اور کہنے لگے ”تو بھئی اب جب یہ کام ہو ہی گیا ہے، تو ہم نے سوچا، سب سے پہلے آپ ہی کو یہ ترجمے سنانا چاہئیں۔“ وہ پھر آرام آرام سے بڑا لطف لے لے کر اقبال کے فارسی کلام کے اردو ترجمے سناتے رہے۔ میں نے فیض صاحب سے خود ان کی زبانی کبھی اتنی دیر اور اتنے بہت سے شعر نہیں سنے تھے۔ جب کھانے کا وقت ہوا، تو شعیب ہاشمی آ گئے۔ ہم تینوں نے ماڈل ٹاؤن کے ایک چھوٹے سے ریستوران میں بالٹی گوشت کھایا۔ میں نے دیکھا، چلتے ہوئے انھوں نے کاغذوں کا پلندہ اپنے ساتھ کار کی نشست پر رکھ لیا تھا۔

رات گئے جب میں ان سے رخصت ہونے لگا، تو انھوں نے وہ پلندہ مجھے دیا اور کہا ”اب تم اقبال کے جشن ولادت کے سلسلے میں مرتب کیے جانے والے پروگراموں میں اسے بھی شامل کر لو۔“ میری تو جیسے عید ہو گئی۔ اگلے ہی روز میں نے لاہور ٹیلی ویژن کے پروگرام منبر، اختر وقار عظیم کو ترجموں کے یہ مسودات (فوٹو کاپیاں) دیے۔ جلد ہی ”پیام مشرق“ کے

زیر عنوان لاہور مرکز سے موسیقی کے ایک ہفت روزہ پروگرام کی پیشکش شروع ہو گئی۔ ان ترجموں کو پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ واقعی اگر ایک بڑا شاعر دوسرے بڑے شاعر کے کلام کا ترجمہ کرے، تو پھر معیار ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ذرا دیکھیے:

ہوس منزل لیلیٰ نہ تجھے ہے نہ مجھے
تاب سر گرمی صحرا نہ تجھے ہے نہ مجھے
میں بھی ساحل سے صدف چننا رہا ہوں تو بھی
حاصل اک گوہر یکتا نہ تجھے ہے نہ مجھے

☆☆

آئے ریت پہ مری حلقہ کیے نوحہ گراں
دلبراں سیم تنان سروداں گل بدناں
لا کوئی نغمہ جسے تیری زمیں پہچانے
بے خبر چھوڑ بھی دے طرز نوائے دگراں

ایک خوش مزاج آدمی

فیض صاحب سنجیدہ صفت انسان تھے، مگر ان کی سنجیدگی میں بھی عجیب طرح کی خوشگواہی اور آسودگی محسوس ہوتی۔ وہ مسکراتے تو ہر وقت رہتے تھے، لیکن طنز و مزاح ان کی گفتگو میں شامل نہیں تھا۔ میرا ان کا، تو رشتہ ہی بزرگی اور نیاز مندی کا تھا۔ ممکن ہے اپنے قریبی دوستوں اور ہم عمروں کی صحبت میں لطیفہ گوئی اور ہنسی ٹھٹھا کرتے ہوں یا شاید اپنے اہل خانہ کے ساتھ۔ میں نے کبھی سلیمہ، منیرہ یا شعیب ہاشمی سے پوچھا نہیں، لیکن یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، وہ خوش مزاج آدمی تھے۔ مذاق اور تفریح کو دل سے پسند کرتے تھے اور گا ہے اس کا اظہار بھی کرتے۔

میری بیوی کا نام صفیہ ہے، مگر فیض صاحب جب بھی انھیں دیکھتے، تو کہتے ”بھئی تم رضیہ ہو یا صفیہ۔“ آخر بار بار کے پوچھنے پر ایک بار جب وہ ہمارے گھر آئے ہوئے تھے اور انھوں نے پھر اس سوال کیا، تو صفیہ نے کہا ”فیض صاحب میں آپ کو بار بار اپنا نام بتا چکی ہوں۔ اب اگر پھر کبھی آپ نے پوچھا، تو

ان کا فون ہے۔ "جب میں نے پونگا ہاتھ میں لیا، تو دوسری
طرف فیض بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ بولے "بھئی یہ فیض انکل
فیض تو کمال کی اصطلاح ہے۔"

وہ بڑے حاضر دماغ انسان تھے۔ جب خوشگوار موڈ میں
آئے۔ ان کے علاوہ پی ٹی وی کے چیرمین، بارون
پطرس صاحب کے بیٹے اور زیڈ اے بخاری کے
والے سے بات ان دونوں بزرگوں یعنی بخاری
انکل۔ فیض ان کی باتیں کرتے رہے۔
ابھی تک ان کا کوئی ایسا جاننے والے دوست، عزیز، شاگرد
ساتھی نہیں ملا جو یہ کہہ سکے کہ اس نے فیض
میں دیکھا۔ ان کی شخصیت

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

جس کا نام دیا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں
شرارت آمیز چمک آئی، وہ ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے
بولے "بھئی میں، تو یہ بھی بخاری، پر ذرا صحت کمزور ہے۔"

آپ کی عمر ہی کیا ہے۔“

فیض صاحب کی شخصیت کو مقبول عام بنانے میں اعلیٰ درجہ کی شاعری کے علاوہ ان کی سادگی اور شیریں زبان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ان میں تکبر اور خود پسندی، بے جا انسانیت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ کسی کی دل آزاری یا کوئی ایسی حرکت کرنا جو دوسروں کو ناگوار گزرے، کوئی ایسی بات کرنا جس سے ان کے رتبے یا حیثیت کا اظہار ہو، ان کی سرشت ہی میں نہیں تھا۔ لحاظ اور مروت ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مجھے یاد ہے، ایک بار کسی محفل میں ان سے پوچھا گیا ”فیض صاحب! یہ بعض اخبارات میں آپ کے خلاف بے سرو پا الزامات اور تضحیک آمیز تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ آخر آپ ان کی تردید کیوں نہیں کرتے؟“ انہوں نے جواب دیا ”بھئی اگر ان کا اخبار یہ سب شائع کرنے کی وجہ سے زیادہ بکتا ہے، تو انھیں یہ کرنے دو۔ ہمارا کیا بگڑتا ہے۔“

ہم کیا کرتے؟

اسی سلسلے میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ کراچی میں مشہور اداکار، کمال احمد رضوی نے فیض صاحب کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ میں اور کراچی ٹیلی ویژن کے جنرل منیجر برہان الدین حسن بھی موجود تھے۔ کمال احمد رضوی ان دنوں بیچ لگژری ہوٹل کے قریب بوٹ کلب جانے والی سڑک پر ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ فیض صاحب پی ای سی ایچ ایس میں کسی کے گھر قیام پذیر تھے۔ انتظام یہ تھا کہ عالمی شہرت یافتہ وائیلن نواز امداد حسین جو پروفیسر سراج کے صاحبزادے تھے، فیض صاحب کو اپنی کار میں کمال احمد رضوی کے یہاں لے آئیں گے۔ سارے مہمان آٹھ بجے ان کے گھر جمع ہو گئے، مگر کافی وقت گزرنے کے باوجود امداد آئے اور نہ فیض صاحب۔

دواڑھائی گھنٹے کے اذیت ناک انتظار کے بعد سب نے جان لیا کہ وہ لوگ اب نہیں آئیں گے۔ بھوک سے سبھی کا برا حال

تھا۔ لفظوں میں اظہار کیے بغیر سارے مہمان دل ہی دل میں فیض صاحب کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ ہامی بھرنے کے باوجود غائب ہو گئے۔ جب گیارہ بجے کو آئے، تو کمال رضوی نے مجبوراً کھانا لگوا دیا۔ عین اس وقت نیچے سے کمال احمد کے کتے پالتو کے بھونکنے کی آواز آئی۔ مطلب تھا کہ کوئی آیا ہے۔ کمال رضوی لپک کر نیچے گئے اور ذرا دیر بعد امداد حسین اور فیض صاحب کو ساتھ لیے اوپر آ گئے۔ سب نے ایک ساتھ ان پر شکوے شکایات کی یلغار کر دی۔

آخر جب محفل ذرا پرسکون ہوئی، تو فیض صاحب نے تاخیر کا سبب بتایا۔ کہنے لگے ”بھئی ہم تو وقت کے بہت پابند ہیں۔ اول تو امداد ہمیں لینے دیر سے آئے۔ پھر جب کار میں روانہ ہوئے اور ڈرگ روڈ پر آئے (جسے اب شاہراہ فیصل کے نام سے جانا جاتا ہے) تو ہم نے ان سے کہا، بھئی آپ تو مخالف سمت جا رہے ہیں۔ کمال احمد رضوی کے ہاں جانے کے لیے، تو اس سڑک پر داہنے ہاتھ مڑنا تھا، مگر امداد نے اصرار کیا کہ وہ صحیح سمت جا رہے ہیں۔ ہم چپ ہو گئے۔ پھر جب کار ہوائی اڈے کے سامنے پہنچی، تو انھیں احساس ہوا اور واپس لوٹے، اس طرح دیر ہو گئی۔“

کسی نے کہا ”فیض صاحب جب آپ کو معلوم تھا کہ وہ غلط سمت جا رہے ہیں، تو آپ نے انھیں روکا کیوں نہیں؟“ کہنے لگے ”بھائی، ایک دفعہ کہہ تو دیا تھا، اب اگر وہ نہیں مانے، تو ہم کیا کرتے؟“

اس بھولپن پر اور صاف گوئی پر لوگوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

انسانوں سے پیار

اسی طرح کا ایک اور واقعہ اسلام آباد میں پیش آیا۔ ۱۹۸۴ء میں اسلام آباد کی ادبی تنظیم، دائرہ کی جانب سے ایک تقریب منعقد ہوئی۔ یہ اسلام آباد میں ان کی کسی تقریب میں آخری شرکت تھی۔

جلسے میں ڈاکٹر محبوب الحق نے فیض کی نظموں کے انگریزی ترجمے بھی پڑھ کر سنائے جو انہی دنوں کتابی صورت شائع ہوئے تھے۔ تقریب کے اختتام پر جب مہمان مشروبات کے لیے میزوں کی طرف گئے، تو فیض صاحب کے ایک منہ چڑھے دوست نے جو مشہور نقاد بھی ہیں، ان سے کہا ”فیض صاحب! ڈاکٹر محبوب الحق نے آپ کے شعروں کا کیسا خراب ترجمہ کیا ہے۔ سنا ہے انھوں نے طباعت سے پہلے مسودہ آپ کو دکھایا بھی تھا، تو پھر آپ نے اس کی اشاعت کی اجازت کیسے دے دی؟“

فیض صاحب نے مسکرا کر کہا ”ہاں بھی ہی ہم نے دیکھا، تو تھا لیکن جب انھوں نے ترجمہ کر ہی لیا تھا، تو ہم نے سوچا انھیں چھپوانے دیں۔ کچھ کہتے، تو ان کی دل آزاری ہوتی۔“

فیض صاحب کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو ان کے قریبی دوست اور میرے محترم ڈاکٹر آفتاب احمد نے بیان کرتے ہوئے دریا کوزے میں بند کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے ”انھیں کتابوں سے زیادہ انسانوں سے محبت تھی۔ میں نے انھیں کبھی کسی پر غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ نفرت نام کی چیز سے وہ نا آشنا تھے۔ انھیں لوگ اچھے لگتے تھے۔ ہنستے کھیلتے لوگوں میں بیٹھ کر وہ واقعی بہت خوش رہتے۔ وہ بہت کم افسردہ یا مغموم نظر آتے۔ اس معاملے میں وہ بہت پرائیویٹ آدمی تھے۔ ذاتی دکھ کو وہ خود ہی جھیلے۔ برداشت اور صبر و سکون ان کی طبیعت کا خاصہ تھے۔ اپنی افسردہ دلی سے انجمن کو افسردہ نہ کرتے۔“

آفتاب بھائی کے اس مختصر مگر نہایت جامع تبصرے کے وجود میرا جی چاہتا ہے کہ مضمون کو اشفاق احمد کے ان فقرات پر ختم کروں جو انھوں نے فیض صاحب سے اپنے نظریاتی اختلاف کے باوجود ”ملا متی صوفی“ کے زیر عنوان ”شام شہر یاراں“ کے باپے میں لکھے ”اگر فیض صاحب حضور سرور کائنات ﷺ کے نے میں ہوتے، تو ان کے چہیتے غلاموں میں سے ہوتے۔“

جب بھی کسی بد زبان، تند خو، بد اندیش یہودی و کانداری کی دراز دستی کی خبر پہنچتی، تو حضور ﷺ کبھی کبھی ضرور فرماتے ”آج فیض کو بھیجو۔ یہ دھیمہ ہے۔ صابر ہے، بردبار ہے۔ احتجاج نہیں کرتا، پتھر بھی کھا لیتا ہے۔ ہمارے مسلک پر عمل کرتا ہے۔“

زندگی کے آخری زمانے میں فیض صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ اسلام آباد آتے، تو میرا ان سے ملنا ضرور ہوتا۔ کبھی کسی ملنے والے کے گھر اور کبھی خود میرے گھر۔ اسلام آباد میں زیادہ تر ان کا قیام بیگم اقبال کے گھر ہوتا، مگر ان کے پروگرام کی تنظیم قریبی دوست ڈاکٹر ایوب مرزا کے ذمے ہوتی۔ ایوب مرزا سے میرے بھی دیرینہ روابط تھے اور اسی لیے ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی صورت فیض صاحب سے میری ملاقات کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکال لیتے۔ ۱۹۸۴ء کی آخری ملاقاتوں میں محسوس کیا کہ وہ کچھ کچھ سے نظر آنے لگے ہیں۔

آخر پروانہ آگیا

ایک تو ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے پرہیزوں کے سبب انھیں سگریٹ وغیرہ قطعی طور پر چھوڑنا پڑی۔ انھیں ایک خاص انداز سے سگریٹ پینے کی عادت تھی۔ جس طرح گفتگو کرتے یا اپنا کلام سناتے ہوئے وہ لہجے کو تھوڑا جھکا سا دیا کرتے، اسی طرح سگریٹ انگلیوں میں دبا بنے میں بھی کچھ اسی طرح کا تاثر ملتا۔ سگریٹ ترک کرنے کے باوجود بھی ان کی انگلیاں کبھی کبھی اسی طرح حرکت کرنے لگتی تھیں جیسے ان میں سگریٹ دبا ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کی شاعری میں بھی عجیب سا حزن و ملال سرایت کر رہا تھا۔ مجھے لندن میں آخری بار افتخار عارف نے ان کے جو چند شعر سنائے، انھیں سننے کے بعد مجھے جانے کیوں لگا کہ بس چل چلاؤ کی گھڑی اب زیادہ دور نہیں۔

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے، ہر چند کہ کم ہے



تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ انھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

☆☆

خاک رہ جاناں پر کچھ خوں تھا گرہ اپنا
اس فصل میں ممکن ہے یہ قرض اتر جائے

☆☆

اجل کے ہاتھ کوئی آ رہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے
اور آخر پروانہ آگیا۔ ۲۰ نومبر کی آداس شام فیض صاحب
اپنے چاہنے والوں کو نمکسار اور افسردہ چھوڑ دنیا سے رخصت ہو
گئے۔ میں ان دنوں اسلام آباد کے ای سیون سیکٹر میں رہتا تھا۔
فیض صاحب بھی دو ایک بار اس گھر میں آچکے تھے۔ اس شام
جب میں سورج غروب ہونے کے ذرا دیر بعد چہل قدمی سے لوٹا،
تو میری بیوی صفیہ اور بچے کچھ حیران و پریشان گھر کی دہلیز پر
کھڑے تھے۔ میرا ہاتھ ٹھنکا کہ ضرور کوئی بری خبر ہے۔ صفیہ کو
فیض صاحب سے میری محبت اور عقیدت کا بخوبی علم تھا۔ اسی لیے
اس نے ہزار پوچھنے پر بھی ایک دم مجھے کچھ نہیں بتایا۔ پھر اس لیے
بھی کہ صرف دو ماہ قبل میری امی کا انتقال ہوا تھا۔ ان کا صدمہ ابھی
تک دل سے محو نہیں ہوا تھا۔

آخر یہ مشکل اس طرح آسان ہوئی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بول
اٹھی، جانے کس نے فون اٹھایا اور پھر وہیں سے باواز بلند مجھ سے
پوچھا ”خالد سعید بٹ صاحب پوچھ رہے ہیں، کیا آپ ان کے
ساتھ چلیں گے.....؟ میں نے استفسار کیا کہ کہاں؟ تب صفیہ نے
بتایا کہ لاہور سے خبر آئی ہے، فیض صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔
کل صبح ان کی تدفین ہے۔ میں جیسے سنائے میں آگیا۔ جس
کمرے میں بیٹھا تھا، وہاں سامنے والے صوفے پر فیض صاحب
ایک دوپہر بیٹھے تھے۔

عیسوں پہ پردہ ڈالنا

رسول اللہؐ نے فرمایا: ”جو شخص کسی مومن سے دنیا کا
کوئی غم و مصیبت دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے قیامت
کے غم و مصائب سے ایک مصیبت دور کرے گا اور جو کسی
تنگ دست کو آسانی مہیا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت
میں اس کے لیے آسانی فرمائیں گے اور جو کسی مسلمان کے
عیب پہ پردہ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی
پردہ پوشی فرمائے گا۔ جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرنے
میں لگا رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد میں لگا رہتا ہے۔“
(صحیح مسلم)

مجھے یوں لگا جیسے وہ پھر اس صوفے پر آ بیٹھے ہیں۔ اپنے
مخصوص انداز میں سگریٹ پیتے مسکراتے ہوئے کہہ رہے ہیں
”ٹھیک ہے بھئی تم کہا کرتے تھے کہ آپ نے اپنی زندگی بڑی
سہل بنالی ہے۔ کسی بات سے انکار ہی نہیں کرتے..... تو بس یہ
ہوا۔ ہم سے موت کے فرشتہ نے آکر کہا کہ چلو..... ہم نے کہا
ٹھیک ہے بھئی۔ تم کہتے ہو، تو چلے چلتے ہیں۔“

اگلے روز ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں انھیں سپرد خاک
کرنے کے بعد جب میں، صلاح الدین اور فرہاد زیدی گاڑی میں
لاہور سے اسلام آباد آرہے تھے تو سارے راستے ہم تینوں فیض
صاحب کے شعر سناتے رہے..... لیکن جب میں نے یہ شعر
پڑھا، تو پھر سب خاموش ہو گئے۔ پھر اسلام آباد تک ہم تینوں میں
سے کسی نے ان کا کوئی شعر نہیں سنایا۔

اک گل کے مرجھانے پر کیا گلشن میں کہرام مچا
اک چہرہ گملا جانے سے کتنے دل ناشاد ہوئے
(مضمون نگار مشہور ڈائرکٹر اور مصنف ہیں۔ پاکستان ٹیلی
ویژن کے مینجنگ ڈائرکٹر بھی رہ چکے۔)

سچا واقعہ

ہے۔ آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ قبض جان نہیں چھوڑ رہی۔ آج تیسرا دن ہے اور ابھی تک حاجت نہیں ہوئی۔ اب درد سے بُرا حال ہے۔“

یہ سن کر مجھے تشویش ہوئی۔ بیگم کو دلاسہ دیا اور کہا، میں ابھی آرہا ہوں۔ پھر موٹر سائیکل کی رفتار تیز کر دی تاکہ جلد گھر پہنچ کر اسپتال جا سکوں۔ گھر جانا اس لیے ضروری تھا کہ میرے ساتھ لیپ ٹاپ اور دیگر سامان تھا۔

دفتر سے فارغ ہوتے ہی میں ایک دوست کے ہاں ضروری کام کے سلسلے میں چلا گیا۔ مصروفیت اور گپ شپ میں پتا ہی نہ چلا کہ گھڑیال نے رات کے دس بجے دیے جبکہ کام ابھی باقی تھا۔ جیسے تیسے گیارہ بجے کے قریب کام نمٹا کے فارغ ہوئے، تو گھر جانے کی ٹھانی۔ موٹر سائیکل چلا کر ابھی مرکزی سڑک پر آیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ موبائل کی اسکرین پر نمودار ہونے والا نمبر بیگم کا تھا۔

ہیلو کرتے ہی بولی ”میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا

سرکاری اسپتال کے اذیت خانے میں

شدید درد میں مبتلا ایک خاتون کو جب گورنمنٹ اسپتال میں کرپٹ آیاؤں، بے حس معالجوں اور پرچی سسٹم سے پالا پڑا..... چشم کشاد استان

سجاد قادر



بیگم امید سے تھی اور نواں مہینا چل رہا تھا۔ پرائیویٹ کلینک کی ڈاکٹر کے مطابق جس سے ہم پہلے مہینے سے چیک اپ کر رہے تھے، زچگی میں دس پندرہ دن باقی تھے۔ اس دوران بیگم کو قبض نے آن لیا اور پیشاب آنا بھی بند ہو گیا۔ پھر پیٹ، ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے اور کولہوں میں درد ہونے لگا۔ جب بیت الخلا جاتیں تو درد کی ٹیسیں اس قدر شدید ہوتیں کہ لگتا بھی جان سے جائے گی۔

ڈاکٹر نے کوئی حالت زار سے مطلع کیا، تو اس نے کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، ایسی حالت میں قبض ہو جاتی ہے۔ محلے کی سیانی خواتین کا بھی یہی کہنا تھا کہ کوئی مسئلہ نہیں، درد برداشت کریں، حمل کے دوران ایسا ہوتا ہے۔ مگر آج تیسرا دن تھا اور مرض کا فور نہ ہوا۔

گھر پہنچا ہی تھا کہ فون پر بیگم نے بتایا، ان کی امی اور ایک ہمسائی اسے فیملی اسپتال لے آئی ہیں جو لاہور کے علاقے اسلام پورہ میں واقع ہے۔ مگر وہاں کی ڈاکٹر نے کیس لینے سے انکار کر دیا، کہتی ہے کہ آپ کو چونکہ تین دن سے پیشاب نہیں آیا لہذا معاملہ پیچیدہ ہے۔ ہمارے پاس ایسے آلات اور سیٹ اپ نہیں کہ ہم کچھ کر سکیں، آپ گنگارام اسپتال چلی جائیں۔

یہ سن کر مجھے اپنی سانسیں اکھڑتی محسوس ہوئیں، میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے بیگم سے کہا کہ پریشانی کی ضرورت نہیں آپ گنگارام اسپتال جائیں، میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔ بیگم کو تو تسلی دے دی، مگر میرا اپنا دماغ گھومنا شروع ہو گیا کہ اللہ نہ کرے کہیں کوئی مسئلہ ہو جائے۔ زچگی کے آخری دن خطرناک و نازک ہوتے ہیں، ذرا سی بے احتیاطی زچہ بچہ کی زندگی خطرے میں ڈال دیتی ہے۔

رات بارہ بجے میں گنگارام اسپتال پہنچا تو بیگم، ساس اور ہمسائی کو لیبر روم ایمرجنسی کے باہر باری کا منتظر پایا۔ وہاں چونکہ خواتین کا جھوم تھا، لہذا میں قدرے دور برآمدے میں کھڑا ہو گیا اور بیگم کو فون پر اطلاع دی کہ پریشان نہیں ہونا، میں یہاں موجود

ہوں۔ وہاں کھڑے کھڑے رات کا ایک بج گیا مگر بیگم کی باری نہ آئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پریشانی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس دوران وہاں ایسے انسانیت سوز واقعات دیکھنے کو ملے جن کی وجہ سے میرے اوسان خطا ہونے لگے۔

وہاں خواتین کا اتنا جھوم تھا کہ اللہ کی پناہ۔ زچہ کے لیے بیٹھنے کی جگہ تھی نہ لیٹنے کی۔ حاملہ خواتین آخری ایام کے دوران شدید درد و کرب سے گزرتی ہیں۔ اس دوران ان کے لیے پانچ منٹ کھڑے رہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ جبکہ وہاں اکثر خواتین پچھلے چار پانچ گھنٹوں سے دیوار کا سہارا لیے استادہ تھیں۔

برآمدے سے گزرتی ڈاکٹر نیاں اور نرسیں جو کہ ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف یا موبائل اسکرینوں پر نظریں گاڑے میک اپ سے اٹے چہرے اور نہایت تنگ اور بے ڈھنگا لباس پہنے بھونڈی صورت بنائے مریضوں کو حقارت سے دیکھتیں تو زہر لگتیں۔ دل میں آتا کہ یہ کیسی پتھر دل عورتیں ہیں جنہیں دوسری خواتین کی اذیت کا احساس ہی نہیں اور قہقہے لگاتے ہوئے گزر رہی ہیں۔

وہاں کھڑے میں نے دو خواتین کو دیکھا جو ایک سولہ سترہ سالہ لڑکی کو سارے جسم پر کھیس لپیٹے برآمدے میں گھما رہی تھیں۔ لڑکی حاملہ تھی اور درد سے برا حال تھا، چہرے پر آنسو رواں تھے اور شاید اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کے اسپتال سر پہ اٹھالے۔ چہرے کے تاثرات کسی حد تک اس کی تکلیف ظاہر کر رہے تھے۔

ایک دفعہ وہ برآمدے سے ہوتے ہوئے ساتھی خواتین کے ساتھ لیبر روم کی طرف گئی پھر واپس استقبالیہ کی طرف اور پھر ایمرجنسی کی طرف اور پھر استقبالیہ کی سمت۔

جب لڑکی تھک جاتی تو تھوڑی دیر کے لیے رکنے کا کہتی۔ کھڑے کھڑے وہ تکان اتارتی اور پھر چل پڑتی۔ جب انہوں نے تین چار چکر لگائے تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے روک کر پوچھا کہ اس کو اتنی تکلیف ہو رہی ہے اور آپ اسے چکر لگوا کے

ادھ موا کر رہے ہیں۔ اسے کہیں بٹھایا لٹا دو اور رس وغیرہ پلاؤ۔ ایک خاتون کہنے لگی کہ اس کی زچگی کا وقت ہو چکا اور ڈاکٹر نے کہا ہے، بیڈ خالی نہیں۔ جب تک کوئی بیڈ خالی نہیں ہوتا، آپ اسے برآمدے کے دو تین چکر لگوا کے لے آؤ تا کہ زچگی آسانی سے ہو سکے۔ یہ سنتے ہی میرا دماغ گھوم گیا۔ میں چونکہ ڈاکٹر نہیں اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ اس حالت میں کیا کرنا ہوتا ہے اور کیا نہیں لہذا میں خاموش ہو گیا۔ مجھے حیرانی بھی بہت ہوئی کہ آج کے جدید دور میں ایسا بھی ہے کہ ایک تو زچہ کو تکلیف ہو رہی ہو، دوسرے ڈاکٹر اس پر مزید مشقت کا بوجھ ڈال دے۔

ایک اور خاتون کو دیکھا۔ وہ فرش پر ٹانگیں پیارے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ درد کی شدت سے کبھی اس طرف گرتی اور کبھی دوسری طرف۔ کئی خواتین کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اللہ نے ماں کے قدموں تلے جنت کیوں رکھی ہے۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ جو نو جوان خواتین کی عزت نہیں کرتا، وہ لیبر روم کے باہر بڑی عورتوں کی حالت پر ایک نظر ڈال لے۔ اگر اس کے اندر ضمیر ہے اور ذرا سی انسانیت بھی ہے، تو وہ ساری عمر کسی عورت کے ساتھ بدتمیزی کرنا تو دوران سے تو تڑاق بھی نہیں کرے گا۔ کئی خواتین کی دردناک حالت دیکھ کر مجھے خود پر ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ڈلیوری کا مسئلہ اتنا پیچیدہ ہوتا ہے، مجھے آج اندازہ ہوا۔ دوران حمل خواتین کا بیٹھنا اور اٹھنا خاصا مضحکہ خیز ہوتا ہے، لیکن اب اندازہ ہوا کہ اس حالت میں خواتین ماں بننے کی خاطر بہت کشت اٹھاتی ہیں۔

ان تمام خواتین کی درد و تکالیف کا مشاہدہ کرتے ہوئے میں اپنی بیگم کو بھول چکا تھا۔ اس کا خیال تب آیا جب اس نے فون کر کے بتایا کہ میں یہاں ڈیڑھ گھنٹے سے کھڑی ہوں اور اب مزید کھڑے ہونا محال ہے۔ پلیز آپ کچھ کریں ورنہ میں گرجاؤں گی۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔

فون سنتے ہی میں استقبالیہ پر گیا اور ایم ایس کا پوچھا۔

انھوں نے بتایا کہ ایم ایس صاحب آؤٹ ڈور میں بیٹھتے ہیں اور اس وقت وہ جا چکے۔ میں نے کہا کہ اس وقت کوئی تو اسپتال کا انچارج ہوگا۔ کسی کی تو ذمہ داری ہوگی جو ڈیوٹی پر موجود ہو۔ انھوں نے کہا کہ ڈی ایم ڈاکٹر عدنان کمران نمبر ۱۰ میں موجود ہیں، آپ ان سے مل لیں۔

کمران نمبر ۱۰ ایمرجنسی کے قریب ہی تھا جہاں میں پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے کھڑا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹا کے اندر داخل ہونے کے لیے اجازت مانگی، تو اس نے سر کی جنبش سے اندر آنے کو کہا۔ دفتر میں دو لوگوں کے علاوہ ایک پولیس والا موجود تھا جو کسی میڈیکل سرٹیفکیٹ پر ان کے دستخط لے رہا تھا۔ فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ ایک اور نو جوان کمرے میں داخل ہوا جس کے ساتھ لیبر روم کی آیا تھی۔ ڈاکٹر نے آیا کو دیکھتے ہی سرزنش کی کہ میں نے آپ کو پہلے بھی پیغام بھجوایا ہے کہ ان کا کیس پہلے چیک کرائیں، آپ نے پھر بھی نہیں کرایا۔ آیا نے التجائیہ انداز میں کہا کہ میں ان کے مریض کو لے کر تین دفعہ اندر گئی ہوں مگر وہاں ڈاکٹر نیاں اتنی سست ہیں کہ ادھے گھنٹے بعد ایک مریض فارغ کرتی ہیں، جبکہ باہر اتنا رش لگا ہوا ہے۔ آپ ان سے کہیں کہ وہ مریض کو جلد فارغ کریں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ آپ ابھی مریض کو ساتھ لے کر جاؤ اور ان سے کہو کہ یہ کیس ڈاکٹر عدنان نے بھیجا ہے۔ اگر وہ نہ کریں تو پھر مجھے آکے بتاؤ۔

آیا اچھا کہہ کر چلی گئی، تو ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا ”میری بیگم پچھلے دو گھنٹے سے ایمرجنسی میں کھڑی ہے۔ اس کی طبیعت سخت خراب ہے۔ براہ کرم انھیں جلد چیک کرا دیجیے۔“ ڈاکٹر نے کہا کہ میرا نائب قاصد آجائے تو میں اسے بھیجتا ہوں۔ آپ باہر کھڑے ہوں۔ باہر کھڑے کھڑے آدھا گھنٹا گزر گیا، نائب قاصد آیا اور نہ ہی ڈاکٹر نے بلایا۔ میں تذبذب میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ سامنے بیگم بمشکل چل کر آتی دکھائی دی۔

میں نے بڑھ کر بیگم کو بازوؤں سے تھاما تو اس کی حالت

قابل رحم تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور جسم کانپ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں ر کے آنسوؤں کا بند بھی ٹوٹ گیا۔ میں نے چہرہ پونچھتے ہوئے مسکرا کر بیگم سے پوچھا کہ چیک اپ ہو گیا اور ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟

بیگم نے کہا کہ وہ مجھے اندر ہی نہیں جانے دے رہے، چیک اپ خاک ہونا تھا۔ مجھ سے بعد میں آنے والی مریضہ جارہی ہیں اور مجھے روک لیا جاتا ہے۔ پھر کہنے لگی، دروازے پر کھڑی آیا پیسے لے رہی ہے۔ جو مریض پیسے دیتا ہے، اس کو بھیج دیتی ہے اور جو نہیں دیتا اسے روک دیتی ہے کہ آپ کی باری نہیں آئی۔ میں آپ کے پاس پیسے لینے آئی ہوں تاکہ میں اسے دے کر جان چھڑاؤں۔

میں نے کہا، یہ تو سرکاری اسپتال ہے، یہاں پیسے لینا جرم ہے۔ بیگم نے چڑ کے کہا، بھاڑ میں جائے سرکاری اسپتال، آپ بس پیسے دو۔ میں نے کہا، کتنے پیسے؟ وہ بولی، آپ مجھے پانچ سو دے دو تاکہ وہ مجھے فوراً اندر بھیج دے۔ اگر سو دو سو دیے، تو پھر مزید کچھ دیر ٹھہرنا پڑے گا۔ میں نے بیگم کو ساتھ لیا، دوبارہ ڈی ایم کے دفتر چلا گیا اور اسے جا کے ساری روداد سنادی۔

میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، پانچ سو روپے آپ لے لیں اور میری بیگم کو چیک کرادیں، آپ کی مہربانی ہوگی۔ آپ لوگوں نے یہاں بیٹھ کے بھی کاروبار کرنا شروع کر دیا ہے، کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ میں نے مزید کہا کہ میں آپ کے وارڈ کی انتظامیہ سے شکایت کروں گا۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر کھڑا ہوا اور معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ یہاں کوئی پیسے نہیں لیتا۔ آپ پریشان نہ ہوں، آئیے میں آپ کی بیگم کو چیک کراتا ہوں۔ اس نے فوراً اپنے اسٹنٹ کو بلایا اور مریضہ کی طرف اشارہ کر کے کہا انھیں لے جاؤ اور فوری چیک کراؤ۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے باوجود آدھا گھنٹا مزید لگ گیا۔ جب بیگم چیک کرا کے واپس آئی، تو میں نے بے تابی سے پوچھا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا؟ کہنے لگی، اندر تین میڈیکل کی طالبہ ڈاکٹر نیاں

بیٹھی ہیں۔ یا تو وہ ہاؤس جاب والی ہیں یا پھر دوران تعلیم ہی پریکٹس کر رہی ہیں کہ مریضوں پر تجربے کر کے کچھ سیکھ سکیں۔ ان میں سے ایک موبائل پہ میسجز کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ دوسری ایک مریضہ کو چیک کرنے لے گئی۔ اسے کچھ علم نہیں تھا، وہ وہیں پردے کے پیچھے سے اپنی سینئر لڑکی سے کہتی کہ ایسا ہے ویسا ہے، تو وہ اسے ڈانٹتی کہ ابھی تمہیں کچھ نہیں آتا پتا نہیں کیسے ڈاکٹر بنو گی؟

میں تیسری لڑکی کے پاس گئی، تو اس نے مجھ سے میری حالت پوچھی۔ میں نے ساری کیفیت بتائی، تو اس نے یہ مژدہ سنایا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ تین دنوں سے آپ کو پیشاب نہ آیا ہو۔ میں نے کہا کہ کبھی کبھار آتا ہے۔ اس پر اس نے مجھے قبض کا سیرپ اور دوسرا پانی میں ملا کر پینے والا ساشہ اور ایک گولی لکھ کر فارغ کر دیا۔ حالانکہ یہ خاص احتیاط اور ذمے داری والا کام ہے، یہاں سینئر ڈاکٹر کو ہونا چاہیے تھا۔ وہ میرا معائنہ کرنے کے بعد ہی مجھے ادویہ لکھ کے دیتی۔ اس نے تو مجھے ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کیا اور دوائیں لکھ کے دے دیں۔

یہ کہانی سنانے کے بعد بیگم نے اپنے درد اور بگڑتی صورت حال کا پھر سے احساس دلایا۔ تب رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔ میں بیگم کو لیے اسپتال سے باہر آ گیا۔ اب میرا رخ کسی پرائیویٹ اسپتال کی طرف تھا جہاں میرے پچاس ساٹھ ہزار روپے لگ جانے تھے۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ بڑے آرام سے ڈاکٹر نارمل ڈیلیوری کو بڑے آپریشن کا نام دے ڈالیں گے۔

میں راستے میں سوچتا رہا، ڈاکٹروں کی بے حسی، نااہلی، ناقص نظام اور انسانیت سوز سلوک کی وجہ سے ہی لوگ پرائیویٹ اسپتالوں کا رخ کرتے ہیں۔ اگر سرکاری اسپتالوں میں بھی پیسے دے کر ہی علاج کرانا ہے، تو پھر مریض پہلے ہی پرائیویٹ اسپتال کیوں نہ چلا جائے؟ یوں وہ سرکاری اسپتال میں خواری سے تونج جائے گا۔

زچگی کا مسئلہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ تمام ڈاکٹر زبانی ہدایت کرتے ہیں کہ دیر نہیں کرنی۔ جیسے ہی درد شروع ہو، زچہ کو لے کر

قرآن کی تعلیم و تعلم کا مرتبہ

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ”تم میں وہ شخص سب سے بہتر ہے جو قرآن سیکھتا اور سکھاتا ہے۔“

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ قرآن پاک کا ماہر شخص معزز لکھنے والے اطاعت گزار فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص قرآن پاک اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اس پر تلاوت کرنا مشکل ہوتا ہے، تو اس کے لیے دہرا اجر ہے۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ اس شخص کی مثال جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور وہ اس کا حافظ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ”صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ تم قرآن کی تلاوت کرتے جاؤ اور جنت کے درجات میں بلند ہوتے جاؤ اور اس طرح آہستہ آہستہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے جاؤ جیسے آہستہ آہستہ دنیا میں کام کرتے تھے۔ تمہارا مقام وہ ہے جہاں تم اپنی آخری آیت کی تلاوت کرو گے۔“

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: قرآن پڑھا کرو کیونکہ قرآن روز قیامت ان لوگوں کی سفارش کرے گا جو اس کی تلاوت کرتے رہے۔“ (عظمت شیخ)

وہ سرکاری اسپتالوں میں علاج ٹھیک طور پر نہیں کرتے جیسے اپنے پرائیویٹ اسپتال میں مریضوں کو توجہ دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، سرکاری اسپتالوں میں ملازم ڈاکٹروں اور ڈاکٹریوں پر پابندی لگا دینی چاہیے کہ وہ پرائیویٹ اسپتال میں کام نہیں کریں بھی وہ سرکاری اسپتالوں میں اپنی خدمات بجا طور پر ادا کر سکیں گے۔ ورنہ پھر سرکاری نوکری چھوڑ کر مکمل طور پر پرائیویٹ کام کریں۔ اگر اس سسٹم کو ہنگامی بنیادوں پر درست نہ کیا گیا، تو اسپتالوں میں سرگرم مافیالوگوں کو بدستور موت کے منہ میں دھکیلتا رہے گا۔

فوراً اسپتال پہنچیں، مگر اسپتال پہنچ کر تین گھنٹے اپنی باری کے انتظار کے لیے قطار میں کھڑا ہونا پڑے، تو میرے خیال میں کیس اتنا پیچیدہ تو ہو جاتا ہوگا کہ آپریشن کا مرحلہ آجائے۔ یہی وجہ ہے، زچگی کے دوران اکثر ماں یا بچے، کسی ایک کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کا ذمہ دار وہ عملہ بھی ہے جس نے باری کے انتظار میں انہیں تین چار گھنٹے ایمر جنسی کے باہر کھڑے کیے رکھا اور خود موبائل فون پر مصروف رہیں۔

ہمارے ملک میں مختلف قسم کے اسپیشل سنٹر بنائے گئے ہیں تو کیا تمام سرکاری اسپتالوں میں الگ سے زچگی کا ڈیپارٹمنٹ نہیں بنایا جاسکتا جہاں مریضوں کو باری کا انتظار کرنے کے لیے اذیت ناک مراحل سے نہ گزرنا پڑے۔ اور وہاں ڈاکٹریوں میں کوئی تجربہ کار بھی ہونی چاہیے۔ طالبات جو باؤس جاب کے سلسلے میں ڈیوٹی پر ہوتی ہیں وہ ان پیچیدگیوں کو صحیح انداز سے نہیں پرکھ پاتیں۔ لہذا تجربہ کار ڈاکٹری کی موجودگی میں طالبات کو بھی سیکھنے کا موقع ملے گا اور مریضوں کی بھی بہتر طریقے سے دیکھ بھال ہو سکے گی۔

اس کے علاوہ لیبر روم میں بستروں کی تعداد اس قدر تو ضرور ہونی چاہیے کہ رچاؤں کو اپنی باری کا انتظار کرنے کے لیے برآمدوں میں چکر نہ لگانے پڑیں۔ مزید برآں یہ ضروری ہے کہ کمرے کے باہر کھڑے مریضوں کے لیے بچوں کا بندوبست کیا جائے کیونکہ ایسی حالت میں ان کے لیے کھڑے رہنا بہت بڑی مصیبت بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ خدارا ایمر جنسی وارڈ سے پرچی سسٹم کا خاتمہ کریں۔ دروازے پر کھڑی آیا سودو سو روپے کے چکر میں ایک عورت کو موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے۔ کیا ان کی تنخواہیں اتنی کم ہیں کہ وہ مریضوں سے بھتہ لیتی ہیں؟ اگر آیاؤں اور نرسوں کا بھتہ لینا اسی طرح جاری رہا، تو کل کو یہ اسپتالوں کا قانون بن جائے گا کہ پہلے پیسے دو اور پھر اندر جاؤ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ گورنمنٹ اسپتالوں میں بیٹھے ڈاکٹر مریضوں کو اپنے نجی اسپتال یا کلینک پر آنے کا کہتے ہیں۔ نیز



شامی، عراقی اور افغانی پناہ گزین یورپ کے دروازے پر!

لاکھوں تارکین وطن کی آمد نے یورپی ممالک
میں ہلچل مچادی..... خصوصی رپورٹ

سید عاصم محمود

ان تارکین وطن میں ”۹۰ فی صد“ مسلمان ہیں جن کا تعلق شام،
افغانستان، فلسطین، عراق، صومالیہ، یمن، لیبیا، برما، فلپائن،
پاکستان اور دیگر ایسے اسلامی ممالک سے ہے جہاں طویل عرصے
سے جنگیں یا خانہ جنگی جاری ہے۔

اقوام متحدہ کی تازہ رپورٹ کے مطابق دنیا میں پناہ گزینوں
کی تعداد دس کروڑ سے زائد ہے۔ سب سے زیادہ پناہ گزین ترکی
میں مقیم ہیں جن کی تعداد پچیس لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔
ان پناہ گزینوں کی اکثریت شامی یا عراقی ہے۔

دوسرے نمبر پر پاکستان آتا ہے۔ پاکستان میں تقریباً
پچیس لاکھ افغان پناہ گزین زندگی
گزار رہے ہیں۔ ان کی تعداد گھٹتی

فرانسیسی کہاوت ہے: ”کوئی انسان اپنا گھر نہیں
ایک چھوڑتا تاہیں کہ وہ شارک کا منہ بن جائے۔“ یہ مثل
ان بے شمار مصائب اور مشکلات کو بخوبی عیاں کرتی
ہے جن کی وجہ سے ہر سال ہزاروں لاکھوں لوگ اپنا وطن چھوڑ
کر پناہ گزین (Refugee) بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ (یاد
رہے، پناہ گزین اور مہاجر میں فرق ہے۔ مہاجر وہ انسان ہے جو
عموماً اپنی مرضی سے ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کر جائے)

پچھلے ایک دو برس سے پناہ
گزینوں کا سیلاب یورپی ممالک
کی سمت رواں دواں ہے۔ مورخین
کے مطابق جنگ عظیم دوم کے بعد
پہلی بار یورپ میں اتنے وسیع پیمانے پر
پناہ گزینوں کی نقل و حرکت دیکھنے میں آئی ہے۔

بڑی تکلیف دہ اور دردناک حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس سال کے آغاز میں جب ہزار ہا شامی پناہ گزینوں نے یورپ کا رخ کیا، تو پورے براعظم میں ہلچل مچ گئی۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اسمگلروں کو بھاری رقم دیتے، جو انھیں بذریعہ کشتی ترکی کے ساحل سے یونانی جزائر تک پہنچا دیتے۔ یونان پہنچ کے شامی پناہ گزین یورپ کے دیگر ممالک کی سمت پیدل یا بسوں پر سفر شروع کر دیتے۔

مشکلات کا انبار

ان شامی، عراقی اور افغانی پناہ گزینوں کو قدم قدم پر بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اول انھیں قابل اعتماد اسمگلروں کو ڈھونڈنا پڑتا۔ پھر کشتی کا جان جو کھم والا سفر درپیش ہوتا جو عموماً رات کے اندھیرے میں کیا جاتا۔ پچھلے ایک برس میں گنجائش سے زیادہ پناہ گزین بٹھانے پر کئی کشتیاں حتیٰ کہ بحری جہاز سمندروں میں ڈوب چکے۔ ان حادثوں میں ہزاروں انسان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب بھی کشتی ڈوبنے کی خبریں وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں۔

جو خوش قسمت پناہ گزین کسی یورپی ملک پہنچ جائیں، تو وہاں انھیں نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پچھلے دو عشروں سے بعض یورپی ممالک خصوصاً مسلمان پناہ گزینوں کو لینے سے گھبرانے لگے ہیں۔ ان ممالک کی حکومتوں کا خیال ہے کہ مسلمان اسلامی تہذیب، ثقافت اور اقدار وہاں رائج کرنا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے، سربیا، ہنگری، سلواکیہ، برطانیہ وغیرہ کی حکومتوں نے مسلم پناہ گزینوں کی آمد پر بہت ناک بھنوں چڑھائی۔ سلواکیہ حکومت نے اعلان کیا کہ وہ صرف عیسائی پناہ گزینوں کو ملک میں داخلہ دے گی۔ ادھر ہنگری کی حکومت سربیا کے ساتھ اپنی ۱۷۵ میل لمبی سرحد پر خاردار تاریں لگانے لگی تاکہ پناہ گزینوں کا راستہ روک سکے۔

دراصل تقریباً تمام پناہ گزین امیر یورپی ممالک مثلاً جرمنی، آسٹریا، فرانس، ہالینڈ وغیرہ جانا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ مقدونیہ

بڑھتی رہتی ہے۔ جب بھی افغانستان میں حالات کچھ معمول پر آئیں، تو بہت سے افغان اپنے وطن پلٹ جاتے ہیں۔ لیکن جوں ہی خانہ جنگی کی شدت بڑھے، وہ پھر پاکستان آ جاتے ہیں۔ افغان پناہ گزینوں کی بڑی تعداد ایران، متحدہ عرب امارات، جرمنی وغیرہ میں بھی مقیم ہے۔

شامیوں کی خراب حالت

پناہ گزینوں میں سب سے زیادہ شامیوں کے حالات خراب ہیں۔ اس وقت غریب ہو یا امیر، ہر شامی اپنے ملک سے نکلنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ یہ شامی کسی بھی یورپی ملک تک پہنچنے کے لیے اسمگلروں کو ہزاروں ڈالر پر مشتمل اپنی جمع پونجی دے رہے ہیں۔ چنانچہ یورپ میں انسانوں کی اسمگلنگ بڑا منافع بخش کاروبار بن چکا۔ اس کی مالیت ڈیڑھ ارب ڈالر (تقریباً ایک سو ارب روپے) بتائی جاتی ہے۔

فی الوقت چالیس سے پچاس لاکھ شامی پناہ گزین ترکی، اردن اور لبنان میں مقیم ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ بے روزگار ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی جمع پونجی ختم ہو رہی ہے۔ مزید برآں ترک، لبنانی اور اردنی ان پناہ گزینوں کو معاشی بوجھ اور اپنے لیے مسئلہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے ایک برس میں شامیوں کو یہ جان لیوا احساس ہوا کہ ترکی یا اردن میں ان کا کوئی مستقبل نہیں اور وہ واپس شام بھی نہیں جاسکتے، تو وہ یورپ جانے کی سرتوڑ کوششیں کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انھوں نے اپنی اور اپنے پیاروں کی جانیں تک داؤ پہ لگا دیں۔ فی الوقت شام کے ۲۵ فی صد علاقے پر بشار الاسد کی حکومت ہے۔ ۵۰ فی صد علاقے پر داعش کا قبضہ ہے۔ جبکہ بقیہ جنگجو تنظیمیں ۲۵ فی صد حصے پر قابض ہیں۔ ان تنظیموں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچتی ہے۔ بد قسمتی سے شامی خانہ جنگی کے یہ سبھی فریق آپس میں دست و گریباں ہیں۔

پچھلے چار برس میں اس خانہ جنگی نے شام کا سارا معاشرتی ڈھانچا اور حکومتی انفراسٹرکچر تباہ کر ڈالا۔ شہر ہو یا دیہات، شامیوں کو ضروریات زندگی بمشکل میسر آ پاتی ہیں۔ اسی لیے وہ

اور ہنگری کے راستے بالائی یورپی ملکوں کی طرف جانے لگے۔ وہ خوشحال زندگی پانے کے لیے تمام رکاوٹیں عبور کرنا چاہتے تھے۔

مسلمان پناہ گزینوں کی آمد پر قدامت پسند اور قوم پرست یورپی سیاسی جماعتوں نے ذہائی مچا دی۔ وہ اپنی حکومتوں سے مطالبہ کرنے لگیں کہ مغربی (عیسائی) تہذیب کو محفوظ کرنے کے لیے پناہ گزینوں کا داخلہ روکا جائے۔ ہنگری اور آسٹریا میں قوم پرستوں کی حکومت ہے، اسی لیے وہ پناہ گزینوں کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ بعض مقامات پر حالات کے ستائے مسلمانوں سے جانوروں جیسا سلوک کیا گیا۔ اس غیر انسانی طرز عمل پر انسانی حقوق کی تنظیموں نے قوم پرست حکومتوں پر سخت تنقید کی۔ یورپی حکومتوں اور مسلم پناہ گزینوں کے مابین نسل جاری تھی کہ ۲ ستمبر ۲۰۱۵ء کو ایلان کردی کی موت کا جاں نسل ماجرا پیش آگیا۔

انسانیت جاگ اٹھی

تین سالہ ایلان کردی ترکی اور شام کی سرحد پر واقع قصبے، کوبانی کا رہائشی تھا۔ جب کوبانی پر داعش کا حملہ ہوا، تو اس کے والدین ترکی ہجرت کر گئے اور وہاں تین سال مقیم رہے۔ جنوری ۲۰۱۵ء میں وہ وطن واپس پہنچ گئے۔ لیکن جلد ہی داعش نے پھر کوبانی پر دھاوا بول دیا۔ چنانچہ مجبوراً عبداللہ کردی اپنی بیگم، ریحانہ اور دونوں بیٹوں، ایلان اور غالب کے ساتھ پھر ترکی پہنچ گیا۔ ترک ساحلی شہر، بورڈم سے ۲ ستمبر کی صبح یہ خاندان ربر کی چھوٹی سی کشتی پر سوار ہوا تا کہ یونانی جزیرے، کوس جاسکے۔ لیکن راستے میں کشتی زیادہ مسافر ہونے کے باعث ڈوب گئی۔ بے چارہ باپ اپنے بچوں اور بیوی کو نہیں بچا سکا۔ ایلان اور غالب کی لائیں تیرتے ہوئے بورڈم کے ساحل سے جا لگیں۔

ایک ترک فوٹو گرافر، نیلو فر دیر نے معصوم ایلان کی اس عالم میں تصاویر اتاریں کہ وہ ساحل پر اوندھا پڑا تھا۔ ۳۰ ستمبر کی صبح یہ تصاویر یورپ کے مشہور اخبارات نے پہلے صفحے پر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیں۔ انھوں نے معصوم بچے کی موت کو انسانیت کی بے حسی قرار دیا۔

یہ تصاویر اتنی رقت آمیز اور دل مسوس دینے والی تھیں کہ جو انھیں دیکھتا، اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے۔ یہ تصاویر حقیقتاً کا یا پلٹ دینے والی ثابت ہوئیں۔ انھیں دیکھ کر یورپی عوام کو احساس ہوا کہ اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر دردر کی ٹھوکریں کھانے والے پناہ گزین بہت تکالیف سے دوچار ہیں اور ان پر دکھوں کے پہاڑ ٹوٹے پڑے ہیں۔

یورپی عوام نے پھر اپنی حکومتوں پر زور دیا کہ وہ پناہ گزینوں کو آنے کی اجازت دے۔ یورپی حکومتیں اپنے عوام کی آرا پر بہت دھیان دیتی ہیں۔ چنانچہ عوام پناہ گزینوں کی آمد کے حامی ہوئے، تو بدلتی ہوا کارخ دیکھ کر بڑی یورپی طاقتوں نے بھی اپنی پالیسی بدل لی۔

ایک وقت تھا کہ برطانوی وزیراعظم، ڈیوڈ کیرون نے پناہ گزینوں کی آمد کو ”نڈی دل“ (Swarm) سے تشبیہ دی تھی، جیسے وہ معمولی کیڑے مکوڑے ہوں۔ مگر عوام کے بدلے تیور دیکھ کر اس نے اعلان کیا کہ وہ بیس ہزار شامی پناہ گزین برطانیہ میں بسانے کو تیار ہے۔

جرمنی سب سے آگے

پناہ گزینوں کے لیے سرحدیں کھول دینے میں جرمنی تمام یورپی ممالک میں بازی لے گیا۔ دراصل جرمن حکمران، انجیلا مرکل کی پیدائش مشرقی جرمنی میں ہوئی اور وہیں انھوں نے پرورش پائی۔ تب مشرقی جرمنی میں آمرانہ حکومت تھی۔ آمر حکمرانوں نے عوام کو ان گنت پابندیوں میں جکڑ رکھا تھا۔ حتیٰ کہ انھیں نقل و حرکت کی آزادی (Freedom of Movement) بھی حاصل نہ تھی۔ اسی لیے جرمن حکمران جانتی ہیں کہ پابندیوں میں جکڑے انسان کو کتنی اذیت ناک کیفیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

یہ عجب المیہ ہے کہ ۱۹۹۰ء میں سوویت یونین ٹوٹ گیا اور مشرقی یورپ کے ممالک روسی دائرہ اثر سے آزاد ہوئے، تو تب ”نقل و حرکت کی آزادی“ ہی سب سے بڑی نعمت تھی۔

اسی نعمت سے فائدہ اٹھا کر ہنگری، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی وغیرہ سے لاکھوں لوگ جرمنی، فرانس، ڈنمارک، سویڈن وغیرہ ہجرت کر گئے تھے۔

لیکن جب مسلمان شامی، عراقی اور افغانی پناہ گزینوں کا معاملہ آیا، تو ہنگری کی حکومت نے انھیں نقل و حرکت کی آزادی ہی سے محروم کر دیا۔ شاید یورپی حکمران تاریخ کا سبق بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ تاہم انجیلا مرکل کو استثنیٰ حاصل ہے۔ یہ جرمن حکمران کہتی ہیں:

”اگر یورپ پناہ گزینوں کا مسئلہ حل نہ کر سکا، تو شہریوں کے عالمی حقوق سے اس کی دیرینہ وابستگی کو نقصان پہنچے گا۔“

جرمنی میں فی الوقت شامی، افغان اور عراقی پناہ گزین جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں۔ حکومت ان کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کر رہی ہے۔ ان کو قیام و طعام کی مناسب سہولتیں حاصل ہیں۔ حتیٰ کہ حکومت ملازمت ڈھونڈنے میں بھی پناہ گزینوں کی مدد کر رہی ہے۔ تاہم جرمنی اور یورپ میں خصوصاً مسلمان پناہ گزینوں کے مخالفوں کی بھی کمی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں نئے معاشرے سے ہم آہنگ ہونے کے لیے کئی کٹھن مراحل طے کرنے ہوں گے۔ اس دوران انھیں معاشرتی و معاشی لحاظ سے کئی تکالیف برداشت کرنا ہوں گی۔

مسلمانوں کے مخالف

مسلم پناہ گزینوں کے مخالفین میں انتہا پسند عیسائی اور قوم پرست نمایاں ہیں۔ انھوں نے واویلہ مچا رکھا ہے کہ یہ مسلمان تارکین وطن پہلے یورپی شہروں میں اپنی آبادیاں بنائیں گے۔ پھر ان کی کوشش ہوگی کہ وہاں شریعت لاگو کر دی جائے۔ یوں مقامی آبادی سے ان کے تصادم کا خطرہ ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ مسلمان مقامی لوگوں کی ملازمتوں اور کاروبار پر قبضہ کر لیں گے۔

پناہ گزینوں کے مخالفین کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ جرمنی، فرانس اور سویڈن نے تارکین وطن کو سہولتیں و مراعات دیں، تو یہ تباہ کن فیصلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ یوں شام، عراق اور افغانستان

کیا آپ جانتے ہیں؟

انسانی جسم میں موجود چند عناصر کی مفید فیصد میں یہ ہے:

غضر	۶۵
آکسیجن	۱۸
کاربن	۱۰
ہائیڈروجن	۳
نائٹروجن	۱
فاسفورس	

(امیر حمزہ بن مشتاق احمد، وار برٹن)

کے لاکھوں پناہ گزینوں کو تحریک ملے گی کہ وہ مشکلات سے پر موجودہ زندگی چھوڑ کر یورپ چلے آئیں۔ اسی خطرے کے پیش نظر یورپی حکومتوں نے سرحدوں پر سیکورٹی فورسز کی تعداد بڑھادی تاکہ کوئی غیر قانونی طور پر یورپ میں داخل نہ ہو سکے۔

قوم پرست یورپی راہنما امیر عرب ممالک پر بھی تنقید کر رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ عرب ملک شامی و عراقی پناہ گزینوں کو اپنے ہاں بسانے کے لیے آمادہ نہیں۔ اگرچہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے پناہ گزینوں کے کیمپوں میں قیام و طعام کے اخراجات کی خاطر بھاری رقم بطور امداد ضرور دی۔

یورپ تاحال پناہ گزینوں کے معاملے پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ یورپی عوام کا ایک حصہ خاص طور پر مسلمان تارکین وطن کی آمد روکنا چاہتا ہے۔ جبکہ دوسرے حصے سے منسلک یورپیوں کا کہنا ہے کہ یہ پناہ گزین ہمدردی اور رحم کے مستحق ہیں۔ لہذا دل کھول کر ان کی مدد کرنی چاہیے۔ گویا یورپی عوام میں منفی اور مثبت جذبات و احساسات کی بیک وقت دو رو میں چل رہی ہیں۔

اب آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ لاکھوں مسلمان پناہ گزینوں کی آمد سے یورپ میں کس قسم کی معاشرتی و سیاسی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوں گی۔ اگر یورپیوں نے ان مسلمانوں سے تعصب برتا، تو یورپ میں نسلی و مذہبی تصادم بڑھ سکتا ہے۔

کیلاش کی طلسماتی وادی

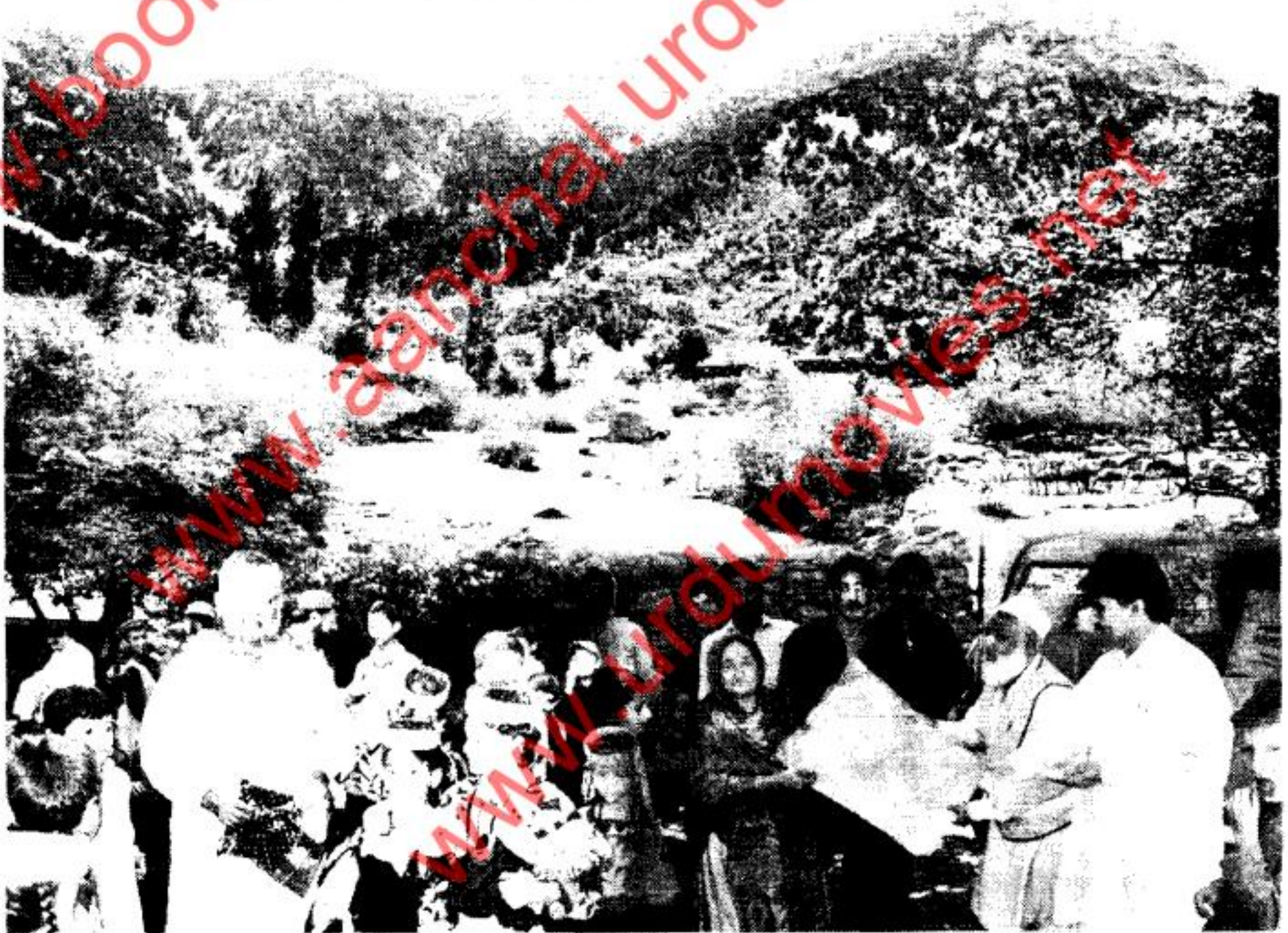
سردی محسوس ہو رہی ہے۔ فضاؤں میں سیب، ناشپاتی اور انگور کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وادی کیلاش میں آج ”اور چال“ کا تہوار منایا جا رہا ہے۔

بچے، بچیاں، لڑکے، لڑکیاں، بوڑھی خواتین اور نئے کپڑے پہنے خاص کر بچیاں اور نوجوان لڑکیاں بن سنور کر اور چہرے پر نقش و نگار بنائے میلے میں جا رہی ہیں۔ فارن ٹورسٹ ان (Foreign Tourist inn) کی بالکونی پر بیٹھے یہ سطرین رقم ہو رہی ہیں۔ عجب رومانی ماحول ہے۔ میلا شروع ہونے کو ہے۔ موج و مستی کا نظارہ ہے۔ ڈھول بجانا اس کی تھاپ پر رقص کرنا اور روایتی گیت گانا کیلاشیوں کی ثقافت ہے۔ ڈھول کے ساتھ گانے بجانے کی مستقل آوازیں بھی آرہی ہیں۔ میلا ساری رات جاری رہے گا۔ جب کیلاشی

سیلاب نے اس پُر فضا علاقے کو نشانہ بنایا تو لاہور کے معالجین ہم وطنوں کا دکھ درد بٹانے وہاں جا پہنچے

ڈاکٹر آصف محمود جاہ

رات کے سائے گہرے ہو رہے ہیں۔ تاروں بھری رات ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ چشموں اور دریاے بھنبھوریت سے پانی چلنے کی آوازیں مستقل آرہی ہیں۔ ٹھنڈک کا ماحول ہے۔ بلکی بلکی



تھک جائیں گے، تو گھروں کو لوٹیں گے۔

راگ و رنگ کے میلے کے باوجود وادی کیلاش جولائی اور اگست میں آنے والے سیلاب کی وجہ سے تباہی اور بربادی کا منظر پیش کر رہی تھی۔

جولائی اور اگست میں یہاں بھرپور جھوم ہوتا تھا، لیکن اب بچے کھچے ہوٹلوں میں کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ بڑے بڑے تمام ہوٹل اور ریسٹ ہاؤس دریا برد ہو گئے۔ بے نظیر ہوٹل کا اب نام و نشان باقی نہیں۔ پی ٹی ڈی سی کا خوبصورت موٹل بھی ویرانی اور بے بسی کی تصویر بنا نظر آ رہا تھا۔ علاقے کے مکین، اسرار احمد عرف زندگی نے مجھے بتایا کہ جولائی اور اگست کے سیلاب نے وادی کیلاش میں بہت زیادہ تباہی مچائی۔ چند دنوں کے وقفوں سے سات بار سیلاب آیا۔ پانی کا ریلہ اتنی تیزی کے ساتھ آیا کہ اس کی راہ میں جو بھی عمارت یا گھر آیا، وہ پل بھر میں دریا برد ہو گیا۔

اصل میں برف جب پگھلتی ہے، تو کلیشہ میں پھنسے بڑے بڑے پتھر بھی تیزی سے پانی کے ساتھ آتے اور تباہی اور بربادی کی داستانیں رقم کر جاتے ہیں۔ جولائی کے شروع میں جہاں دکانیں، مکانات، مساجد اور دوسری عمارتیں تھیں، وہاں اب پتھروں کا بسیرا ہے۔ پتھر بھی اتنے بڑے کہ گمان ہوتا ہے، انھیں کسی جن یا دیو نے اٹھا کر ادھر رکھ دیا۔ یقین ہی نہیں آتا کہ یہ پتھر پانی کے ساتھ آئے ہوں گے۔ یہ تو شکر ہوا کہ پانی آنے کی بروقت اطلاع مل گئی اور لوگوں نے اپنے گھر خالی کر دیے ورنہ مال و متاع کے ساتھ جانیں بھی جاتیں۔

صبح سویرے چترال سے وادی بھنبھوریت جانے کے لیے نکلے۔ ساتھیوں نے بہتیرا ڈرایا۔ منع کیا کہ راستہ بہت دشوار گزار ہے۔ چار پانچ گھنٹے پیدل چلنا پڑے گا۔ اسے جنگ اور خطرناک راستے ہیں کہ ذرا سی غفلت جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر طاہر اقبال بھی بار بار منع کر رہے تھے۔ مگر بھنبھوریت کے قاضی اسرار احمد کا اصرار تھا کہ سر آپ چلیں،

اللہ خیر کرے گا۔ سڑک ضرور ٹوٹی ہوئی ہے۔ راستہ خطرناک ہے، لیکن آفت زدہ لوگوں کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ طبی امداد اور ریلیف کے لیے آپ کے منتظر ہیں۔

ہمارے ساتھی عبدالرؤف نے چترال ہی سے راشن خرید کر محفوظ کروالیا۔ ادویہ، بچوں کے تحائف، ان کے کپڑے، چادریں، ترپالیں غرض ہر شے باندھ لی گئی۔ صبح سویرے آؤٹ لاج سے نکلے۔ چترال کی خوبصورت وادیوں سے گزرتے ہوئے بندہ بار بار قدرتی مناظر دیکھ کر مبہوت و مسحور ہو جاتا ہے۔ ایون ویلی کی جانب بڑھتے ہوئے محمود الحسن نے کہا کہ یہاں رک کر ترچ میر کی چوٹی کا نظارہ کرنا ہے۔ دور سے بادلوں میں چاندی کی طرح دکھتی ترچ میر کی خوبصورت چوٹی نظر آرہی تھی۔

۲۵ ہزار فٹ بلند ترچ میر کی چوٹی کے بارے میں کئی داستانیں مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ چوٹی آج تک کسی نے سر نہیں کی کیونکہ یہاں تک جو جائے وہ واپس نہیں آتا بلکہ پر یاں انھیں اپنے ساتھ لے کر فو چکر ہو جاتی ہیں۔ مشہور ہے کہ ترچ میر کی چوٹی تک جانے والوں کو پر یاں اپنے ساتھ لے جاتی ہیں، تو وہ وہاں اپنے مسکن میں نئے آنے والوں کو دودھ اور خون کا گلاس ایک ساتھ پیش کرتی ہیں۔ جو دودھ پی لے، وہ پر یوں کا ہو جاتا ہے اور جو خون کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، تو پر یاں اسے واپس چھوڑ جاتی ہیں۔

ایون بھی چترال کی ایک خوبصورت وادی ہے۔ چاروں طرف خوبصورت اور سرسبز پہاڑ ہیں اور درمیان میں فراٹے بھرتا اور پوری آب و تاب سے چٹا دریا۔ سیلاب کے دوران دریائے وادی ایون کی طرف بھی اپنا رخ کیا۔ بڑے بڑے پتھر سیلابی پانی کے ساتھ تیزی سے آئے اور دریا کے کنارے بننے لگی گھروں کو ملیا میٹ کر گئے۔ ایون پہنچ کر یہ طے پایا کہ آدھا سامان یہاں کے متاثرین کے سپرد کر باقی گدھوں پہ لاد کر بھنبھوریت لے جایا جائے۔ ڈاکٹر طاہر بھی وہیں ٹھہر گئے

تاکہ متاثرین میں سامان تقسیم کریں۔ علاج اور خدمت کا قافلہ خدمت اور علاج کے مشکل ترین طویل، جاں گسل اور پر خطر سفر پہ روانہ ہوا۔ لوگوں نے بہتیرا منع کیا۔ ڈرایا، لیکن جب بندہ عزم کر لے تو پھر راستے اور راہیں خود بخود آسان ہو جاتی ہیں۔

جیپ میں بیٹھ کر ایون سے روانہ ہوئے۔ تھوڑا سا سفر طے کیا تھا کہ فوج کی چیک پوسٹ آگئی۔ گاڑیوں سے اتر کر سامان اتارا کیونکہ یہاں سے آگے سامان لے جانے کا صدیوں پرانا ایک ہی ذریعہ ہے۔ یعنی گدھوں پہ سامان لاد کر لے جایا جائے۔ یہ گدھے سامان لے جانے کے لیے صحرائی جہاز کا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ چوپائے پہاڑوں میں اونچے نیچے راستوں سے آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ گدھوں کے مالک کا انتظار کرتے کرتے کافی دیر ہو گئی۔ گدھے آئے، اجرت طے ہوئی اور سامان لادے گدھوں کی لمبی قطار اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

گدھے چلانے والے کو چوان دس بارہ سال کے چھوٹے بچے ہیں۔ وہ اپنے کام میں اتنے ماہر ہیں کہ گدھے کے ساتھ کلاچیں بھرتے اونچے نیچے پہاڑوں کو باسانی پھلانگتے مقررہ وقت پر سامان منزل مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔

جنجھوڑیت وادی کیلاش کا سب سے خوبصورت اور دلکش خطہ ہے اور یہاں سال کے بارہ مہینوں میں دنیا بھر سے سیاحوں کی آمد ہوتی ہے۔ مگر سیلاب نے تمام راستے بند کر دیے۔ سڑکیں ختم ہو گئیں اور زندگی مفلوج ہو گئی۔ پاک فوج اور ایف ڈبلیو او کے بہادر اور جری جوانوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر پہاڑوں کو کاٹ کر سڑک کو کسی حد تک بحال کر دیا ہے، لیکن ابھی تک کام جاری ہے۔ کئی جگہ سے سڑک ٹوٹی اور بکھری ہوئی ہے۔ دروش چیک پوسٹ کے قریب ایف ڈبلیو او کی گاڑیاں، بلڈوزر، کرینیں سڑک صاف اور راستے کو دوبارہ بحال کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اسرار احمد نے مشورہ دیا کہ

دروش چیک پوسٹ تک پیدل چلتے ہیں۔ ہم یہاں تک گاڑی میں پہنچے تھے کہ دور سے سامان سے لدے پھندے گدھوں کی قطار نظر آگئی۔ اعظم کے بقول یہ گدھے ۵۰۰ سی سی اور ۱۰۰۰ سی سی والے ہیں۔ واقعی انہوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے کوچوانوں سمیت ثابت کر دیا کہ پہاڑوں اور کچے پکے راستوں پر ان کی رفتار گاڑیوں سے زیادہ ہے۔

وادی کیلاش میں آمد

فاران ٹورسٹ ہوٹل سے فجر کی نماز کے فوراً بعد نکلے۔ ابھی صبح کا اندھیرا باقی تھا۔ سورج پہاڑوں کی اوٹ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور چال میلے میں ڈھولوں کی تھاپ بھی مدھم ہو چکی تھی۔ ہوٹل سے نکل کر زندگی نے وادی کیلاش کی تباہ شدہ و برباد بستیوں کی داستان سنائی۔ جہاں رونقیں تھیں اور رقص و سرور کی محفلیں منعقد ہوتیں، سیاحوں کے قہقہے گونجتے تھے۔ کیلاشی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھنے کے لیے سیاح جوق در جوق آتے تھے مگر اب وہاں اداسی اور تباہی و بربادی تھی۔ جہاں گھر، مکانات، دکانیں، ہوٹل، موٹل گیسٹ ہاؤس مارلیٹ میوزیم تھے، وہاں اب ہر طرف پتھر ہی پتھر تھے۔ کیلاش وادی پتھر میں تبدیل ہو چکی ہے۔

پی ٹی ڈی سی موٹل کے بڑے چرچے سنے تھے، مگر اب وہ تباہی و بربادی کی تصویر بنا تھا۔ کیلاشی میوزیم بننے سے پہلے ہی تباہ و برباد ہو گیا۔ الیگزینڈریا ہوٹل میں غیر ملکی سیاح رہنا پسند کرتے تھے وہاں اب پتھر ہی پتھر تھے۔ اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ اس جگہ بھوتوں اور پتھروں کا بسیرا تھا۔ کیلاشی مست لوگ ہیں، تباہی اور بربادی کے باوجود موج و مستی کے کسی موقع کو جانے نہیں دیتے۔ آدھی رات سے لے کر صبح تک ڈھول کی تھاپ پر رقص اور پتا نہیں کیا کرتے رہے۔

راستے میں اکاڈ کا کیلاشی لڑکیاں تیزی سے بھاگتی دوڑتی اپنے اپنے گھر لوٹ رہی تھیں۔ واپسی کا سفر ہمیشہ آسان ہوتا

ہے۔ اب چلنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ زندگی کی کمٹری جاری تھی۔ کھیت گئے، کھلیان اور باغات بھی۔ آلو، چاول، گندم کی کھڑی فصلیں برباد ہو گئیں۔ اخروٹ کے بڑے بڑے قد آور درخت خس و خاشاک کی طرح گر کر رہ گئے۔ وادی کیلاش کا یہ سفر جہاں سیلاب متاثرین کی خدمت کے لیے کیا تھا، وہاں یہ بھی ارادہ بنایا کہ جو مساجد شہید ہوئی ہیں، ان کی از سر نو تعمیر کی جائے۔ زندگی نے پہلے سے انتظام کیا ہوا تھا۔

صبح سویرے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ مسجد اور مدرسہ سیلاب کی نذر ہو گئے تھے۔ اب وہاں دریائے بھنھوریت رواں دواں ہے۔ مکنی کی فصل کے کھیت کے مالک نے اپنی زمین مسجد کے لیے عطیہ دے دی تھی۔ مقامی لوگ آگئے۔ تھوڑی سی جگہ کھود کر مسجد کی بنیاد کے لیے پہلا پتھر رکھا اور ساتھ ہی اللہ کا شکر ادا کیا جس نے اتنی دور دراز آ کر خدمت اور علاج کرنے کے ساتھ مسجد بنوانے کی توفیق دی۔

ان شا اللہ وادی کیلاش میں یہ مسجد دین کا مرکز بنے گی۔ یہاں سے ہدایت کی ہوائیں چلیں گی۔ کافرستان کی فضاؤں میں اللہ اکبر کی صداؤں سے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آئے گا اور وہ اسلام کی دولت سے مالا مال ہوں گے۔ ابھی چلنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ اونچے نیچے کٹے پھٹے راستے تھے۔ پانی نے راستوں کو ختم کر چھوڑا تھا۔ زمین جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ ہر طرف چھوٹے بڑے ہزاروں کی تعداد میں پتھر تھے جو سیلابی پانی کے ساتھ آئے اور ہر چیز کو بہا لے گئے۔ زندگی کے گھر میں پر تکلف ناشا کا ہوا تھا۔ مکنی کی روٹی، مکھن، ملائی، انڈے مختصر یہ کہ ناشتے کا مزا آ گیا۔ زندگی کے والد الف بیگ بتانے لگے کہ ہم صدیوں سے اس علاقے میں مقیم ہیں اور آنے جانے والے مسافروں اور سیاحوں کی بھرپور خدمت کرتے ہیں۔

اسرار احمد عرف زندگی کے والد نے بتایا کہ آج سے تیس

چالیس سال پہلے جب یہاں کوئی ہوٹل تھا نہ گیسٹ ہاؤس، تو آنے والے سیاح ان کے ہاں ٹھہرتے۔ آرام کرتے، ناشتا اور کھانا کھاتے۔ یہ سلسلہ زندگی نے جاری رکھا ہوا ہے۔ وہ مسلمانوں اور کیلاشیوں میں یکساں مقبول ہے۔ جہاں سے گزرتا ہے، مرد و خواتین اس کو جھک کر سلام کرتے ہیں۔ کیوں نہ کریں، وہ بھی صبح سے شام تک لوگوں کی خدمت میں مصروف رہتا ہے۔ راستے میں ”بی بی کا“ کے بارے میں بتایا کہ یہاں سو سال کی اماں اور ۱۱۵ سال کا بوڑھا غلام محمد رہتے ہیں۔ وہ بیمار ہیں، ان کی خدمت کریں۔ بابا کو السلام علیکم کہا، انھوں نے بڑی محبت سے جواب دیا۔ بابا اور بی بی کو چیک کیا، دوائیں دیں اور نقد رقم بھی۔ بابا کے بیٹے اختر نے اپنے مکان کی مرمت کے لیے مدد طلب کی۔ اس کو بھی کیش دیا۔ ”بی بی کا“ نے اپنے گھر لگے ہوئے سیبوں کا تحفہ پیش کیا۔ تازہ، رس بھرے سیب اتنے میٹھے اور زبردست تھے کہ کھا کر مزا آ گیا۔

راستے میں جارہے تھے کہ مولوی شیر جہاں اپنے خاندان کے ساتھ جاتا نظر آیا۔ زندگی نے بتایا کہ اس کا گھر تباہ ہو گیا ہے۔ اس کا سارا خاندان کھلے آسمان تلے بیٹھا ہے۔ شیر جہاں کو نقد رقم دی۔ وہ یہ نعمت غیر مترقبہ پا کر پھولے نہ سما یا۔ آسمان والے کی طرف دیکھ کر پہلے اس کا اور پھر ہمارا شکر یہ ادا کیا۔ چلتے چلتے سانس پھول گیا۔ ٹانگیں درد کرنے لگیں۔ زندگی نے ایک دفعہ پھر ہمارے لیے سواری کا بندوبست کیا۔ گدھے کی سواری پھر کرنا پڑی۔ یہ گدھا زیادہ تربیت یافتہ تھا۔ دوسرے اس پر کانٹھی تھی، اور وہ تجربے کا بھی ہو چکا تھا۔

خوبصورت وادیوں اور بلند پہاڑوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے خراماں خراماں آگے بڑھتے رہے۔ دوباش کی پولیس چیک پوسٹ پر کچھ ساکتی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ اسلم مروت بستر پر دراز تھے۔ پولیس کے اہلکار اور دوسرے لوگ ڈاکٹر آنے کا سن کر آگئے اور یوں یہاں ہمارا منی میڈیکل کیمپ شروع ہو گیا۔ چیک پوسٹ کا صوبیدار عبدالکبیر شاہ بڑا

مقامات کے دلچسپ نام

- ☆..... پاکستان کا دماغ کراچی کو کہتے ہیں۔
- ☆..... پاکستان کا شہرستان کوئٹہ کو کہتے ہیں۔
- ☆..... البیرونی نے پاکستان کے شہر ملتان کو قدیم ترین کہا تھا۔
- ☆..... کالونیوں کا شہر کراچی کہلاتا ہے۔
- ☆..... قبرستانوں اور اولیا کرام کا شہر ملتان کو کہتے ہیں۔
- ☆..... پاکستان کا مانچسٹر فیصل آباد کو کہتے ہیں۔
- ☆..... پاکستان کا برمنگھم سیالکوٹ کہلاتا ہے۔
- ☆..... انگریزوں نے مری کو ملکہ کوہسار کا نام دیا تھا۔ (محمد خلیل چودھری، دینہ ضلع جہلم)

یادگاری منار (Monament) بنا ہوا تھا۔ وہ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ یہاں سے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے نہر بنائی گئی تھی۔

زندگی کو راستے میں جاتی ہر عورت اور مرد سلام کر کے حال احوال پوچھ رہے تھے۔ راستے میں پھر کئی ہوئی سڑک آگئی۔ موٹر سائیکل سے اتر کر پیدل چلنا پڑا۔ مہیب، خطرناک، نوکیلے پہاڑوں کے درمیان اٹی گئی تنگ سڑک سے گزرنا بہت ہی خطرناک اور مشکل لگ رہا تھا۔ ایسے گمان ہوتا تھا کہ یہاں جلد ہی لینڈ سلائڈنگ شروع ہو جائے گی اور ہم پتھروں میں دب جائیں گے۔ ایف ڈبلیو او کے جری جوان کرینوں اور بلڈوزروں کی مدد سے نئی سڑک بنانے میں مصروف تھے۔ کھوڑی سی دیر پیدل چل کر کل والا ڈرائیور اور اس کی گاڑی نظر آئی، تو جان میں جان آئی۔ اللہ کا شکر ادا کیا جس نے زندگی کا مشکل ترین، جاں گسل اور پرخطر سفر کامیابی سے طے کرایا اور پھر آفت زدہ علاقے میں اپنے بندوں کی خدمت کرنے کی توفیق دی۔

دلچسپ کردار ہے۔ ۳۷ سال پولیس سروس میں گزار چکا۔ ترقی نہ ملنے پر نالاں اور شکایت کر رہا تھا کہ میری بیوی طعنے دیتی ہے، تمھاری پروموشن کیوں نہیں ہوئی؟ بابا گرم گرم قہوہ لے آیا جسے پی کر سفر کی تکان دور ہو گئی۔

ایف ڈبلیو او (FWO) کے بہادر اور جری جوان سڑک دوبارہ بنانے پر لگے ہوئے تھے۔ دو باش تک سڑک تقریباً بحال ہو چکی تھی۔ لیکن گاڑی کا راستہ آگے تک نہ تھا، اس لیے زندگی نے وہاں سے ایک موٹر سائیکل کا بندوبست کر دیا۔ دشوار گزار سڑک پر موٹر سائیکل کی سواری بڑی خطرناک تھی، لیکن زندگی کے دوست نے بڑی مہارت سے پہاڑوں کے بیچ میں چلائی۔ راستے میں منہ کھولے کھائیاں نظر آتی ہیں۔ سڑک جگہ جگہ سے کٹی پھٹی ہے۔ ذرا سی اغزش نیچے پہنچا سکتی ہے اور نیچے نوکیلے پتھر اور گہری کھائیاں ایسی ہیں کہ ہڈیاں بھی چکنا چور ہو جائیں۔ راستے میں زندگی نے ایک ایسے سنٹر کی جگہ دکھائی جسے ”باش لیننی“ کہتے ہیں۔ یہ سنٹر بھی دریا برد ہو چکا۔ اس کے ساتھ ایک اور بڑی عمارت لاکھوں روپے کی لاگت سے بنی تھی، وہ بھی سیلاب کی نذر ہو گئی۔

کیلاشی قوم کی اپنی ثقافت اور اپنی روایات ہیں۔ ”باش لیننی“ سنٹر میں لڑکیوں اور عورتوں کو ایام مہواری کے دوران بھیج دیا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں عورتیں اس دوران ناپاک ہو جاتی ہیں اور کسی کام کے قابل نہیں رہتیں۔ اگرچہ پاک اور ناپاکی کا تصور کیلاشو میں ہے ہی نہیں، حتیٰ کہ ان کی ثقافت میں نہانا بھی منع ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کو زوجگی کے دوران بھی یہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد چالیس دن تک وہاں رکھا جاتا ہے۔ اس اثنا میں انھیں کھانا بھیجا جاتا ہے۔ زندگی کو اپنے علاقے کے بارے میں حیرت انگیز معلومات حاصل ہیں۔ اس نے راستے میں ایک بہت بڑا پتھر دکھایا جسے ”لشٹ لوخت“ یعنی ہموار پتھر کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ۲۵۰ سال پہلے کا ایک لمبا سا پتھروں کا ایک

پاکستانی نوجوان کا درد بھرا خط

پاکستان چھوڑ کر غیر قانونی طور پر دیار غیر
جانے والے نوجوانوں کے لیے عبرت نامہ

خط ایک ایسے بد قسمت پاکستانی کا ہے جو روشن
مستقبل کی آس لیے وطن سے نکلا مگر انسانوں کی
یہ اسمگلنگ میں ملوث بین الاقوامی گروہ کے ہتھے چڑھ
گیا۔ گھر بار فروخت کر یورپ جانے کے لیے وہ ہاتھوں ہاتھ

بکتا ہوا غیر قانونی طور پر پہلے ایران پہنچا۔ وہاں سے چھپتے
چھپاتے خون جھادینے والی سردی میں ترکی کی سرحد عبور کرتے
ہوئے وہاں تعینات فوجیوں کی فائرنگ کی زد میں آ گیا۔ گروہ
میں شامل کچھ لوگ ترک فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے،
لیکن یہ کسی نہ کسی طرح استنبول شہر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔
وہاں یہ ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہوا کہ ایجنٹ اسے ایک
مکان میں بند کر کے خود نو چکر ہو گیا۔

وہ مکان میں دس دن قیدیوں کی طرح مقیم رہا۔ جب
بھوک پیاس نے تنگ کیا تو جیسے تیسے باہر نکلا۔ بد قسمتی سے



پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ ترک حکومت نے غیر قانونی سرحد عبور کرنے اور ہیروئن اسمگلنگ کرنے کا مقدمہ بنا کر چھ سال تین مہینے کے لیے اسے جیل بھیج دیا۔ روشن مستقبل کا خواب دیکھنے والے کتنے ہی پاکستانی اس وقت قیدی بن کر استنبول کی مالتیے جیل میں اذیت ناک زندگی گزار رہے ہیں۔ مالتیے جیل میں قید ایک پاکستانی کا درج ذیل خط ایسے تمام افراد کے لیے تنبیہ کا درجہ رکھتا ہے جو غیر قانونی طریقوں سے دوسرے ملکوں میں جانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی تو برباد کرتے ہی ہیں، ماں باپ اور بہن بھائیوں کو بھی خون کے آنسو رلاتے اور ملک کی بدنامی کا باعث بھی بنتے ہیں۔

☆☆

”میرا نام مروت خان آفریدی ہے۔ باڑہ، خیبر ایجنسی کا رہنے والا ہوں۔ مجھے یورپ جانے کا بے حد شوق تھا۔ ایک دوست مجھے ایک ایجنٹ کے پاس لے گیا جو لوگوں سے رقم لے کر غیر قانونی طریقے سے بحفاظت یورپ پہنچانے کا وعدہ کرتا تھا۔ اس سے ملنے کے بعد میرے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ میں بھی اپنی زندگی خوشحال بنانے کے لیے یورپ جاؤں اور وہاں محنت مزدوری کر کے ڈھیر ساری دولت کماؤں۔“

ایجنٹ نے جو پیسے مانگے وہ میں نے عزیز واقارب سے لے کر دے دیے۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر پشاور سے کوئٹہ پہنچا۔ پھر تفتان کے راستے ایرانی شہر، تہران پہنچے۔ پھر چھپتے چھپاتے ترکی کی سرحد پر پہنچے، رات کا وقت تھا۔ سخت سردی کے عالم میں برفباری ہو رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیتا۔ چلتے چلتے ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں ہمیں ترک فوجیوں نے دیکھ لیا۔ انھوں نے ہم پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ہمارے کچھ ساتھی ترک فوجیوں نے پکڑ لیے لیکن ہم وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہم پھر ایک پہاڑی غار میں چھپ گئے۔ چند دن وہاں بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔ ایک طرف سخت سردی اور برفانی

ہوائیں ہمارے جسم کو چیر رہی تھیں، تو دوسری جانب بھوک نے بے حال کر رکھا تھا۔ ہم اس قدر لاغر ہو چکے تھے کہ چند قدم چلنا بھی محال نظر آتا تھا۔ اس پر پکڑے جانے کا خوف الگ ہمیں پریشان کر رہا تھا، لیکن ایجنٹ بچتے بچاتے وہاں سے ہمیں لیے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر ہم ایک گاڑی کے ذریعے استنبول شہر پہنچے۔

ایجنٹ نے وہاں ایک مکان کرائے پر لیا اور ہم سب کو اس میں نظر بند کر دیا۔ ہم گیارہ لوگ یورپ جانے کے خواہش مند تھے۔ ہمیں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ بھوک کے مارے ہم سب کا برا حال تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہم کیا کریں؟ کبھی یہ احساس ہوتا، شاید ایجنٹ نے ہمیں یہاں بھوکا مارنے کے لیے بند کر دیا ہے اور خود پیسے لے کر روفو چکر ہو گیا۔ پکڑے جانے اور بھوک سے مرنے کا خوف ہمیں زندہ درگور کر رہا تھا۔ حالات سے تنگ آ کر ہم دو دوستوں نے سوچا کہ بھوک سے مرنے سے بہتر ہے، باہر نکل کر کھانا تلاش کیا جائے۔

کچھ رقم ہمارے پاس موجود تھی۔ میں اور ایک افغانی لڑکا جس کا نام احسن اللہ تھا، بیچ بچا کر بازار پہنچے۔ وہاں سے روٹیاں اور سالن خرید کر جب واپس آ رہے تھے کہ راستے میں پولیس نے ہمیں روک کر تلاشی لی۔ ہمارے پاس سوائے سالن اور روٹیوں کے کچھ نہ نکلا۔ پھر انھوں نے ہم سے پاسپورٹ مانگا۔ ہم نے کہا کہ ہمارے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔ پولیس نے پوچھا کہ تم کہاں رہتے ہو؟ ہم نے اشاروں سے بتایا کہ فلاں جگہ رہتے ہیں۔ پولیس والے ہمیں اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہمارے وہ ساتھی جو مکان کے اندر موجود تھے، پولیس کو دیکھ کر پھلے راستے سے بھاگ گئے۔ کھڑکی توڑ کر جب پولیس مکان کے اندر داخل ہوئی تو سب لوگ فرار ہو چکے تھے۔ پولیس والے ہمیں باہر کھڑا کر کے خود مکان کی تلاشی لینے لگے۔ جب

فارغ ہو چکے، تو ہم دونوں کو لے کر تھانے آ گئے۔

پھر پولیس والے ہم سے پوچھ گچھ کرنے لگے کہ آپ کے پاس پاسپورٹ کیوں نہیں؟ آپ یہاں کیوں آئے، کس راستے سے یہاں پہنچے اور ترکی آنے کا مقصد کیا ہے؟ میں نے سچ سچ بتا دیا کہ ہم ایران کے راستے یہاں پہنچے اور ہم یورپ جانا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر ایک پولیس والا بولا کہ تم جس مکان میں رہتے ہو، وہاں سے ہمیں تین سو گرام ہیروئن ملی ہے۔

سپاہی کی یہ بات سن کر ہم حیران ہو گئے کیونکہ ہمارے پاس تو صرف روٹیاں اور سالن ہی تھا جو ہم بازار سے خرید کر لا رہے تھے۔ ہیروئن کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کس کے پاس تھی اور کہاں سے آئی؟ ہم جس گھر میں ٹھہرے، وہاں ہمارے علاوہ آٹھ لوگ مقیم تھے۔ پولیس والوں نے انھیں خود بھاگتے ہوئے دیکھا۔

لیکن ترک سپاہیوں نے ہماری کسی بات پر استہانہ کیا اور پوچھ گچھ کے بعد ہمیں عدالت میں پیش کر دیا۔ جج کہنے لگا کہ تم لوگ ہیروئن کا کام کرتے ہو۔ تم لوگوں کے گھر سے پولیس نے منشیات برآمد کی ہے۔ تم اس بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟ ہم نے ترجمان کے ذریعے بتایا کہ جج صاحب، ہم تو یورپ جانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ دس ملکوں کے اور بھی آدمی رہتے تھے جو ایجنٹ لے کر آیا تھا۔ باقی لوگ پولیس کو دیکھ کر بھاگ گئے۔ ہو سکتا ہے ہیروئن ان میں سے کسی کے پاس ہو۔

پولیس والوں سے مخاطب ہو کر جج صاحب نے کہا کہ اگلی تاریخ پر مزید ثبوت لے کر آئیں۔ عدالت برخاست ہونے کے بعد پولیس نے ہمیں دوبارہ جیل پہنچا دیا۔ چار ماہ بعد جب پولیس ہمیں لیے عدالت پہنچی تو وہ ترجمان جو ہماری بات سن کر جج کو بتاتا تھا، وہ موجود نہیں تھا۔ چنانچہ مزید چار ماہ آگے کی تاریخ دے کر ہمیں پھر جیل بھجوا دیا گیا۔ تیسری بار عدالت پہنچے تو جج نے پولیس والوں سے مزید ثبوت طلب کیے۔ پولیس والوں نے حلفاً یہ بیان دیا کہ جس

گھر سے ہیروئن برآمد ہوئی، وہاں یہ دونوں ہی رہتے تھے۔ انھوں نے ہی وہ گھر کرائے پر لے رکھا تھا۔

جج نے یہ کہتے ہوئے عدالت برخاست کر دی کہ اگلی پیشی پر مالک مکان کو بھی پیش کیا جائے۔ اگلی پیشی پر مکان کا مالک خود تو عدالت میں نہ آیا، لیکن اس نے ایک خط بھجوا دیا جس میں لکھا تھا کہ میں ان دونوں کو نہیں جانتا۔ میں نے تو یہ گھر کسی اور کو کرائے پر دیا تھا۔ مالک مکان کا بیان ہمارے حق میں تھا۔ ہم نے عدالت کو بتایا کہ نہ تو ہمیں ترکی زبان آتی ہے اور نہ ہی ہم نے یہ مکان کرائے پر لیا۔ پھر یہاں کا قانون ہے کہ بغیر پاسپورٹ کے کسی کو مکان کرائے پر نہیں مل سکتا۔ جبکہ ہم پاسپورٹ ہی نہیں رکھتے۔ پاسپورٹ کے بغیر ہم کیسے مکان کرائے پر لے سکتے ہیں جس کی تصدیق مالک مکان اپنے خط میں کر چکا ہے۔ ہماری بات سننے کے بعد جج نے ہمیں چالیس دن بعد پیش ہونے کا حکم دیا۔

اگلی تاریخ پر جج نے پولیس والوں کو الگ الگ اپنے چیمبر میں بلا کر سوال و جواب کیے۔ سپاہیوں کے جواب ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ پولیس والے جھوٹ بول رہے۔ جج نے پولیس والوں پر لعنت ملامت کرنے کے باوجود ہمیں چھ سال تین ماہ کی سزا سناتے ہوئے کہا کہ اگر تمہیں میرے فیصلے پر اعتراض ہو تو آپ سپریم کورٹ میں اپیل کر سکتے ہیں۔

دس ماہ بعد سپریم کورٹ میں ہماری اپیل کی سماعت شروع ہوئی تو وہاں وہی کچھ پیش آیا جس سے پہلی عدالت میں ہمارا سابقہ پڑا تھا، صرف جج ہی بدل گیا۔ ہمیں دیکھ کر سپریم کورٹ کا جج بولا، اچھا تو تم لوگ ہو جنھوں نے سزا پر اعتراض کیا۔ ہمیں امید تھی کہ بڑا جج ہماری باتیں سن کر ہمیں انصاف فراہم کرے گا لیکن یہ ہمارا وہم نکلا۔ جج صاحب نے ہمارا کیس پڑھنے کے لیے اگلے دو ماہ کی تاریخ دے دی۔ دو ماہ بعد جب دوبارہ سماعت شروع ہوئی تو ہمارے وکیل نے جس طرح سہمہ انداز میں بولنا

شروع کیا اسی سے اندازہ ہو گیا کہ یہ سب لوگ آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ہمیں اور دوسروں کو یہ دکھانے کی خاطر بیوقوف بنایا جا رہا ہے کہ ترک عدلیہ انصاف کے تقاضے پورے کرتی ہے۔

ہم نے ترجمان کے ذریعے جج صاحب کو بتایا کہ مکان کے باہر کیمرا لگا ہوا تھا۔ اگر ہماری بات پر یقین نہیں آتا، تو اس کیمرے کی ریکارڈنگ منگوا کر دیکھ لی جائے کہ پولیس آنے پر کتنے لوگ اس مکان سے نکل کر فرار ہوئے ہیں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ ہم نے مزید کہا کہ جب مالک مکان نے اقرار کیا ہے کہ وہ ہمیں نہیں جانتا اور نہ ہی اس نے ہمیں اپنا مکان کرائے پر دیا، تو پھر ہمیں کیوں مجرم ٹھہرایا جا رہا ہے؟ ہمارے دلائل سننے کے بعد جج نے مزید چار ماہ کی تاریخ دے دی جو پندرہ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو آئے گی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس دن ہمارا کیا بنے گا۔

ہم ترک جیل میں یکم فروری ۲۰۱۳ء سے قید ہیں۔ اسی طرح ہمیں قید ہوئے ۳۲ ماہ ہو چلے ہیں۔ اس دوران پاکستانی سفارت خانے کے عملے نے ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ تین برس میں صرف دو مرتبہ پاکستانی سفارت خانے کا ایک ملازم جیل میں آیا۔ وہ کاغذ پر ہمارا نام لکھ کر واپس چلا گیا۔ اگر ہم اپنے سفارت خانے والوں کو کوئی خط لکھتے ہیں تو تین چار ماہ تک جواب ہی نہیں ملتا۔

ہم جس جیل میں قید ہیں وہ ۶۳ بارکوں پر مشتمل ہے۔ ہر بارک کی تعمیر پانچ مرلہ زمین پر ہوئی ہے۔ دو مرلے کا حن ہے اور تین مرلے پر اوپر نیچے سات کمرے بنے ہوئے ہیں۔ انہی میں بیت الخلا اور غسل خانے واقع ہیں۔ ایک بارک میں ۲۸ لوگوں کو رکھا جاتا ہے۔ ہر کمرہ آٹھ مربع فٹ کا رقبہ رکھتا ہے۔ اس میں دو چار پائیاں اوپر نیچے لگائی گئی ہیں۔ اس تنگ اور تاریک جگہ میں سانس لینا بھی مشکل ہے۔ مہینے میں ایک بار ڈاکٹر قیدیوں کا معائنہ کرتا ہے۔ اس دوران اگر کوئی قیدی بیمار ہو جائے، تو اسے طبی سہولتیں میسر نہیں ہوتیں۔

ٹیلی فون کرنے کی سہولت انتہائی محدود ہے۔ ہفتے میں ایک

بار چار پانچ منٹ کے لیے فون پر بات کرنے کی اجازت ہے۔ اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کے لیے قیدی کو خود ادائیگی کرنا پڑتی ہے۔ ایک ٹیلی فونی کارڈ چار پانچ سو روپے مالیت کا ہے۔ لیکن ابھی بات شروع ہوتی ہے کہ دانستہ لائن کاٹ دی جاتی ہے۔

قیدیوں کی بارک میں بجلی کا بل بھی ہمیں خود ادا کرنا پڑتا ہے۔ جس قیدی کے پاس پیسے نہ ہوں، اسے مجبور ہو کر دوسروں کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جنہیں انجام دینا انسانی ضمیر گوارا نہیں کرتا۔ جیل میں دو وقت کا کھانا ملتا ہے۔ وہ اس قدر بد ذائقہ ہوتا ہے کہ اسے دیکھ کر بھوک مر جاتی ہے۔ جیل میں پانی بھی خرید کر پینا پڑتا ہے۔ کیونکہ ٹل سے انتہائی بدبو دار پانی آتا ہے۔ جس میں سے پاخانے کی بو بھی آتی ہے۔ اگر مجھ سے کوئی یہ پوچھے کہ دنیا کی جاہل اور بیوقوف قوم

کون سی ہے تو میں میرا جواب ہوگا ترک قوم ہے۔ کیونکہ ترکی میں ہر وہ بات جائز ہے جو اسلام میں ناجائز ہے۔ اسلامی شعار اور حدود کی پاسداری کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ صرف نام کے مسلمان ہیں۔ ان کا چلن انسانوں کو تکلیف دینا، جھوٹ بولنا اور اپنی من مانی کرنا ہے۔ ترک حکومت کو اقوام متحدہ کی جانب سے ایک قیدی کے عوض پچاس ڈالر ملتے ہیں۔ یہ ڈالر حاصل کرنے کے لیے ترکی کی عدالتیں لمبی تاریخیں دے کر ہم جیسے بے گناہ اور لاوارث قیدیوں کو جیل میں بند رکھتی ہیں تاکہ انھیں اقوام متحدہ سے ڈالر ملتے رہیں۔

میں ان پاکستانی نوجوانوں کے لیے عبرت ناک مثال ہوں جو اپنا وطن چھوڑ کر یورپ جانے یا کسی اور ملک میں ناجائز طریقے سے پہنچ کر اپنا مستقبل روشن کرنے کا خواب دیکھتے ہیں۔ اپنا وطن پاکستان جیسا بھی ہے ساری دنیا سے اچھا ہے۔ اپنے وطن میں آزادی سے سانس لینا ہی سب سے بڑا انعام ہے۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے جتنا رزق انسان کے مقدر میں لکھ دیا ہے، وہ اسے کھائے بغیر نہیں مر سکتا۔



بیگم بھی اس نیک کام میں شوہر کا بھرپور
ساتھ دینا چاہتی تھیں۔ اور تو اور بہو،
بیٹا، پوتے اور پوتی بھی اس
کار خیر میں حصہ ڈالنے کے
لیے تیار تھے۔ سب
نے مل جل کر پیچھے کا
کمر صاف کر دیا۔

عزیز صاحب نے

ایک عدد میز اور چند کرسیاں رکھ لیں یوں کام کا آغاز ہو گیا۔
بیٹے عادل نے انھیں ایک موبائل خرید دیا۔ کہنے لگا ”ابا جان
باہر کی اچھی کمپنی کا ہے، وہ بھی کیمرے والا، اچھا لگانا آپ کو؟“
”تم نے بہت اعلیٰ کام کیا۔ بھی تصویر بھی تو لینی ہوگی۔ ظاہر
ہے آج کل لڑکا لڑکی تصویریں دیکھ کر ایک دوسرے کو پسند کرتے
ہیں۔“ عزیز صاحب نے خوش دلی کا اظہار کیا۔

☆☆

”ہیلو یہ عزیز صاحب کا گھر ہے جو رشتہ کراتے ہیں۔ ان کا
اشتہار اخبار میں چھپا ہے۔“ فون آنے شروع ہو گئے۔ یہ کسی
خاتون کا فون تھا۔

”جی جی آپ کون؟“ بیگم عزیز نے پوچھا۔

”مجھے اپنی بیٹی کے لیے رشتہ چاہیے۔“ خاتون نے کہا۔

”اچھا، اچھا، آپ ہمارے دفتر آجائیے۔ آپ کو ایک فارم

ملے گا۔ اسے بھر دیجیے۔ دفتر میں میرے شوہر ہوں گے۔ ان سے
بات کر لیں، وہ آپ کی بیٹی کو ضرور اچھا رشتہ دلوادیں گے۔“ بیگم

عزیز نے خاتون کو تسلی بخش جواب دیا۔

رفتہ رفتہ فون آنے لگے اور لوگ بھی جو فارم بھرنا چاہتے
تھے۔ کچھ دنوں تک معاملات صحیح چلتے رہے۔ عزیز صاحب دفتر

جہاں ہے رشتوں کی بھرمار

عزیز صاحب کا رشتہ ہاؤس

ایک ”ریٹائرڈ“ دادا کے انوکھے مشغلے کی دلچسپ روداد

لبنی فیصل

ہاں ہر عمر کے لڑکے، لڑکی کا رشتہ موجود

”ہمارے“ ہے۔ بس آپ فون اٹھائیے اور نیچے دیے
گئے نمبر پر ڈائل کیجیے۔ آپ کو مرضی کے
مطابق رشتہ ملے گا۔ فون نمبر.....“

”ہاں اب ٹھیک ہے، اب اسے اخبار میں دینا چاہیے۔“
عزیز صاحب نے اشتہار مکمل کیا اور بولے ”کیوں بیگم، میں نے
اشتہار صحیح لکھا ہے نا؟“

انھوں نے اپنی بیگم سے رائے لی۔ وہ تو پہلے ہی بہت خوش
تھیں کہ چلو انھیں کوئی تو کام ملا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد
سارا دن گھر میں فارغ بیٹھے رہتے۔ بس نماز پڑھنے یا سودا سلف
لینے گھر سے نکلتے۔ اب تھوڑی مصروفیت ہو جائے گی۔

”جی جی بہت اچھا اشتہار ہے۔ لیکن آپ کو ایک عدد دفتر بھی
درکار ہوگا۔ لیکن گھبرائیے نہیں، اس کا بھی بندوبست ہے۔ گھر کے
پیچھے جو کمرہ ہے، اسے رشتہ ہاؤس کا دفتر بنالیں۔“

میں فون سننے اور فارم بھی دیتے۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگ آئیں گے، انھیں اندازہ نہ تھا۔ صبح ہوتے ہی فون آنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور رات گئے تک جاری رہتا۔ کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے بیگم عزیز نے بھی موبائل خرید لیا۔ لیکن فون کالوں نے کم ہونے کا نام نہیں لیا۔

ابھی وہ کھانا کھانے بیٹھتیں کہ فون آ جاتا۔ فارغ ہو کر چند نوالے ہی لیتیں، تو پھر فون بج اٹھتا۔ آخر ان کالوں سے سبھی گھر والے پریشان رہنے لگے۔ ایک دن بیگم عزیز ٹی وی پر خبریں سننے بیٹھی ہی تھیں کہ فون بجنے لگا۔ وہ جھنجلا گئیں ”افوہ ہر وقت فون بجتا رہتا ہے۔“ انھوں نے موبائل بجنے دیا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ عادل اپنے کمرے سے باہر آیا اور بولا ”امی خیریت ہے، آپ کچھ غصے میں لگ رہی ہیں۔“

”ہاں بیٹا رشتے والوں کا تانتا جو بندھا ہوا ہے۔“ بیگم عزیز نے جواب دیا۔

”لگتا ہے آپ ابا جان کے کام سے گھبرا گئی ہیں۔“ بیٹے نے ہنسنے کہا۔

ایسا تو نہیں بس وقت بے وقت اس فون کی گھنٹی سے اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔“ انھوں نے بیٹے کو مطمئن کرنا چاہا۔

رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ جب فون بجتا، تو گھر میں سے کوئی بھی اٹھتا اور بات کر لیتا۔ بعض اوقات حد ہو جاتی۔ جب عزیز صاحب نماز پڑھنے جاتے اور فون آتا، تو ان کے پوتے یا پوتی اٹھاتے اور کہتے ”دادا گھر پر نہیں، آپ تھوڑی دیر بعد فون کر لیں۔“

ایک دن میاں بیوی لیے آرام کر رہے تھے کہ موبائل بج اٹھا۔ عزیز صاحب نے السلام علیکم کہا، تو دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”کسی بنگالی لڑکے کا رشتہ ہے؟“

عزیز صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دیں اور ایسا کوئی رشتہ تھا بھی نہیں۔ کہنے لگے ”آپ رکیے، بیگم سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔“

”بیگم بیگم“ عزیز صاحب نے زوجہ کو پکارا۔ انھوں نے

شوہر کی آواز سنی، تو آنکھیں فوراً بند کر لیں۔ انھیں سوتا دیکھ کر وہ گویا ہوئے ”بھئی میری بیگم قیلو لہ فرما رہی ہیں۔ لیکن رکیے میں اپنی بہو سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔“ عزیز صاحب نے فون کرنے والے کو ”ہولڈ“ کر دیا۔

”ایان، ایان!“ عزیز صاحب نے پوتے کو آواز دی۔ بہو یہ سمجھی کہ ابا جان کو کچھ چاہیے ہوگا جیسا کہ ایان کو بلا رہے ہیں۔ اتنے میں چھوٹی بیٹی فزائے نے جواب دیا ”جی دادا! آپ کچھ کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں جلدی سے اپنی امی سے پوچھو، بنگالی لڑکا ہے؟“

”فزائے آ کر کمرے میں کہا ”ماما! دادا کہہ رہے ہیں کہ بنگالی لڑکا ہے؟“

وہ ہونٹ ہو کر بیٹی کو دیکھنے لگی۔ اسے یہی لگا کہ بیٹی کہہ رہی ہے، آج کیا پکا ہے؟ پیچھے ایان کھڑا تھا۔ اس نے باواز بلند کہہ دیا ”نہیں ہے، نہیں ہے۔“

فزائے سے کہنے لگی ”ماما میں دادا کو نہیں بتا رہی، آپ بتائیے۔“

بہو عزیز صاحب کے پاس پہنچی اور بولی ”جی ابا۔“

”بیٹا وہ بنگالی لڑکے کا رشتہ ہے؟“ ان کا انداز ایسا تھا جیسے پوچھ رہے ہوں ”باورچی خانے میں کوئی کھانے کی چیز ہے؟“

”جی نہیں۔“ بہو نے جواب دیا۔ یہ کہہ کر آرام اپنے کمرے میں آگئی اور سوچا کہ واقعے کا امی سے ذکر کروں گی۔ شام کو اس نے سارا قصہ ساس کو بتایا۔ بیگم عزیز کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ انھیں ہنستا دیکھ کر بہو بھی ہنس پڑی۔ بیگم عزیز کہنے لگیں ”بنگالی لڑکے کے رشتے کی جب آواز میرے کانوں میں پڑی، تو میں سمجھی، کوئی برتن والا آیا ہے۔۔۔۔۔ اور وہ کہہ رہا ہے کہ بھائی برتن ہیں۔“

دونوں ساس بہو پھر ہنسنے لگیں۔ سونے پر سہاگا خبریں دیکھنے کے لیے ٹی وی کھولا، تو وہاں ایک سیاسی جماعت کے سربراہ کا خطاب آرہا تھا۔ آواز ایسی تھی جیسے بکرے کی گردن پر چھری پھر رہی ہو۔ ان کی ہنسی پھر چل پڑی۔ بیگم عزیز سوچ رہی تھیں ”ابھی تو ابتدا ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔۔۔۔۔“

فکاہیہ

گرامی“ شہر بھر کے ادبی، سماجی، سیاسی، ثقافتی اور دیگر حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

ان کی ایک خوبی جو پڑھے لکھے لوگوں میں بڑی مقبول ہے، یہ ہے کہ بہت سی کتابیں جو انھیں تنقید کے لیے وصول ہوتی ہیں اور جن پر ان کی تنقیدی تحریر محفلوں میں سنی اور اخبارات میں پڑھی جا چکی ہوتی ہے، وہ اپنے دوستوں کو یہ کہہ کر دے دیتے ہیں، خدا کے لیے اسے واپس مت کیجیے گا۔

وصول کرنے والے حیرت میں اس لیے مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کتابوں کے بہت سے جڑے ہوئے اوراق کاٹ کر کھولنے

”حضرت نامی گرامی“

دور حاضر کے نقاد اعظم کا چٹ پٹا خاکہ

نسیم سحر



جو منحنی و مسکین سے بزرگ دکھائی دے رہے ہیں، انھیں یہ معمولی ہستی مت سمجھئے اور ان کے ظاہری حیلے پر بھی مت جائیے جو ”دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں“ کا سا ہے۔ یہ ہیں ہمارے عہد کے نامور نقاد ”حضرت نامی گرامی“ جن کی بغل میں ہر وقت کسی زیر تکمیل مقالے یا مضمون کا مسودہ اور کچھ پایہ تکمیل کو پہنچ جانے والے مقالے اور مضامین دبے ہوتے ہیں۔ منہ میں پان کی گلوری ہوتی ہے جسے وہ اپنے دانتوں کی ”باقیات“ یعنی پونے دو دانتوں اور پوپلے مسوڑھوں کے ذریعے مسلسل چبانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ہونٹ گلوری کے ”زیر اثر“ کچھ اس قدر سرخ ہوتے ہیں مانو ان پر لپ اسٹک تھوپی ہوئی ہو۔ مکمل طور پر کلین شیو، عموماً پیلے یا نیلے کرتے اور سفید پانجامے میں ملبوس، ہونٹوں پر خفیف سی (مگر مکاری سے بھرپور) مسکراہٹ سجائے ”حضرت نامی



استاد کو ترجیح

سکندر سے کسی نے پوچھا کہ آپ استاد کو باپ پر کیوں ترجیح دیتے ہیں؟

جواب دیا ”اس لیے کہ باپ تو مجھے آسمان سے زمین پر لایا اور استاد اسطو مجھے زمین سے آسمان پر لے گیا۔ نیز باپ سبب حیات فانی اور استاد موجب حیات جاودانی ہے۔ باپ میرے جسم کی پرورش کرتا ہے اور استاد میری جان کی۔“

(مرسلہ: شمیمہ سکندر، اوکاڑہ)

اور فرسٹ ایڈ کا انتظام بھی کر کے رکھتے۔ (اڑتی اڑتی خبر یہ بھی ہے کہ کہیں تو تجہیز و تکفین کے انتظامات بھی کر لیے جاتے تھے۔) اس ”خوش خوراکی حادثے“ کا سبب ان کا ندیدہ پن کچھ یوں بنا کہ ایک ایسی ہی دعوت میں کامل شدت خلوص کے ساتھ ایک بھنی چانپ میں سے سارا گوشت نوچنے اور چوسنے کے باوجود ابھی ان کا یہ خیال تھا کہ ہڈی کے آخر میں کہیں گوشت کا تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے جسے دانتوں سے توڑنا یا انگلیوں سے کھینچنا ممکن نہیں، مگر جسے چھوڑنا بھی انہیں گوارا نہ تھا، چناں چہ اسے ”چوس کر کھینچنے“ کی کوشش میں وہ ساری کی ساری چانپ ان کے گلے میں اتر گئی اور موصوف واقعی مرتے مرتے بچے۔ ایک جاں گسل آپریشن کے ذریعے وہ ہڈی نکالی گئی۔

چناں چہ اب وہ یہ احتیاط ضرور کرنے لگے ہیں کہ دعوت ملنے پر فرمائش کرتے ہیں، گوشت کی جتنی ڈشیں بھی بنائی جائیں ان میں ہڈی نہیں ہونی چاہیے۔ چناں چہ اب کچھ یوں ہو رہا ہے کہ شہر بھر میں جونہی کوئی کتاب شائع ہو، ”بون لیس“ گوشت کی فروخت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ہڈیاں اسی شہر میں کسی اور مقام پر کتوں کی ضیافت کا سامان بنتی ہیں۔ حالانکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان ہڈیوں کے حقیقی حقدار، تو ہمارے یہی نقاد حضرت نامی گرامی ہیں۔

کی زحمت بھی نہیں کی گئی ہوتی، گویا ”سونگھ کر“ مقالہ لکھا گیا تھا۔ کئی مرتبہ کتاب سونگھنے کے بجائے (اگر مصنف کے گھر بیٹھے ہوں تو) باورچی خانے سے آنے والی طرح طرح کی خوشبوئیں سونگھ کر یہ اپنے مقالے کو چٹ پٹا اور مرغن بنانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ جتنی ڈشیں ان کے لیے تیار کی جاتی ہیں اسی مناسبت سے مقالے کی طوالت بھی ہوتی ہے۔ سویت ڈشوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہو، مقالے یا مضمون کی مٹھاس بھی اسی تناسب سے بڑھتی جاتی ہے۔ بعض اہم لوگوں سے تعلقات بڑھانے کے لیے ایسا بھی ہو چکا کہ کتاب کسی وجہ سے دیر سے شائع ہوئی مگر اس پر تبصرہ پہلے آگیا۔

آپ محفل میں اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے ہر جملے پر رک کر حاضرین کی جانب فخریہ انداز سے دیکھتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں ”دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی کہہ دے سہرا۔“ اور پھر داد کے منتظر رہتے ہیں جو عموماً صرف صاحب کتاب کی طرف ہی سے موصول ہوتی ہے۔

جب وہ کسی صوفے پر بیٹھ کر مقالہ پیش کر رہے ہوں، تو منہ کے ”پوپلے غلا“ سے جو ”گلو ریا کی بو چھاڑ“ ہوتی ہے، اس کی زد میں آکر اکثر ارد گرد کے لوگوں کے شفاف ملبوسات پر سرخ نشان پڑ جاتے ہیں۔ وہ بظاہر تو گلو ریا کی وجہ سے بنتے ہیں، مگر حضرت نامی گرامی کے کچھ حاسدین کا کہنا ہے کہ یہ نشان ان کے مقالے کی وجہ سے ان لوگوں کے لہو لہان ہونے کی وجہ سے نظر آتے ہیں۔

آپ اپنی کتابوں پر مقالے اور مضمون لکھوانے کے شوقین خواتین و حضرات کے ہاں اپنے خور و نوش کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے لچھے دار گفتگو سے خوب کام لیتے ہیں۔ اس عمر میں بھی (ستر سے کچھ اوپر ہی ہوگی) آپ ایک وقت میں تین چار وقتوں کا کھانا بڑی سہولت سے کھا لیتے ہیں۔ البتہ ماضی میں ان کے ساتھ ایک ”خوراکی حادثہ“ ضرور پیش آیا تھا جس کے بعد کچھ عرصہ تک تو میزبان طرح طرح کی ڈشوں کے ساتھ ساتھ ایبو لینس

زمانے میں گیدڑوں اور جنگلی بلیوں سے مرغیاں، لکڑ
بھگڑ سے بکریاں اور تیندوؤں سے گائے، بکری اور کبھی
کبھی انسانی جانیں بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی
رات ہوگی جب کسی نہ کسی قسم کی واردات نہ ہوتی ہو۔ کچھڑ کے
سب گھر سے قدم نکالنا مشکل تھا۔

اودھے پورہ کا خونی تیندوا

ایک ماہر شکاری کو دن میں تارے دکھلا دینے والے
چالاک و خونخوار حیوان کی سنسنی خیز کہانی

مقبول جہانگیر

میں بچھتا رہا تھا ناحق اس موسم میں اودھر کا رخ کیا۔ مگر
چچا زاد بھائی سید اللہ کو مٹی کے تیل کا ٹین پہنچانا ضروری تھا، ورنہ
انھیں پوری برسات اندھیرے میں گزاری پڑتی۔ دوسری جنگ
عظیم کا زمانہ تھا اور مٹی کا تیل کہیں دستیاب نہ تھا۔ کہیں سے مل
سکا، تو مجھے لکھ بھیجا اور میں اپنے دوست، نائب تحصیل دار ریوڈ کر
کے دیے ہوئے پرمٹ پر تیل حاصل کر کے جولی پہنچانے آیا
تھا، مگر بارش اور پھر سیلاب سے راستہ بند ہو گیا۔

بھادوں کے موسم میں سی پی (Central

Provinces) کے دیہات خاصے

خطرناک ہو جاتے ہیں۔ سانپ، بچھو گھروں

میں ریگتے بھرتے اور درندوں کا، تو گویا راج ہوتا ہے۔ وہ

دیہات میں بے جھجک گھس کر وارداتیں کرتے ہیں۔ اس

سماون

جولی گھنے جنگلوں میں واقع چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ہے۔
کچی سڑک وہاں سے آٹھ میل دور ہے۔ جالہری نالہ جنگل کے
درمیان کچے راستے پر واقع ہے، دس پندرہ فٹ چوڑا، مگر گہرا اس
سے کہیں زیادہ ہے۔ پتھروں، چٹانوں اور درختوں سے ٹکراتا اور
شور مچاتا اس قدر تیزی سے بہتا ہے کہ سیلاب کے زمانے میں



اسے پار کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

میرے قیام کا دسواں دن تھا، اودھے پور گاؤں سے خبر آئی وہاں ایک تیندوے نے واردات کردی ہے۔ اس علاقے میں ایک عرصے سے آدم خور شیر یا تیندوے کی کوئی اطلاع نہ تھی اس لیے مجھے اچنبھا ہوا، مگر پیامبر معتبر تھا۔ دھنی رام، مال گزار نے مجھے بلا بھیجا تھا۔ اسے جولی میں میرے قیام کا علم تھا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ لاش کریا کرم کے لیے اٹھوائی جا چکی۔ یوں فوری طور پر پہنچنے کی خاص ضرورت تو نہ تھی، تاہم جائے واردات کا معائنہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے میں قاصد جگن ناتھ کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

اودھے پورہ وہاں سے تقریباً چار میل دور ہے۔ اس ناگوار موسم میں یہ سفر خاصا تکلیف دہ رہا۔ گاؤں سے نکلتے ہی جوتے اتار کر جگن ناتھ کے حوالے کرنا پڑے کہ نرم کچڑ اور پانی میں پاؤں ٹخنوں تک دھنس جاتے، پھر کالی اور چکنی مٹی کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے کناروں پر چلتے ہوئے ہم قدم قدم پر پھسلتے اور ہر پچیس پچاس گز بعد رک پاؤں دھوتے کہ تلوؤں پر چکنی مٹی کا بہت موٹا سول چڑھ جاتا اور پاؤں کئی کئی سیر کے ہو جاتے۔ تقریباً دو فرلانگ بعد جنگل اور پہاڑی علاقہ شروع ہوا، تو اس مصیبت سے نجات ملی۔ راستے میں جگن ناتھ واردات کی تفصیل سناتا رہا۔

یہ واردات دھنی رام مال گزار کے مویشیوں کی سار میں ہوئی تھی۔ مرنے والا مہابیر کڑیل جوان تھا۔ رات کے دو بجے تیز بارش ہو رہی تھی۔ ناگاہ سار میں بند مویشیوں نے الٹا شروع کیا اور ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ دھنی رام کے نو عمر بیٹے منی رام نے باپ کی بندوق سنبھالی اور لائین لے کر بھگتے ہوئے صحن پار کیا۔ جونہی سار میں داخل ہوا، دیکھا، خون میں لت پت مہابیر کی لاش پڑی ہے اور مویشی خوفزدہ ہو کر ایک سرے پر جمع ڈکرا رہے ہیں۔ مہابیر نے اپنی مٹھیوں میں کلہاڑی جکڑ رکھی تھی اور سار کے بیرونی دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔

☆☆

”بے چارہ مہابیر نہایت وفادار اور مویشیوں کا بڑا خیال رکھتا تھا۔“ منی رام نے سادگی سے بتایا۔

”اور کا؟ نہیں تو رات کی اتنی ٹیم ڈھور بچھیرو کا ایراپا کے اتنی دور سے بھاگنا آتا۔“ جگن ناتھ نے ٹوکارا دیا۔

”تو کیا مہابیر یہاں نہیں رہتا؟“ میں نے پوچھا۔

”ناہیں! وہ تو اتنے باؤلی کے پاس رہت ہے۔“ جگن ناتھ نے تقریباً تیس گز دور آم کے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ڈنگر لائے، تو سب سے پہلے کلہاڑی لے کر وہی پہنچا۔ میری آنکھ تو دیر سے کھلی اور جب میں آیا اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔ گلباگ نے گلاب کر اسے ایسا دبوچا کہ اس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔“ منی رام بولا۔

”مگر.....“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ”سار کے بیرونی دروازے کی کنڈی کیا باہر سے بند کی جاتی ہے؟“

”نہیں، اندر کی کنڈی بند ہوتی ہے۔“ شانتی دیدی روز بند کرتی ہے۔“

”تو وہ کھلی کیونکر؟ یا رات وہ کنڈی بند کرنا بھول گئی تھیں؟“

”ذرا معلوم تو کرو؟“

منی رام اپنی بیوہ بہن شانتی کو بلا لایا۔ وہ کھڑے کھڑے نقش کی، گندمی چہرے والی نازک اور اداس سی لڑکی تھی۔ اس نے بتایا، سار کے بیرون دروازے کی کنڈی ہاتھ ڈال کر باہر سے بھی کھل سکتی ہے، پھر اس نے عملی مظاہرہ بھی کیا۔ سب مطمئن ہو گئے، مگر مجھے شبہ سار رہا۔ تاہم میں نے اس کا اظہار نہ کیا۔ شواہد کے مطابق مویشیوں کا شور سن کر مہابیر کلہاڑی لیے دوڑا آیا۔ ہاتھ ڈال کر سار کی اندرونی کنڈی کھولی اور جونہی اندر داخل ہوا، تیندوے نے اسے دبوچ لیا۔

سوال یہ تھا تیندوہ سار میں مہابیر سے پہلے کیونکر داخل ہوا؟ وہ دروازہ کھلنے کے بعد ہی اندر جا سکتا تھا اور اگر ایسا ہوا، تو مویشیوں کے لانے کا واقعہ بھی بعد کا ہونا چاہیے۔ اس نوع کے

سوالات بار بار ذہن میں ابھر رہے تھے۔ ان پر قابو پا کر میں تیندوے کے آثار تلاش کرنے لگا۔

میرا قیاس غلط ثابت ہوا کہ وہ قتل کی واردات تھی۔ گوہر پر تیندوے کے پنجوں کے واضح نشانات تھے اور سار کے باہر دیوار کے سائے میں گیلی زمین پر دور تک نظر آرہے تھے۔

میں باہر کے مکان کی طرف بڑھنے لگا، تو سار کے ساتھ ہی انسان کے پیروں کے نشانات ملے۔ وہ سار کے دروازے کی جانب آئے تھے اور ایک جگہ ان پر تیندوے کا پنجہ یوں پڑا تھا کہ وہ تقریباً اس میں دب گئے۔ اب مزید تفتیش کی ضرورت نہ تھی۔ تیندوے والا زمی طور پر مہاجر کی آمد کے بعد ہی سار میں داخل ہوا تھا۔ پھر میں سار کے اندرونی دروازے سے دالان میں آیا۔ وہاں پیروں کے ایک سے زیادہ نشانات موجود تھے۔

آگے بڑھا، تو بائیں ہاتھ بھوسے والے کمرے پر نظر پڑی۔ اس کا دروازہ جیسا کہ بتایا گیا ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ وہاں بھی گوہر میں بھرے انسانی قدموں کے نشانات جاتے اور آتے دکھائی دیے۔ وہ ایک ہی آدمی کے نشانات تھے اور اس کے جس کے نشانات تیندوے کے پنجے کے نیچے دب گئے تھے۔

مہاجر سار سے گزر کر بھوسے والے کمرے میں آیا اور دوبارہ سار میں داخل ہوا۔ اسی وقت تیندوے نے اس پر حملہ کیا۔ واردات کے رہے سبے آثار بھی واضح کر رہے تھے کہ وہ آسانی سے تیندوے کے قابو نہیں آیا مگر نامعلوم وجود سے اس نے شور بالکل نہ مچایا۔ میں اس پہلو پر غور کرتا رہا اور پھر میری نگاہیں شانتی پر مرکوز ہو گئیں۔

منی رام کا مکان گاؤں کے سرے پر واقع تھا۔ محراب دار بیرونی دالان کے پنجوں بیچ صدر دروازہ سیدھا صحن تک جاتا تھا۔ صحن کے دونوں جانب مقابل رخ پر دالان اور ان کی پشت پر تین تین بڑے بڑے کمرے تھے۔ تیسری چار دیواری کے ساتھ دالان اور رسوئی تھی۔ وہیں گھڑونجی کے پاس ایک ستون میں بندھی ہوئی مٹھانی اور گھی کا ٹین رکھا تھا۔ صحن کے پنجوں بیچ

چبوترے پر تلخی کے پودے کے سائے میں تین چار گول گول پتھروں کے دیوی دیوتا ستادہ تھی۔ چوتھی چار دیواری کی بیرونی جانب مویشیوں کی لمبی سی سار تھی جس کا اندرونی دروازہ دالان میں کھلتا جس کے برابر بھوسے کا کمرہ، پھر غلے کا..... اور آخر میں وہ کمرہ جو شانتی کے لیے مخصوص تھا۔ صحن کی دوسری جانب کے کمرے دھنی رام، اس کی بیوی اور بہو کے تصرف میں تھے۔

میرے قیام کے لیے غلے والا کمرہ صاف کر دیا گیا۔ موسلا دھار بارش کے باعث اس روز باہر نکلنے کا تو کوئی امکان نہ تھا، اس لیے چار پائی پر لینا غور سے شانتی کی مصروفیات کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ مشین کی طرح مسلسل کام میں لگی ہوئی تھی۔ برتن مانجھ کر اب آٹا پیس رہی تھی مگر اس کے باوجود ماں اور بڑی بھانج کی ڈانٹ ڈپٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اسے بات بے بات جھڑکتیں اور برا بھلا کہتیں۔ منی رام میرے پاس بیٹھا الگ احکام صادر کرتا رہا: ”شانتی دیدی، چائے لاؤ، شانتی دیدی، یہاں جھاڑو دے دو..... دودھ گرم ہوا کہ نہیں؟ بھینسوں کو بھوسا ڈال دیا۔“ وغیرہ

شانتی کی عمر اٹھارہ بیس سال ہوگی۔ منی رام کی زبانی معلوم ہوا، وہ آٹھ دس برس سے بیوہ ہے۔ بھونری پھر گئی مگر گونا (وداع) ہونے سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی۔ ہندو دھرم میں بیوہ عورت شادی تو نہیں کر سکتی، اس لیے وہ بدنصیب دن رات سب کی خدمت کرتی اور اپنی جوانی کو خاک میں ملائے جھڑکیوں پر جھڑکیاں کھا رہی تھی۔ اس کی کرناک اور سوگوار زندگی دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ اس بدنصیب کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا، مگر میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس کا راز افشا نہ کروں گا۔ میں چاہتا تھا وہ تنہائی میں مل جائے، تو اسے اطمینان دلا دوں۔ وہ تفتیش کے دوران میرے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھ کر سخت گھبرائی ہوئی سی تھی۔ افسوس تفصیلی گفتگو کا موقع نہ ملا اور میری ہمدردی اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔

منی رام کی چار پائی میرے ہی کمرے میں تھی۔ رات

کھانے کے بعد وہ کسی کام سے ماں کے کمرے میں چلا گیا اور اس کی غیر موجودگی میں شانتی گھونگھٹ نکالے میرے لیے دودھ لے آئی۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے میں نے کہا: ”شانتی مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ میں تمہارا مہابیر والا راز کسی کو نہ بتاؤں گا۔“

وہ چونک سی پڑی۔ دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ اس نے اپنی بوجھل پمکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پھر اپنے ہاتھ جوڑے اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ منی رام واپس آ گیا۔ گرا ہوا دودھ دیکھ کر وہ اس پر برس پڑا: ”ہاتھوں کا ست اڑ گئے؟ دودھ کیسے گر گئے؟ دیکھ کے کام نہیں کرے۔ پڑے پڑے کھائے کالمٹ ہے تو مٹا گئی ہے۔“ شانتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک نگاہ منی رام پر ڈالی اور پھر بے بسی سے میری جانب دیکھنے لگی۔

”منی رام، بہن پر کیوں بگڑ رہا ہے، گلاس تو میرے ہاتھ سے گرا ہے۔“

میری بات پر اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا، پھر بھی اس نے تیوری چڑھا کر کہا: ”اب کھڑی کا کر رہی ہے۔ بوری لا کے زمین پونچھ اور دودھ کا دوسرا گلاس لا کے دے۔“

”نہیں، مجھے دودھ کی ضرورت نہیں۔“ میں نے قدرے ترش روی سے کہا: ”منی رام، تم تو پڑھے لکھے ہو۔ کوئی بڑی بہن سے اس طرح بات کرتا ہے۔“

شانتی جا چکی تھی اور منی رام کہہ رہا تھا: ”آپ نہیں جانتے، یہ ایسا ہی کرتی ہے۔“

میں چپ رہا اور بدنصیب شانتی کی سوگوار زندگی کے تصور میں ڈوب گیا۔ وہ آئی، خاموشی سے زمین صاف کی۔ ہاتھ دھو کر گلاس میں دودھ لائی۔ مجھے دیتے ہوئے نظریں اٹھائیں، تو میں نے اس کی آنکھوں میں ایک پراسرار عزم کی جھلک دیکھی۔ ان کی اداسی اور گہری ہو چکی تھی اور حسرت و یاس کے ساتھ ان میں نگاہ واپس کے نشتر بھی تھے جو کسی مرنے والے کی وداعی نگاہ

میں ہوتے ہیں۔

”شانتی بائی.....“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا مگر وہ جا چکی تھی۔

”اری بہری ہے کا؟ سنے کا ہے نائیں۔“ منی رام بولا۔
”نہیں، جانے دو، مجھے کچھ نہیں کہنا۔“

دوسرے دن علی الصباح ابھی خاصا اندھیرا تھا۔ وہ گھڑے اور رسی لے کر پانی بھرنے گئی اور کچھ دیر بعد جب دوسری پہاڑ میں بھی وہاں پہنچیں، تو شور مچا کہ شانتی کنویں میں گر کر مر گئی۔ رسی اور گھڑا بھی اسی کنویں سے برآمد ہوئے۔ بظاہر یہ اتفاقی حادثہ تھا، مگر میں جانتا تھا یہ اتفاق کیوں ہوا۔ گھر والوں کے سوا سارا گاؤں شانتی سے محبت کرتا اور سب کو دکھ تھا لیکن مجھے رنج بھی تھا اور خوشی بھی۔ ظالم سماج کی یہ ستم ظریفی دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی کہ سب سے زیادہ غم کا اظہار شانتی کے گھر والے ہی کر رہے تھے۔

دو دن بعد بارش رکی اور میں رات نفل سنبھال کر تیندوے کی ٹوہ میں جنگل کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ منی رام نے میرے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ میری سفارش پر اس کے باپ نے اجازت دے دی۔ وہ بارہ بوری کی دونالی بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔ اسے بندوق چلانے کا شوق بہت تھا۔ میں نے اس کی ہمت بڑھائی اور وعدہ کیا کہ اگر موقع ملا، تو تیندوے پر پہلے اس کی گولی چلواؤں گا۔ ہم کیچڑ میں لت پت دیر تک جنگل میں مارے مارے پھرتے رہے۔ تیندوے کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ تیز بارش نے اس کے پنچوں کے نشان مٹا دیے تھے۔

میلوں پھیلے ہوئے وسیع و عریض جنگل میں ایک سے زیادہ تیندوے ہو سکتے تھے۔ کیسے پتا چلتا کہ وہ خاص تیندوہ کون ہے۔... اور یوں بھی وہ عادی آدم خور نہ تھا۔ محض اتفاق سے سار میں داخل ہوتے ہی مہابیر سے اس کی مڈ بھیڑ ہو گئی اور گھبراہٹ میں اس نے حملہ کر دیا۔ رازداری کے پاس نے مہابیر کو شور مچانے سے باز رکھا اور اس نے چپ چاپ مرجانا پسند کیا، تاہم جس

رسوائی سے بچنے کے لیے مہابیر نے جان کی بھینٹ دی اور شانتی نے خودکشی کی، وہ ہو کر رہی۔

ہلکی ہلکی پھوار رک رک کر پڑتی رہی اور ہم یونہی ادھر ادھر چکر لگاتے رہے۔ چکاروں کا ایک جوڑا نظر آیا، تو منی رام سے رہا نہ گیا۔

”بڑے بھیا، کھانے کے لانے ایک آدھ پھسکرا جو مار لیو۔“

”کیوں، مرغی کھلانے کا ارادہ نہیں؟“

”وہ تو جتنی کھانی ہوں، سب آپ ہی کے لانے تو ہیں۔ پن کباب کا مجا تو پھسکرا ہی میں آئے گا۔“

پھسکرا وہاں چھوٹے چکاروں کی اس نسل کے لیے بولا جاتا ہے جو جوڑوں میں رہتے ہیں۔ کسی کو دیکھ کر پھس پھس کی آوازیں نکالتے ہیں، پھر اپنی پھوٹی سی دم ہلاتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں۔ پھسکرا مارنے کو جی تو نہ چاہتا تھا، مگر ایک نیا طریقہ آزمانے کا خیال آیا جو میں نے اپنے ماموں سے سیکھا تھا۔

تب اپنی رائفل منی رام کے حوالے کی اور بارہ بور میں ایس جی کے کارتوس بھر کر اسی جگہ ساکت کھڑا ہو گیا جہاں سے چکارے بھاگتے تھے۔ منی رام کو تاکید کر دی کہ وہ بالکل چپ چاپ کھڑا رہے اور تماشا دیکھے۔

”اتی ٹھاڑے رہنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ڈھکائی کر کے کاہے ناہیں مارو۔“

”ڈھکائی کی ضرورت نہیں۔“

”پھسکرا تو بھاگ لیے، بے فضول نیم خراب کر رہے ہو۔ اب وہ تو تھوڑی آئیں گے۔“

”آئیں گے، منی رام، ضرور آئیں گے۔ تم چپے کھڑے رہو۔“

شکار کا یہ طریقہ خاصا صبر آزما اور تکلیف دہ ہے، مگر اس میں کامیابی سو فیصد ہوتی ہے۔ چکاروں کی عادت ہے جس جگہ سے بھاگتے ہیں، کچھ دیر بعد یہ تصدیق کرنے کے لیے پھر وہیں

دشمن بھی اپنا بن جائے

ایک دفعہ میں ایک بزرگ کے پاس شکایت لے کر گیا کہ فلاں آدمی نے میری برائی پر گواہی دی ہے، تو اس نیک دل نے مجھے کہا کہ تو اس سے نیکی کر کے اسے شرمندہ کر دے تاکہ وہ آئندہ ایسا نہ کر پائے۔ پس تجھے چاہیے کہ تو نیک چلن رہ تاکہ تیرا برا چاہنے والے تیرا عیب اور کمزوری بیان کرنے کی مجال و جرأت نہ کریں۔ تو نے سنا ہے کہ جب سارنگی کی آواز ٹھیک ہوتی ہے، تو وہ ٹھیک ہونے کے لیے گویے سے چوٹ نہیں کھاتی۔

درس حیات:

- ۱۔ جو راہ راست پر چلے اسے کسی قسم کا ڈر نہیں ہوتا۔
 - ۲۔ راہ حق پر چلنے والوں کے دل و دماغ کو اللہ اپنی رحمت سے سیدھا کر دیتا ہے۔
 - ۳۔ راہ حق پر چلنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشنی اور ہدایت پانا ہوتا ہے۔
- (شیخ سعدی شیرازی، انتخاب: معظم شفیق، خانیوال)

واپس آتے ہیں کہ وہ بھاگنے میں حق بجانب تھے یا نہیں۔ چکاروں کی نظر بھی شاید کمزور ہوتی ہے۔ وہ سیاہ اور بھورے نئے والے تیندو، اچار اور یا کر کے درختوں کے تنوں، جھاڑیوں اور چٹانوں کے درمیان خاکی کپڑوں میں ملبوس بے حس و حرکت کھڑے آدمیوں میں تمیز نہیں کر سکتے۔

تقریباً چالیس منٹ گزر گئے اور دو دور چکاروں کا نام و نشان نہ تھا۔ انتظار سے تنگ آ کر میں اپنا منصوبہ ختم ہی کرنے والا تھا کہ دور جھاڑیوں کی درمیانی پگڈنڈی پر آہستہ خرامی سے آگے پیچھے آتے دونوں چکاروں پر میری نگاہ پڑی۔ تجربے کی کامیابی پر مسرت سے سانس پھولنے لگا۔ چکارے بڑے محتاط انداز میں چند قدم بڑھتے اور پھر ٹھہر کر گرد و پیش کا جائزہ لیتے، کان ہلاتے، پھس

پھس کرتے جیسے نتھنوں سے ہماری بوسونگھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ ابھی تک زد میں نہ آئے تھے مگر فائر کرنے کا سب سے مناسب وقت وہی ہوتا ہے جب وہ قدم آگے بڑھا رہے ہوں۔

قدرت کا اصول ہے کہ جن جانوروں کی نگاہ کمزور ہو، ان کی قوت شامہ حیرت انگیز طور پر تیز ہوتی ہے۔ کتے کی قوت شامہ تیز ہے، مگر بصارت اسی اعتبار سے کم۔ شیر قوت شامہ سے محروم ہے..... ہاتھی، ریچھ اور سور میں باصرہ کی کمی ہے۔ اسی طرح سانپ سننے اور پچھودیکھنے کی قوت سے قریب قریب محروم ہیں۔

اس وقت ہوا چکاروں کی سمت سے ہماری جانب چل رہی تھی، اس لیے وہ ہمارا وجود سونگھ نہ سکے۔ ہلکی ہلکی پھوار برابر جاری تھی۔ پیش منظر دھندلا تھا اس لیے اور بھی اطمینان تھا۔ اب میں نے موقع پا کر بندوق سیدھی کی اور ان کے زد میں آ جانے کا انتظار کرتا رہا۔

چکارے تقریباً تیس گز ادھر آ گئے، تو بندوق کی بلبل پر میری انگلی بے چین سی ہو گئی اور پھر زوردار دھماکے کے ساتھ دونوں چکارے زمین پر لوٹنے لگے۔ ایس جی کے تین دانے زکو لگے اور دو مادہ کو، باقی خالی گئے۔ میں نے چکارے ذبح کیے اور انھیں لے کر جب ہم اودھے پورہ پہنچے، تو شام ہو چکی تھی۔

دو روز بعد ایک دیہاتی نے آ کر بتایا، رات تیندوا اس کے گھر کے قریب غرار ہا تھا جہاں سار میں بکریاں بند تھیں۔ وہ موقع نہ پاسکا اور کوئی واردات کیے بغیر واپس چلا گیا۔

میں نے گھر کے قریب جا کر نرم زمین پر تیندوے کے پنجوں کے نشانات دیکھے اور اس کے آنے کا راستہ ذہن نشین کر لیا۔ اسی شب گھر کے قریب ہی پمپل کے درخت کے نیچے ایک بکرابندھوایا اور تقریباً بیس گز دور، ایک لودھی کی بلندی پر بنی ہوئی چھپری میں پھولس اور بانس کی ٹٹیوں سے مناسب اوٹ بنوا کر بیٹھ گیا۔ منی رام اپنی بارہ بور کے ساتھ میرے ساتھ تھا۔ چکاروں کا شکار دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور میں بھی حسب وعدہ یہی چاہتا تھا کہ میری ہدایات کے مطابق تیندوے پر پہلا فائر وہی کرے۔

رات اندھیری تھی۔ گہرے بادلوں کے باعث ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ بکراتہائی اور بارش میں بھگنے کے سبب مسلسل شور مچاتا رہا۔ رات کے دو بجے تک ہمیں اپنے شکار کی کوئی آہٹ سنائی نہ دی، پھر بارش کچھ دیر کے لیے رک گئی۔ میرے تجربے کے مطابق تیندوے کے حملے کا سب سے مناسب وقت یہی تھا۔ میں اور زیادہ چوکنا ہو کر سمٹ گیا۔ بکرا جو بیٹھ گیا تھا، اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ سی کی گنجائش کے برابر پیچھے ہٹا اور گلا پھاڑ کر مدد کے لیے چیخنے لگا۔ پھر تین چار فٹ اونچی انڈ بجورا اور کانٹوں کی باڑ کے قریب ہلکی سے کھر کھراہٹ محسوس ہوئی جیسے کسی نے باڑ کو ہلایا اور پتوں پر رے کے ہوئے پانی کے قطرے ایک ساتھ نیچے ٹپکے ہوں۔ میں نے منی رام کو بندوق کا گھوڑا چڑھا کر مستعد رہنے کی تاکید کی۔ ذرا سا آگے کھٹک کر اس نے میری ہدایت کے مطابق ٹٹی میں بنائے ہوئے بانٹ بھر لیے چوڑے سوراخ سے بندوق کی نال باہر نکالی۔ اسی طرح کے دوسرے شگاف سے میری رائفل پہلے ہی بکرے کو زد میں لے ہوئے تھی۔

منی رام نے بتایا تھا، وہ بارہ بور کی بندوق پہلے بھی چلا چکا اور دھان کے کھیت کی رکھوالی کرتے ہوئے اس نے دوسور بھی مارے تھے۔ بندوق اٹھانے، اسے گرفت میں لینے اور کارتوس لگانے یا گھوڑا (بیمبر) چڑھانے اتارنے کی مہارت دیکھ کر مجھے اس پر بھروسہ تھا۔ اب بات صرف نشانے کی تھی، اسی لیے میں نے گولی کے بجائے ایل جی کارتوس چلانے کی اجازت دی تھی۔ سات دانوں میں سے دو ایک تو تیندوے کو لگ ہی جاتے۔ اس کے علاوہ میری نوا ایم ایم رائفل کی گولی بھی مدد کے لیے موجود تھی، اس لیے پورا اطمینان تھا اور میں حسب وعدہ پہلا فائر کرنے کا موقع منی رام ہی کو دینا چاہتا تھا۔ اس سارے عرصے میں میری نگاہیں بکرے پر مرکوز رہیں لیکن نجانے کب پمپلیوں کے جھنڈے سے نکل کر تیندوے نے اس دبوچ لیا۔ خلاف توقع بکرے کی آواز بند ہو گئی اور ترشح پھر شروع ہو گیا۔

بجلی چمکی اور بکرا مجھے بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں سمجھا، شاید خطرہ

ٹل گیا اور وہ مطمئن ہو کر دوبارہ بیٹھ گیا ہے، مگر اپنے قیاس پر اعتبار نہ آ رہا تھا کہ بادل کی تڑاخ کے ساتھ دوبارہ بجلی کوندی، شبہ سا ہوا گویا وہ بکرا نہیں، تیندوا ہو، تاہم روشنی کا وقفہ اتنا کم تھا کہ بارش کی پھوار کے پردے نے پیش منظر واضح نہ ہونے دیا۔ نگاہ صحیح کام نہ کر سکی اور ساری قوتیں منتقل ہو کر سماعت پر مرکوز ہو گئیں اور اب بکرے کے رخ پر میں نے مدہم سی خرخراہٹ کی آواز سنی۔

ایسے موقع پر درندے کی موجودگی کا اطمینان کیے بغیر نارچ روشن کرنا غلط اور بسا اوقات خطرناک ہوتا ہے اور پھر یہ اہتمام بھی ضروری ہے کہ فوکس کی ہوئی روشنی کا سب سے روشن دھبہ سیدھا درندے کی آنکھوں پر پڑے، ورنہ دوسری صورت میں یا تو وہ چشم زدن میں اچھل کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے یا پھر جست لگا کر سیدھا اس جگہ پہنچتا ہے جہاں سے روشنی آ

نالی اوپر اٹھ گئی اور اس پر نصب نارچ بھی۔ پھر تیندوے کی ”اونہہ“ کی آواز سنائی دی۔ سنہلتے ہی میں نے فوراً راکفل اور نارچ کا رخ درست کیا مگر اب قرب و جوار میں اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ کانٹوں کی باڑ اور اس سے ملحق جھاڑیوں کی اوٹ میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ پانی کے تار کے جھلملاتے اور موتیوں کی طرح چمکتے پردے کے پیچھے بے حس و حرکت سیاہ بکرا البتہ اسی جگہ پڑا تھا۔ تیندوے سے ناامید ہوتے ہی میں نے نارچ فوراً گل کر دی کہ زخمی تیندوا اس کی روشنی میں ہماری کمین گاہ باسانی پاسکتا تھا۔

شدید خطرے کے احساس سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب سارے حواس مجتمع ہو کر آہٹوں کے لیے وقف تھے۔ ہم خوب جانتے تھے زخمی ہونے کے بعد تیندوا کتنا خوفناک اور

خطرناک ہوتا ہے اور انتقام لینے پر آجائے، تو اپنے زخموں یا جان کی پروا نہیں کرتا۔ ہر ہلکی سی آہٹ ہمارے دل دہلا دیتی۔ ایک ایک لمحہ سخت اضطراب اور بے چینی میں کٹ رہا تھا۔ میرے کہنے پر منی رام کھسک کر میری اوٹ میں بیٹھ گیا۔

مجھے اپنی غلطی پر شدید افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے منی رام کو پہلے فائر کرنے کا موقع کیوں دیا۔ تیندوے کی ”اونہہ“ سے یہ یقین تھا کہ ایل جی کے دانے اسے لگے ہیں، مگر کتنے اور کہاں لگے، اس کا اندازہ نہ تھا۔ بارش کی آواز کے سوا مکمل خاموشی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ اسی حالت میں گزرے۔ پھر کہیں قریب سے تیندوے کے غرانے کی آواز آئی جو رات کے بھیانک سانے میں ایسا ہیبت ناک ارتعاش پیدا کر رہی تھی کہ پھولس کی ٹٹی کی جگہ شیشے کی کھڑکی ہوتی، تو شیشہ ضرور ٹوٹ جاتا۔ پھر تیندوا زور سے دھاڑا۔

منی رام خوفزدہ ہو کر مجھ سے لپٹ گیا۔ یہ حملے کا الارم تھا اور تجربے کے مطابق اسی لمحے تیندوے کو جھپٹ کر حملہ کرنا تھا۔ میں گھبرا کر نارچ روشن کرنے ہی والا تھا۔ مگر میرے ہاتھ نے جسے آگے بڑھ کر نالی پر نصب نارچ کا سوچ آن کرنا تھا، اپنی جگہ

خرخراہٹ کی آواز نے میرا شبہ یقین میں بدل دیا اور میں نے نارچ روشن کر دی۔ تیندوا، بکرے کا زرخرہ منہ میں دبائے اس کا خون پی رہا تھا

مگر خرخراہٹ کی آواز نے میرا شبہ یقین میں بدل دیا اور میں نے نارچ روشن کر دی۔ تیندوا، بکرے کا زرخرہ منہ میں دبائے اس کا خون پی رہا تھا۔ وہ خون سڑکتا، تو بکرے کا سارا جسم سکڑ کر دوہرا سا ہو جاتا اور سانس باہر نکالتا، تو پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور جسم بھی دھندلا نظر آ رہا تھا۔

میں نے اپنی راکفل سے اس کے سر کا نشانہ لیا اور بانیں کہنی سے منی رام کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی بارہ بور سے فائر کرے۔ وہ تیندوے کو پہلے ہی زد میں لے چکا تھا۔ خوف و استعجاب یا پہلی مرتبہ تیندوے پر گولی چلانے کی خوشی کے باعث اس کا سانس پھول رہا تھا۔

منی رام بندوق کا دھکا برداشت نہ کر سکا اور دھماکے کے ساتھ ہی الٹ کر مجھ پر یوں گرا کہ میرا بھی ہاتھ ہل گیا۔ راکفل کی

سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ میں نے دستے کو اور مضبوطی سے گرفت میں لے لیا اور انگلی رائفلی کی لبلبی سے ہٹنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ یہ بھی اچھا ہوا، ورنہ اس وقت روشنی ہو جاتی، تو تیندو نظر آئے بغیر باسانی روشنی کے منبع پر جست لگا سکتا تھا۔

کچھ دیر دلوں میں ہلچل، مگر گرد و پیش میں سکوت رہا۔ پھر تیندوے کی آواز دور سے سنائی دی اور ہماری جان میں جان آئی۔

بسوڑا (دیہاتی) کا مکان گاؤں کے شمالی سرے پر تھا۔ ان خطرناک حالات میں جنوبی سرے پر تقریباً پچاس ساٹھ گز دور رکھی رام کی بکھری تک جانا خطرناک بھی تھا اور مشکل بھی اور وہاں بیٹھے رہنا بھی فضول اور لا حاصل! کیونکہ فائر کے بعد تیندوے کا بکرے کے لیے لوٹنا تقریباً ناممکن تھا۔

قدرے توقف کے بعد میں نے بڑھ کر بسوڑا کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ فائر کے بعد وہ جاگ رہا تھا اور ہمارے سنگل کا منتظر تھا۔ آہٹ پاتے ہی اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ رات ہم نے اس کے گھر بسر کی۔

تیندو زخمی ہونے کے بعد میرے لیے مہم کو ترک کر دینا ممکن نہ رہا کیونکہ بہت جلد اس کے آدم خور بن جانے کا امکان تھا۔ دُکھتے زخم یا ناکارہ عضو کے باعث درندوں میں وہ توانائی اور چستی نہیں رہتی جو جنگلی جانوروں کو پکڑنے اور ہلاک کرنے کے لیے ضروری ہے۔ جنگل میں بھوکا مر جانے کے خوف سے وہ پالتو مویشی ہڑپ کرنے کے لیے بستیوں کا رخ کرتا ہے۔ اپنی جان کی بازی لگا کر کسی انسان پر حملہ کر بیٹھتا ہے اور پھر اسے حیرت ہوتی ہے کہ اس نے پہلے ایسا کیوں نہ کیا۔ یہ شکار تو سب سے آسان، سب سے مزیدار اور سب سے نرم ہے۔ کھال میں تختی، نہ بڈیوں میں۔ سینگوں کا ڈرنہ کھروں کا خدشہ۔ پھر گوشت بھی نمکین اور لذیذ!

میں نے منی رام سے اس کی کم ہمتی کے بارے میں تب کچھ نہ کہا۔ دوسرے روز جب مہم پر روانہ ہونے لگا، تو اسے نرمی

سے منع کر دیا کہ جنگل میں زخمی تیندوے کی تلاش سخت خطرناک ہے، اس لیے اسے ساتھ لے جانا مناسب نہیں۔ وہ اسے ضرور ہوا، لیکن قرین مصلحت یہی تھا، جلد مان گیا۔

ہم نے اپنی جستجو کا آغاز اسی جگہ سے کیا جہاں مردہ بکرا پڑا تھا۔ معلوم ہوا تیندو اسے کھانے کا موقع بالکل نہ پاسکا، صرف خون ہی پیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بھوک مٹانے کے لیے وہ دو تین روز کے اندر ہی اندر کوئی واردات کرے گا۔ اس کے پنجوں کے اکا دکا نشانات سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ گاؤں کے شمالی رخ والے جنگل میں گیا۔ یہ جنگل بسوڑا کے گھر سے دو چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے بعد ہی بڑے پہاڑ کے دامن سے شروع ہو کر بتدریج بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ ترائی میں چند ڈھاک اور ببول کے درخت اور کروندوں اور جھڑبیری کی جھاڑیاں ہیں۔ اس کے بعد تیندو، اچار، کائیں، بڑ، بیڑہ، آنولہ اور کھیر (کتھا) کے درخت ہیں۔ پہاڑی کی بلندی پر ساگوان کے پیڑ بھی ہیں۔ ٹپیلی اور باڑنگ کی تو بھر مار ہے۔

میرے ہمراہ دو مضبوط دیہاتی، جگو اور چھدامی تھے۔ جگو کے پاس منی رام کی بارہ بورتھی اور چھدامی نے اپنی بھرمار بندوق پر برتھے کو ترجیح دی تھی کہ نمی اور سیلن کے سبب برسات کے موسم میں بارود آگ نہیں پکڑتا اور بھرمار کا چلنا مشتبہ ہو جاتا ہے۔ باہمی مشورے کے بعد طے پایا پہاڑ پر چڑھتے ہوئے بیس تیس گز کا فاصلہ رکھیں گے۔ یوں ہم دو مختلف مقامات سے جنگل میں داخل ہوئے۔ گھنی جھاڑیوں اور درختوں سے پٹے ہوئے کٹے پھٹے پتھر یلے راستے پر ہماری رفتار بے حدست تھی۔ پہاڑ تقریباً پانچ سو فٹ بلند تھا۔ چلتے چلتے ہم ادھر ادھر پتھر بھی پھینکتے جاتے کہ تیندو کسی جھاڑی یا غار میں چھپا ہو، تو باہر نکل آئے۔ ابھی ہم بمشکل دو سو فٹ چڑھے ہوں گے کہ جگو کے چیخنے کی آواز آئی اور پھر فائر ہوا جس کے ساتھ تیندو اغرایا۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھا، پھر کراہنے کی آواز کے ساتھ ہی پہاڑی کی بلندی پر ایک بھیڑ نے خوفزدہ انداز میں چیخنا شروع کر دیا۔ بھیڑ (Barking

سونے کا پہاڑ خرچ کرنے سے زیادہ فضیلت
حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ
رسول اللہ نے فرمایا جسے رات کے سفر سے گھبراہٹ ہو
یا مال خرچ کرنے میں بخیل ہو یا جو دشمن سے لڑنے میں
بزدل ہو تو وہ کثرت کے ساتھ سُبْحَانَ اللَّهِ
وَبِحَمْدِهِ کے کلمے کا ورد کرے کیونکہ یہ کلمہ اللہ تعالیٰ
کے نزدیک فی سبیل اللہ سونے کا پہاڑ خرچ کرنے سے
بھی زیادہ محبوب ہے۔
(صحیح الترغیب والترہیب - طبرانی)

تھی نہیں تو وہ گلبکھا کھیں سمجھیں کا؟“

پھر وہ روتے ہوئے برابر کھڑی عورت سے بولی: ”دیکھو
ناری، بندوق سوؤ ساتھ نہ ہتی! پن موت جو بدی تھی! سوئی تو
کچھونہ کرتی بنو۔“

سارا گاؤں اکٹھا ہو چکا تھا، سب لوگ سوگوار تھے اور میں
شرمندہ اور پشیمان اپنی قیام گاہ میں سر نہواڑے بیٹھا تھا۔ میری
پوری شکاری زندگی میں ایسا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔

دوسرے دن بارش تھم گئی اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے
لیے دھوپ بھی نکلتی رہی۔ موسم بہتر ہو گیا، لیکن ابھی تک میں
فیصلہ نہ کر سکا تھا تیندوے کو کیونکر تلاش کروں گا۔ پھر خاموشی سے
تنہا جنگل کی جانب روانہ ہوا۔ پہاڑ کے دامن میں دونوں
بد نصیبوں کی چٹاؤں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا اور ہوا بند
ہونے کے سبب جلے ہوئے گوشت کی بو سے فضا مکدر تھی۔ آگے
بڑھا اور پہاڑ کی چوٹی تک جا پہنچا۔ دوسری جانب اترنے تک
کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ اب میں پہاڑ کے دامن کے ساتھ ساتھ
چھوٹی سی نہر کی پٹری پر چل رہا تھا۔ قریب ہی پونڈی بڑا قصبہ تھا
جہاں چاروں طرف کے دیہاتی سودا سلف خریدنے آتے جاتے
رہتے۔ وہاں جا کر لوگوں کو آدم خور تیندوے سے خبردار کرنا بہت
ضروری تھا۔ چھوٹے لال پیسے کی دکان میں تیندوے کی گزشتہ

(Deer) کی آواز بھتی چلی گئی اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ تیندوا
اسی جانب گیا ہے۔ اب میں نے جگو کو آواز دی:
”جلدی پہنچو بھیا۔“ چھدامی کی آواز تھی۔ ”گلبکھا ہمکا لے
ڈارس۔“

کانٹوں اور پتھروں سے بچتا بچتا میں بمشکل ان تک پہنچا
اور خونی منظر دیکھ کر لرز اٹھا۔ جگو اوندھے منہ خون میں لت پت
پڑا تھا۔ قمیص تار تار تھی اور پیٹھ کا گوشت یوں ادھڑا ہوا تھا کہ
پسلیاں باہر جھانک رہی تھیں۔ گردن بری طرح چبائی گئی تھی۔
سامنے بارہ بور بندوق رکھی ہوئی تھی۔ اس سے تقریباً دس گز دور
چھدامی پڑا ہوا تھا جس کے بائیں رخسار کا گوشت ادھڑ کر اڑکا ہوا
تھا۔ دائیں کولھے کا ایک ٹوٹا اور پڑا تھا۔ پیٹ پھٹ چکا اور
آنتیں باہر نکل آئی تھیں۔ جگو بے ہوش تھا۔

چھدامی نے سکتے ہوئے بتایا، تیندوا گھنی جھاڑیوں میں
ڈھکی ہوئی چٹان کی اوٹ میں چھپا تھا۔ جونہی جگو آگے بڑھا،
اس نے عقبی رخ سے جست کر کے اس پر حملہ کر دیا۔ اسے
سوچنے کا موقع ہی نہ ملا اور وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کے پیچھے
کی آواز سن کر میں لپکا مگر اس سے پہلے کہ میں جگو کی مدد کرتا،
تیندوا اس سرعت سے اس پر جھپٹا کہ پہلے ہی حملے میں اپنے
نوکیلے پنجے کے بھر پور وار سے اس کا بایاں رخسار ادھیڑا، دوسرا
پنچہ پیٹ پر یوں مارا کہ سارے کا سارا پھٹ گیا۔ تیندوے کا
وزن برچھے پر پڑا، تو وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نیچے
گرا اور تیندوے نے مجھے بھنبھوڑنا ہی چاہا تھا کہ جگو نے بندوق
کی لبلبی دبا دی۔ دھماکے سے دہشت زدہ ہو کر تیندوا بھاگ
کھڑا ہوا۔ وہ دونوں زخموں سے چور تھے اور چند منٹ بعد
دونوں نے دم توڑ دیا۔

☆☆

”یہ سب کچھ میری غلطی سے ہوا۔“ میں نے افسوس کرتے
ہوئے چھدامی کی بیوہ سے کہا۔
”نہیں مالک، تمہاری کیا غلطی؟ ان کی موت ایسے ہی لکھی

ت کا ذکر کر ہی رہا تھا کہ دو دیہاتی جو نمک خرید رہے تھے،
چونک پڑے۔

”یہ واردات کل دس گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی تھی؟“
ان میں سے ایک نے سوال کیا۔

”ہاں! شاید ساڑھے دس بجے تھے۔“
 ”پھر تو گڑ بڑ ہے۔“ اس نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بھگوان! اس کو آنا تو جو رہ تھا۔“

ان کے چہروں پر تشویش کے آثار دیکھ کر میں نے سبب پوچھا، تو انھوں نے بتایا کہ وہ یہاں سے پانچ میل دور، دیوری گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ گزشتہ شام ہمارے ایک ساتھی بھگوان دس کو ساتھ ہی پونڈی آنا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ وہاں مزے سے رام لیلا دیکھیں گے اور دھرمشالے میں شب گزار دوسرے دن کچھ نون تیل خرید کر ساتھ ہی دیوری واپس جائیں گے۔

”پھر بھگوان داس کہاں گیا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”اسے کوئی کام تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد روانہ ہونے کا وعدہ
 کیا تھا، مگر نجانے کیا بات ہے، آیا نہیں۔“

”کسی اور ضروری کام میں لگ گیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔
 ”نہیں! اسے جبرور آنا تھا۔ دیوری میں کوئی اور کام تھا بھی
 نہیں۔“ ان میں سے ایک بولا۔

چھوٹے لال پیسے کے یہاں کچھ دیر بیٹھ کر میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد تھانے پہنچا، وہاں نہر کا ایک جمعدار پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس نے بتایا، دیوری سے تقریباً دو میل دور نہر کی پٹری کے پاس جنگل میں اس نے ایک آدمی کی لاش دیکھی ہے۔ کسی درندے نے اسے کھایا ہے۔

اس نے جس مقام کا ذکر کیا، وہ اسی دائرے میں آتا تھا جہاں تیندوے کی موجودگی کا امکان تھا۔ جمعدار کے ساتھ ہم چھوٹے لال کی دکان پر آئے۔ اتفاق سے دیوری کے دونوں آدمی ابھی وہیں موجود تھے۔ ان سے بھگوان داس کا حلیہ پوچھا، تو نہر کے جمعدار کی دیکھی ہوئی لاش کے عین مطابق تھا۔

ہم کسی تاخیر کے بغیر جمعہ دار کی راہنمائی میں نہر کی پٹری پٹری لاش تک پہنچے۔ چہرہ قابل شناخت نہ تھا۔ آنتیں اور پیٹ کے ساتھ کمر کا کچھ حصہ بھی کھایا جا چکا تھا۔ چہرے، سینے اور گولہوں پر بھی گوشت باقی نہ بچا تھا۔ پھٹے ہوئے لباس اور کالے رنگ کی بندھی سے نکلنے والے تمباکو اور چوڑے کی ڈبیا سے لاش کی شناخت ہوئی۔ وہ بھگوان داس ہی تھا۔

دن ڈھل چکا تھا اور میرے اصرار پر لاش اسی جگہ چھوڑ دی گئی۔ میں نے نہر کنارے آم کے ایک موزوں درخت پر جلدی جلدی ایک مچان بنوائی اور سب کو رخصت کر کے اس میں چھپ گیا۔ دونوں دیہاتی، پولیس کا حوالدار، نہر کا جمعدار اور دو تین دوسرے آدمی جو پونڈی سے ساتھ آئے تھے، دیوری چلے گئے۔

جب میں چلا اس وقت دن تھا اور اس المناک سانحے کا گمان بھی نہ تھا۔ میں اپنے ساتھ نارچ نہ لایا تھا۔ پونڈی میں بھی اس کا خیال نہ آیا۔ اب اسے حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ تھا نہ وقت، چناں چہ میں نے اندھیرے ہی میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ بھگوان داس کی چونے کی ڈبیا کام آئی۔ اپنی نواہم ایم ماؤزراٹھل کی نالی دو دو انچ کے فاصلے پر چونے کی ٹپکیاں لگا دیں۔ دیدہ بان بھی سفید کر دیے کہ کچھ تو نظر آتے رہیں۔

تیندوے کے آنے کی امید کم تھی کیونکہ لاش کا بڑا حصہ کھایا جا چکا تھا، پھر بھی چند فیصد امید یوں بندھی کہ شاید اس نے حسب عادت صرف آنتیں اور پیٹ کھایا اور بقیہ گوشت دوسرے جانور حیث کر گئے ہوں اور اس رات گوشت کھانے وہ چلا آئے۔

سورج پہاڑ کی اوٹ میں اوجھل ہو رہا تھا، تاہم ابھی غروب نہ ہوا تھا کہ بارش پھر شروع ہو گئی۔ موسلا دھار بارش کے موٹے موٹے قطرے تڑا تڑ میری برساتی اور سر پر گرنے لگے۔ آم کے پتے سایہ نہ کیے ہوتے، تو وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔ اب گہرا اندھیرا ہو چکا تھا، اتنا گہرا کہ قریب رکھی ہوئی رائفل بھی نظر نہ آتی۔ میں نے اس کی نالی برساتی میں چھپالی تھی کہ چونکہ نہ جائے اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا، بارش تھم جائے۔

ساتھ ہی یہ بھی کہ بجلی برابر چمکتی رہے۔ وہی ایک روشنی تھی جس میں مجھے پندرہ گز دور پڑی بھگوان داس کی لاش نظر آ جاتی تھی۔

جنگل کا ماحول رات میں یوں بھی کیا کم بھیا نک ہوتا ہے، پھر برسات کی رات میں مسخ شدہ لاش کے احساس نے ماحول اور بھی دہشت ناک بنا دیا تھا۔ پھر لاش بھی ایسی مسخ کہ بغیر گوشت کا چہرہ کھانے کو آتا تھا۔ رات جوں جوں گزرتی رہی، دل کی دھڑکن تیز ہوتی چلی گئی۔ بارش دھیمی ہوئی، دور کہیں بھیڑ کے چیخنے کی آواز آئی۔ اب میرے کان کھڑے ہوئے اور نگاہیں لاش پر یوں مرکوز ہوئیں کہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے اوجھل کرنے کو تیار نہ تھیں۔

اچانک بجلی چمکی..... میں نے نہر کی پٹری پر ایک سایہ چلتا ہوا دیکھا۔ فوراً رائفل سنبھال لی مگر اس کے پیچھے تین چار اور بھی ویسے ہی سیاہ دھبے ریگتے ہوئے نظر آئے۔ ان کا رخ لاش کی جانب نہ تھا بلکہ وہ پٹری پٹری آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ یقیناً وہ سورتھے جو جنگل سے نکل کر کھیت اجاڑنے جا رہے تھے۔

اسی اثناء میں، میں نے لاش کے قریب ایک سایہ اٹتا دیکھا اور اسے رائفل کی زد میں لے کر بجلی چمکنے کا انتظار کرنے لگا۔ بد قسمتی سے بجلی چمکنے میں وقفہ لمبا ہو گیا اور جب وہ چمکی، تو یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ لاش غائب تھی۔ آس پاس کی جھاڑیوں میں بھی جھانکنے کی کوشش کی مگر نظر نہ آئی۔ ضرور تیندوا اسے اٹھا کر جھاڑیوں میں روپوش ہو گیا اور میری ساری محنت اکارت گئی۔

میں سخت الجھن میں تھا اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں؟ دفعتاً جھاڑیوں میں سے غرانے کی آواز آئی۔ پھر کوئی جانور گھبرا کر وہاں سے نہر کی جانب بھاگا۔ دوسرے ہی لمحے اندھیرے میں درندوں کی خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ میرے چپان کے عین نیچے تیندوے اور لگڑ بھگڑ کی لڑائی ہو رہی تھی۔ روشنی ہوئی، تو بڑا دلچسپ منظر سامنے آیا۔ لڑائی اس قدر تند و تیز تھی کہ تیندوا بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ بدلتا رہا اور مجھے گولی چلانے کا موقع نہ مل سکا۔

میں سمجھ گیا تھا لاش ہٹانے والے لگڑ بھگڑ ہیں اور ابھی شاید کھانا بھی شروع نہیں کر سکے تھے کہ دوسرے رخ سے تیندوا وارد ہوا۔ لاش کی حالت اور لگڑ بھگڑوں کی اس دریدہ جرات پر طیش میں آ گیا اور ان پر ٹوٹ پڑا۔ میں جانتا تھا، لگڑ بھگڑوں کو ہلاک کرنے سے پہلے ہی یہ جھاڑیوں میں چلے گئے، تو تیندوا کبھی ہلاک نہ کیا جاسکے گا۔ میرا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا اور امید و بیم کی کشمکش سوہان روح بنی ہوئی تھی۔

بجلی پھر چمکی۔ میں نے دیکھا، لگڑ بھگڑ ہار مان چکے تھے۔ ایسے حالات میں بالعموم شیر یا تیندوے اپنے شاہانہ وقار کو مجروح نہیں ہونے دیتے اور مقابل درندے کی جان بخشی کی التجا کو نہیں ٹھکراتے مگر تیندوا سخت غصے میں آپے سے باہر تھا۔

اب تیندوے نے اپنے پچھلے اور اگلے پیروں کا فاصلہ بڑھایا اور پیٹھ اور کمر اکڑا کر انگڑائی سی لی۔ میرے سامنے وہ آڑا پڑتا تھا اور یہ بات میرے لیے غیبی امداد سے کم نہ تھی، اس لیے کہ بغیر ٹارچ کے رائفل سے سر یا دل کو نشانہ بنانا قریب قریب ناممکن تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ انگڑائی کے ساتھ ہی تیندوا دھاڑ کر اپنی فتح کا نعرہ لگائے گا مگر یہ خدشہ بھی تھا کہ دھاڑتے ہی جست کر کے جھاڑیوں میں روپوش ہو جائے گا۔ میں نے اندازے سے اس کی بغل اور پسلیاں زد میں لیں اور ابھی اس کا فاتحانہ نعرہ گونجنے بھی نہ پایا تھا کہ میری رائفل کی گرج میں مدغم ہو کر رہ گیا۔ بجلی چمکی، لیکن تیندوے کا کوئی پتانہ تھا۔ شاید اُسے گولی نہیں لگی، میں نے سوچا، ویسے بھی ان نامساعد حالات میں گولی کا نشانے پر لگنا شاید ناممکن تھا۔

بوندیں پڑنی بند ہو چکی تھیں اور بادلوں کے درمیان اکاؤ کا تارے بھی نظر آنے لگے تھے۔ ابھی دو چار منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ قریبی جھاڑیوں میں غرانے کی خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ بالکل ویسی ہی جیسے تیندوے اور لگڑ بھگڑوں کی لڑائی کے وقت آئی تھیں۔ چار پانچ منٹ بعد پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں درخت پر بیٹھا دن نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔ سورج نکلنے

غزل

جس نے لوٹا دل ہمارا وہ ادا خاموش ہے
دل پہ دستک دی ہے جس نے وہ صدا خاموش ہے
آنکھ ہی سے کر رہا ہے وہ احتجاج بے رخی
تیرے در پہ آنے والا ہر گدا خاموش ہے
دیکھیے کس کرب سے گزری ہے اپنی زندگی
ابتدا نغمہ سرا تھی، انتہا خاموش ہے
خوشبوؤں سے مل رہا ہے اُس کے مسکن کا پتا
یوں تو کوئے یار کی باد صبا خاموش ہے
کس کو جا کے اب سنائیں داستان بے بسی
لٹ گیا مال و متاع لیکن خدا خاموش ہے
اعلیٰ ظرفی کی مثالوں سے بھری ہے کائنات
جو زمیں سیراب کر دے، وہ گھٹا خاموش ہے
یہ عجب ہے اتفاق قافلے کو لوٹ کر
مضطرب ہے راہزن اور راہنما خاموش
کاش آصف کو بھی حاصل ہوں کرامات کلیم
سانپ ہیں چاروں طرف پھر کیوں عصا خاموش ہے؟
(پروفیسر محمد آصف کھڑ، کہوٹہ)

اس سے ذکر کیا تھا کہ گونڈوں کی موت کی رپورٹ درج کرانے
پونڈی جاؤں گا۔ وہاں سے اسے میرا پتلا، تو خبر لینے دوڑتا ہوا
میرے پاس پہنچا۔ مجھے بخیر و خوبی پا کر خوشی سے اس کے آنسو
نکل آئے۔ لوگوں کی آمد کے بعد میں نے تیندوے کو منی رام کی
سائیکل کے کیرئیر پر لاد دیا کہ وہ اسی راستے سے اودھے پورہ آ
جائے۔ سائیکل کے ساتھ ہی یادگار کے طور پر اس کی اور
تیندوے کی تصویر اتاری۔ یہ شکار اسی کا تو تھا کہ سب سے پہلے
اسی کی شاٹ گن کا دانہ تیندوے کی ران پر لگا اور اسے زخمی کر گیا
تھا۔ یادگار باقی ہے۔ رہا منی رام، تو دوسرے ہی برس
ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر اپنی بہن شانتی سے جا ملا۔

کے بعد نیچے اترا اور بھری ہوئی رائفل سنبھالے نہایت محتاط
قدموں کے ساتھ ان جھاڑیوں کی جانب بڑھا جس طرف گولی
لگتے وقت تیندوے کا منہ تھا۔ ایسے مواقع پر تیندوہ اسی جانب
جست لگاتا ہے جدھر اس کا منہ ہو۔

میں ابھی دس گز بھی نہ گیا تھا کہ جھاڑی کے اندر تیندوہ بیٹھا
نظر آیا۔ اس نے اپنا سراگلے پنچوں پر ڈال رکھا تھا اور لہو لہان تھا۔
قریب ہی بھگوان داس کی لاش کے ٹکڑے ادھر ادھر اس طرح
پڑے تھے، گویا کسی نے کھاڑی سے کاٹ کر پھینک دیے ہوں۔
سر اور سینہ البتہ ابھی تک تیندوے کے اگلے پنچوں میں دبے
ہوئے تھے۔ اس نے اپنا سراغ غریب بھگوان داس کی لاش پر
ہی اتارا تھا۔ میں نے ایک پتھر اٹھا کر اس کی طرف پھینکا، تو
تیندوے نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ غنودگی میں ڈوبی آنکھیں
کھولیں، جن سے آنسو بہ رہے تھے۔ مجھے دیکھا اور سراپنے
پنچوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

شاید اس میں ملنے جلنے کی سکت نہ رہی تھی اور کوئی دم کا
مہمان تھا۔ پھر بھی اس کی شہرہ آفاق مکاری نے مجھے پس و پیش
کا موقع نہ دیا اور میری دوسری گولی اس کے ٹیکے پر پڑی۔ تقریباً
سات آٹھ گز سے گولی کا دھکا اتنا زبردست تھا کہ وہ اپنی جگہ سے
پڑے پڑے گھوم گیا۔ کھوپڑی کی بڈی کا چھوٹا سا حصہ گولی کے
ساتھ اڑ گیا اور بھیجے کے چیتھڑے بکھر کر جھاڑیوں سے چمٹ
گئے۔ پھر بھی بدن تھرتھرایا شاید اس وقت تک جان نہ نکلی تھی۔
میری پہلی گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔

میں نہر کی پٹری پر بیٹھا دیوری سے مدد کا انتظار کر رہا تھا
کہ سائیکل پر بندوق سنبھالے پونڈی کی طرف سے منی رام
تنہا آتا نظر آیا۔ مجھے اس لڑکے کی جرأت اور بے خوفی پر
حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔

وہ میرے رات بھر غائب رہنے کے سبب پریشان تھا۔ علی
الصباح اس نے سائیکل اور بندوق اٹھائی اور تین چار میل دور
ایک گھاٹی سے پہاڑی پار کر کے تنہا پونڈی پہنچا۔ شاید میں نے

سنگین حادثہ

پڑا۔ ایک شخص بھاگ کر قینچی لایا اور برقع کاٹ کر اسے موٹر سائیکل سے الگ کیا۔ میں نے ۱۱۲۲ کو فون کر کے کہا، فوری پہنچیں، حادثہ ہو گیا ہے۔

دس منٹ بعد ۱۱۲۲ والوں کی ایمبولینس آ گئی۔ اس کے ذریعے جناح اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ پہنچے، جہاں قیامت کا سماں تھا۔ ایک بستر پر دو تین مریض پڑے دیکھے۔ بڑی مشکل سے ایک بستر ملا جس پر ایک بچہ پہلے سے موجود تھا۔ اس پر مریضہ کو لٹا دیا گیا۔ اس دوران ڈاکٹر آئے اور دیکھ کر چلے گئے۔

پھر ایک نوجوان ڈاکٹر، کاشف سلطان تشریف لائے جن کا تعلق شعبہ نیوروسرجری سے تھا۔ انھوں نے سی ٹی اسکین، ایکسرے اور الٹراساؤنڈ کرانے کے لیے کہا تا کہ ان کی رپورٹیں دیکھنے کے بعد باقاعدہ علاج شروع ہو سکے۔ اس سارے عمل میں دو گھنٹے گزر گئے تب کہیں جا کر علاج شروع ہوا۔ مریضہ کی

میری بیگم سیاست کی بھینٹ چڑھ گئی

سرکاری اسپتال میں بیتی ایک دلخراش داستان

عمران ظہور غازی

مئی ۲۰۱۵ء بروز جمعرات کو میں ملتان روڈ لاہور پر بیگم کے ہمراہ موٹر سائیکل پر سوار جا رہا تھا۔ اچانک پچھلے پہیے میں برقع پھنسنے کی وجہ سے بیگم سڑک پر گر گئیں۔ ان کے سر پر شدید چوٹ لگی۔ نتیجے میں سر سے خون کا فوارہ پھوٹ



کیا کر رہے ہیں، نہ مریض کو معلوم ہوتا اور نہ اس کے رشتے داروں کو! مشورہ اور راہنمائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اگر کوئی اپنے مریض کے بارے میں پوچھ لیتا تو ڈاکٹر، بلکہ نرسوں اور دوسرے عملے کی ڈانٹ سننا پڑتی۔ چنانچہ آئی سی یو میں کئی کئی گھنٹے مریض بے یار و مددگار پڑے رہتے۔

اس دوران میرے ایک ڈاکٹر دوست جو نیشنل گارڈ اسپتال، ریاض، سعودیہ میں کام کرتے ہیں، مریضہ کو روزانہ دیکھنے آنے لگے۔ وہ مفید مشوروں سے نوازتے، حوصلہ دیتے اور اس دوران ڈاکٹر کے ساتھ بات چیت بھی کرتے۔ انھوں نے ڈاکٹر سید شہزاد حسین، اسسٹنٹ پروفیسر کے ساتھ متعدد نشستیں کیں، لیکن یہ سب کچھ ہمارے کچھ کام نہ آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ کی اہلیہ اسپتال کی داخلی سیاست کا شکار ہیں۔

مریضہ کی حالت ڈاکٹروں کی جبرمانہ غفلت کے باعث خراب سے خراب تر ہو رہی تھی۔ ہم نے کوشش کی کہ کسی طرح مریضہ مرکزی آئی سی یو (Main ICU) میں منتقل ہو جائے مگر ہماری تمام تر سفارش اور کوشش کے باوجود ایسا نہ ہو سکا۔ سرجری کے لحاظ سے مریضہ کی صورت حال بہتر تھی اور اس کا کوئی آپریشن نہیں ہونا تھا۔ بس سینے میں چھوت کے باعث سانس لینے میں دشواری تھی، لیکن تمام عرصے میں اس کا علاج نہیں کیا گیا۔ اسی صورت حال کے پیش نظر ہم نے ڈاکٹروں سے کہا کہ ہمیں مرکزی آئی سی یو بھجوادیں جہاں امراض سینہ کے ماہرین موجود ہیں، مگر اس منتقلی کو شعبہ نیوروسرجری والوں نے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آپ نے مریضہ کو منتقل کرنا ہے، تو جنرل اسپتال یا سروسز اسپتال لے جائیں۔

اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۱۸ مئی کو وفاقی وزیر ریلوے جناب خواجہ سعد رفیق اور صوبائی مشیر صحت جناب خواجہ سلمان رفیق کو جماعت اسلامی کے ترجمان جناب امیر العظیم اور امیر جماعت اسلامی ضلع لاہور، جناب میاں مقصود احمد نے متوجہ کیا۔ انھوں نے ایم ایس جناح اسپتال، ڈاکٹر ضیاء اللہ کو

حالت تشویش ناک تھی۔ اگلے روز ۸ مئی کو ہم لوگ شعبہ نیوروسرجری کے ایچ ڈی یو (High dependency Unit) منتقل ہو گئے۔ مریضہ صبح ہوش میں آ گئی۔ اس کی آنکھیں اور ہاتھ کام کر رہے تھے۔ ہاتھ لگانے سے وہ لمس محسوس کرتی تھی۔ اس دوران وہ بولنے کی کوشش کرتی رہی، مگر کامیاب نہ ہو پائی۔ ایچ ڈی یو میں دو روز مزید گزر گئے۔ اس دوران وہ اشارے سے بتاتی رہی کہ سینے میں شدید درد ہے۔ ہم ڈاکٹروں کو بلا تے اور کہتے رہے کہ اسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے، مگر ہمیں یہ جواب دیا گیا ”ڈاکٹر آپ ہیں یا ہم، ان کا ٹھیک علاج ہو رہا ہے۔“ ہم سوائے خاموشی کے کچھ نہ کر سکے۔

تین روز بعد ہمارے اصرار پر جب باہر سے آکر ڈاکٹر نے ڈیجیٹل ایکسرے کیا، تو معلوم ہوا کہ ان کی پسلیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ ایچ ڈی یو کے ڈاکٹروں کو یہ معلوم ہوا کہ مریضہ کی پسلیاں فریکچر ہیں، تو انھوں نے انھیں فوری طور پر بے ہوش کر کے وینٹی لیٹر پر ڈال دیا۔ اس دوران دو مرتبہ وینٹی لیٹر رک گیا۔ اس اثنا میں ہمیں بتایا گیا کہ اسپتال میں مہیا کی جانے والی ادویات کم معیار کی ہیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو باہر سے منگوائیں۔ لہذا اس روز تک ہم ادویات باہر سے خریدتے رہے۔

میں نے دیکھا کہ جب ہم نرسوں کے پاس چوتھی منزل تک واپس پہنچتے، تو وہ ایک اور چٹ لکھ رکھتیں تاکہ مریض کے لواحقین کام میں مصروف رہیں۔ یہ مریض کے پاس رہیں گے تو ہمیں ”ڈسٹرب“ کریں گے۔ اس دوران دیکھا کہ شعبہ نیوروسرجری کے آئی سی یو میں ڈیوٹی دینے والے ڈاکٹر اور نرسیں جونیئر ہیں اور ان کا تجربہ نہ ہونے کے برابر۔ اس دوران جن ڈاکٹروں سے واسطہ پڑا وہ بھی مریضوں کے رشتے داروں سے جھگڑتے ہی نظر آئے۔ وہ اپنی گفتگو، چال ڈھال کے اعتبار سے ڈاکٹر کم لگتے، نا تجربے کار طالب علم زیادہ!

یہ عجیب و غریب بات دیکھنے میں آئی کہ جب ڈاکٹروں کا راؤنڈ ہوتا، نرسیں تیمار داروں کو باہر نکال دیتیں۔ اب ڈاکٹر اندر

سفارش کی۔ رات ۱۱ بجے اسپتال کے سینئر معالجین، ڈاکٹر ادریس اور ڈاکٹر عزیز اللہ کے فون آئے۔ ڈاکٹر عزیز اللہ نے پھر دورہ کیا۔ انھیں تفصیلی صورت حال بتائی مگر عملی طور پر کچھ نہ ہوا۔

۱۹ مئی کو سورج طلوع ہوا تو میں ایم ایس کے دفتر پہنچا، اذن باریابی ملا تو حاضر ہوا۔ ان سے سارا مدعا بیان کیا اور کہا کہ ہم مریضہ کی حالت، ڈاکٹروں کی غلط تشخیص اور رویے کے سبب اسے مرکزی آئی سی یو میں لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن انھوں نے کوئی مثبت جواب نہ دیا اور مجھے ٹال دیا۔ میں اپنی بے بسی پر آنسو بہاتا باہر نکل آیا۔ اس دوران محترم لیاقت بلوچ، سیکرٹری جنرل جماعت اسلامی پاکستان نے دوبارہ ایم ایس کو فون کیا۔

مغرب کے بعد ڈاکٹر سید وسیم اختر رکن صوبائی اسمبلی مریضہ کو دیکھنے ایک سو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے کہ لفٹ بند تھی۔ یہ ان کے ساتھ دوسری بار ہوا تھا۔ انھوں نے ایم ایس کے ساتھ تفصیل کے ساتھ بات کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ مشیر صحت پنجاب، جناب خوجہ سلمان رفیق تشریف لائے۔ ہم نے انھیں ساری

تفصیل بتائی اور کہا کہ ہماری مریضہ کا اصل مسئلہ اب دماغ سے زیادہ سینے کی چھوت کا ہے۔ اس وجہ سے ہم انھیں مرکزی آئی سی یو میں لے جانا چاہتے ہیں، مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے پات۔ اسی رات پونے بارہ بجے میری بیگم ڈاکٹروں کی بے بسی اور خواجہ سلمان رفیق کی بے بسی پر آنسو بہاتی اللہ کے پاس چلی گئی۔

ہم اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔ لیکن میں سوچتا ہوں، اگر اتنی تگ و دو کے بعد بھی ہم اپنی مریضہ کو مرکزی آئی سی یو میں منتقل نہ کرا سکے، تو وہ عام لوگ جو اپنے مریض راجن پور، مظفر گڑھ اور ڈی جی خان وغیرہ سے لاتے ہیں، ان کے ساتھ کیسا ظالمانہ سلوک ہوتا ہوگا۔ یہ کیفیت وزیر اعلیٰ پنجاب کی خصوصی توجہ کی

متقاضی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ شعبہ صحت حکومتی ترجیح میں کس نمبر پر ہے۔

خادم اعلیٰ پنجاب سے اپیل ہے، میسٹر اور گرین ٹرین کے منصوبے بھی بنائیے، لیکن اس سے پہلے سرکاری شعبہ صحت بہتر بنانے کی طرف توجہ دیں۔ اسپتالوں کی حالت زار کا معائنہ کریں، آپ کو پتا چلے گا کہ سرکاری اسپتال ڈاکٹروں کی سیاست کی آماجگاہ بن چکے نا کہ علاج گاہ۔ اگر ایک دکھی اور ان غیر ذمے دار ڈاکٹروں کا ڈسا ہوا انسان یہ کہے کہ یہ اسپتال نہیں قتل گا ہیں ہیں، تو اس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔

☆☆

ڈاکٹر محمد خان کی ماہرانہ رائے ڈاکٹر محمد خان نے قائد اعظم میڈیکل کالج بہاولپور سے ایم بی بی ایس کیا۔ اس کے بعد پاکستان کے مختلف اداروں میں خدمات انجام دیں۔ ۲۰۰۶ء سے نیشنل گارڈز اسپتال، ریاض (سعودی عرب) کے شعبہ آئی سی یو سے وابستہ ہیں۔ درج ذیل طور



عمران ظہور غازی

ان کی ماہرانہ رائے پر مبنی ہیں:

میں بڑے دکھ کے ساتھ یہ سطور تحریر کر رہا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے صحت کی بنیادی سہولیات کی فراہمی حکومت پنجاب کی ترجیحات میں سرے سے شامل ہی نہیں۔ میں اب شاہدہ عمران کے حوالے سے چند حقائق بیان کرتا ہوں کہ وہ کیسے جناح اسپتال کی انتظامیہ اور ڈاکٹروں کی غفلت کی وجہ سے موت کے منہ میں چلی گئیں۔ (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے)

مرحومہ موٹر سائیکل کے حادثے میں زخمی ہوئی تھیں۔ انھیں دماغ، پسلیوں اور چھاتی کے مختلف حصوں میں معمولی

چوٹیں آئیں۔ مگر سینے کی چھوت کے باعث وہ چل بسیں کیونکہ اس کا علاج ہی نہیں کیا گیا۔ یہ بہت دکھ اور صدمے کی بات ہے کہ ہمارے ڈاکٹر اپنی نااہلی کے باعث زندہ انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں۔ وہ مریض جنہیں باسانی بچایا جاسکتا ہے، وہ بھی ان نیم حکیموں کے ہاتھوں جان کی بازی ہار جاتے ہیں۔ اس حوالے سے چند حقائق پیش خدمت ہیں:

۴۔ یہ دنیا کا واحد آئی سی یو ہے جہاں متعدد امراض کا پھیلاؤ روکنے کے لیے کوئی احتیاطی تدابیر نظر نہیں آتی۔
۵۔ آئی سی یو میں مریضوں کو وینٹی لیٹر پر تو رکھا جاتا ہے، لیکن انہیں چلانے کے لیے تربیت یافتہ عملہ موجود نہیں۔
۶۔ اس آئی سی یو میں کوئی بھی ڈاکٹر متعدد امراض کا ماہر نہیں اور مریضوں کو غلط اینٹی بائیوٹکس دوائیں تجویز کی جا رہی ہیں۔

۷۔ مریض کی موت کے بعد میٹنگ کی کوئی روایت نہیں۔ حالانکہ ہر اسپتال میں مرض اور مریض کی موت کے اسباب جاننے کے لیے میٹنگ ہوتی ہے۔ میرے خیال میں یہاں ڈاکٹروں کے پاس لوگوں کو مارنے کے سرٹیفکیٹ مل چکے۔
۸۔ مریض کے رشتہ داروں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک ہوتا ہے۔ انہیں مریض کے بارے میں بنیادی معلومات ہی نہیں دی جاتیں اور نہ ہی اس حوالے سے کوئی راہنمائی ملتی ہے۔

۱۔ جناح اسپتال کے آئی سی یو میں کام کرنے والی تمام نرسیں نہ صرف تربیت سے نابلد بلکہ شعبے کے بارے میں بنیادی معلومات نہیں رکھتیں اور انتظام و انصرام سے بھی قاصر ہیں۔
۲۔ آئی سی یو میں کام کرنے والے تمام ڈاکٹر نیوروسرجیکل کے حوالے سے بنیادی تربیت کے حامل نہیں۔
۳۔ دنیا بھر میں آئی سی یو میں ڈاکٹر زچوبیس گھنٹے موجود رہتے ہیں، لیکن یہ دنیا کا واحد آئی سی یو ہے جہاں ڈاکٹر صرف صبح کے وقت نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد مریضوں کو دیکھنے کوئی ڈاکٹر نہیں ملتا۔

کون ہے جو مجھ سے سیکھ لے یہ خاص باتیں.....

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک دن ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: کون ہے جو مجھ سے سیکھ لے یہ چند خاص باتیں۔ پھر وہ خود ان پر عمل کرے یا دوسرے عمل کرنے والوں کو بتائے؟ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ میں حاضر ہوں تو آپؐ نے (ازراہ شفقت) میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لے لیا اور گن کر یہ پانچ باتیں بتائیں، فرمایا:

- ۱۔ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دی ہیں ان سے بچو اور ان سے پورا پورا پرہیز کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا، تو تم بہت بڑے عبادت گزار ہو (اور یہ عبادت نفلی عبادت کی کثرت سے افضل ہے)۔
- ۲۔ اللہ تعالیٰ نے جو تمھاری قسمت میں لکھا ہے، اس پر راضی اور مطمئن ہو جاؤ۔ اگر ایسا کرو گے، تو تم بڑے بے نیاز اور دولت مند ہو جاؤ گے۔
- ۳۔ اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو۔ اگر ایسا کرو گے، تو تم کامل مومن ہو جاؤ گے۔
- ۴۔ جو تم اپنے لیے چاہتے اور پسند کرتے ہو، وہی دوسرے لوگوں کے لیے بھی چاہو اور پسند کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے، تو حقیقی مسلم اور پورے مسلمان ہو جاؤ گے۔

۵۔ زیادہ مت ہنسنا کرو کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔

(مسند احمد، ترمذی)

معاشرت

یہ مضمون تھا اس شادی کارڈ کا جو ہمیں موصول ہونے والے کارڈوں کے ڈھیر میں سب سے اوپر ملا۔ بفضل تعالیٰ میرا حلقہ احباب بہت وسیع ہے اور برادری بھی اچھی خاصی بڑی۔ اس لیے تقریباً ہر روز کسی نہ کسی تقریب کا دعوت نامہ آیا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ کے سیزن میں، تو ان کی تعداد بعض اوقات دگنی ہو جاتی ہے۔ ایک انار سو بیمار والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے میں ہر تقریب میں حاضر نہیں ہو سکتا، اس لیے کسی میں چلا جاتا اور کبھی معذرت کر لیتا ہوں۔

بہر حال ڈاکٹر محمد افضل میرے گہرے دوست ہیں بلکہ بعض احباب تو ہماری دوستی کو پاک چین دوستی یا وحید مراد اور احمد رشدی کا ساتھ قرار دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے بیٹے کی شادی میں شرکت بے حد ضروری تھی۔

مجھے معلوم ہے کہ آج کل پابندی وقت کا تصور ہی ختم ہو چکا، اس لیے اکثر لوگ وقت پر آنے والوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں، لیکن میں ڈاکٹر محمد افضل کی طبیعت سے

رب العزت کا شکر ہے جو رشتوں کو جوڑتا ہے اور جس نے ہمیں یہ سعادت نصیب فرمائی کہ ہم اپنے پیارے بیٹے عبدالاحد افضل سلمہ کو شادی کے حسین بندھن میں منسلک کر سکیں۔ اس سنت نبوی ﷺ کی تکمیل کی خوشی اور ان دل پذیر ساعتوں میں ہم آپ کی رفاقت کے متمنی ہیں۔“

جیسی کرنی ویسی بھرنی

مال کی ہوس نے انھیں دنیاوی نعمتوں سے دور کر دیا..... ایک سبق آموز واقعہ

ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل



واقف ہوں کہ پابندی وقت کی صفت انھیں اپنے والد حاجی اکبر علی سے ورثے میں ملی ہے۔ ملتان کے سابق ڈی سی او نسیم صادق نے رات ۱۰ بجے شادی ہال بند کرنے کا جو بہت اچھا حکم دیا تھا، اسے نئے آنے والے ذیشان زاہد سلیم گوندل نے بھی برقرار رکھا۔

میں مقررہ وقت شادی ہال پہنچ گیا۔ جب تک شادی بیاہ اور خوشی غم کی تقریبات گھر پر ہوتی تھیں، ان کا اپنا ہی لطف اور اپنائیت کا احساس تھا۔ کئی روز پہلے سے مہمان میزبان کے گھر ڈیرے ڈال دیتے۔ بڑوں میں ہر کام کو احسن طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مشاورت ہوتی۔ نو جوان تایا زاد، پھوپھی زاد، خالہ زاد، ماموں زاد بھائی بھاگ بھاگ کر کام کرتے۔ عورتیں سلائی کڑھائی، کشیدہ کاری، گونا گونا کناری سے فارغ ہوتیں، تو ڈھولک سنبھال لیتیں اور تانور جہاں سے شروع کر کے حمیرا ارشد سے ہوتی ہوئی نصیبو لعل پر دم لیتیں۔ اب ساری تقاریب شادی ہالوں میں ہوتی ہیں۔ خود میزبان بھی مہمانوں کی طرح آتے، کھانا کھاتے اور چلے جاتے ہیں۔

میں جب ہال میں پہنچا، تو اچھے خاصے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ میں ایک قریبی میز کے ساتھ خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اپنے ارد گرد بیٹھے افراد کا جائزہ لیا۔ دو تین بچے ہر شے سے بے پروا اپنی شرارتوں میں مگن تھے۔ دو نو جوان اپنے موبائل پر فیس بک کھولے اس میں کھوئے بیٹھے تھے۔ وہ تو اللہ جانے خود کو کیا سمجھے بیٹھے تھے لیکن ان کا حلیہ دیکھ کر میں نے اپنی ہنسی کو بمشکل دبایا۔ ایک ایک کان میں مندری، بالوں کے سپانکس نکالے ہوئے اور ہاتھوں میں ربڑ بینڈ۔

ان نو جوانوں کے ساتھ بیٹھے دو اصحاب کی عمروں کا میں نے اندازہ لگایا کہ ستر کے پیٹے میں ہوں گے۔ پیٹے سے یاد آیا دونوں کے اتنے بڑے پیٹ تھے کہ اگر وہ موٹر سائیکل میں پٹرول ڈلوانے کے لیے جاتے ہوں گے، تو پمپ والا پوچھتا ہوگا:

”کون سی ٹینکی فل کرنی ہے؟“

باتوں باتوں میں پتا چلا کہ دونوں صاحبان کی غلہ منڈی میں آڑھت ہے۔ دوران گفتگو یہ جان کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ان میں سے ایک کی عمر ۴۵ سال اور دوسرے کی ۴۸ سال ہے۔ ۴۵ سالہ صاحب کا نام پرویز تھا اور ۴۸ سالہ کا فیروز۔

پرویز کہنے لگا ”اس دفعہ کاسینز کیسار ہا؟“
فیروز نے کہا ”بس ٹھیک ہی رہا۔ تین مہینوں میں پانچ لاکھ بچے ہیں۔“

پرویز نے کہا ”بھائی ہم نے تو کھلا کھاپی کہ تین مہینوں میں ۸ لاکھ بچائے ہیں۔ ہمارا ون پلس ون کا فارمولہ بڑا کامیاب جا رہا ہے۔“

فیروز نے پوچھا ”یار ہمیں بھی تو بتاؤ وہ ون پلس ون فارمولہ۔“

پرویز نے کہا ”آج کل شادی بیاہ کاسینز ہے۔ اکثر گاہک چاول لینے آتے ہیں۔ میں انھیں چاول دکھاتا ہوں درجہ اول سپر کرنل باسستی۔ ریٹ طے کرنے کے بعد وہ ہاں کر دیں، تو انھیں گودام سے ون پلس ون کی بوریاں اٹھوا دیتا ہوں۔“

فیروز نے پوچھا ”یہ ون پلس ون ہے کیا بلا؟“
”ایک بوری ۱۲۰ والے چاول اور ایک بوری ۴۵ والے کی..... دونوں کو اچھی طرح ملا دیتا ہوں۔ یہ ہے ون پلس ون!“ پرویز نے خباثت سے ہنستے ہوئے کہا۔

فیروز نے بھی اسی انداز میں ہنستے ہوئے پرویز کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ”مان گئے استاد، تو بڑی شے ہے۔“

اتنی دیر میں ایک نو جوان اس طرف آیا۔ پرویز نے اس سے پوچھا ”ہاں بیٹا پورٹیں لے آئے؟ کیا ہے ان رپورٹوں میں؟“

لڑکے نے کہا ”ابا جی، پہلے تو صرف آپ کے بلڈ پریشر کا مسئلہ تھا۔ اب شوگر ہے اور بلڈ کولیسٹرول بھی بلند ہے۔ ای سی جی گڑبڑ ہے اور جگر کا بھی مسئلہ ہے۔“

پرویز نے کہا ”پتا نہیں یہ ہر بیماری نے ہمارا ہی گھر کیوں دیکھ لیا؟“

اقوال ابن رشد

☆..... طالب دنیا اس پیاسے کی طرح ہے جو سمندر کے پانی سے اپنی پیاس بجھا رہا ہو۔ جتنا پیسے گا، پیاس اتنی ہی بڑھے گی اور بالآخر ہلاک ہو جائے گا۔
☆..... کتنا خوش قسمت ہے وہ انسان جس کی زندگی کا انجام اس کے آغاز جیسا ہو۔
☆..... غماز ایک لمحے میں ایک سال کا فتنہ اٹھا سکتا ہے۔
(مرسلہ: اولیس سکندر، دیپالپور)

نیارے ہو جائیں گے۔

”بادل گر جا، بجلی چمکی، بوندیں ٹپکیں اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اولے پڑنے لگے اور ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ پہاڑوں سے پانی کا سیلاب اتر آیا اور اس شدت سے بڑھا کہ گوالے کی ساری گائیں اور جو کچھ گھر میں تھا، بہا کر لے گیا۔ اب گوالے کے پاس نہ گائیں تھیں نہ نقدی۔ پریشان تھا اور گھبراہٹ میں ہر ایک سے کہتا پھرتا:

”میں نے ایسا سیلاب نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ معلوم نہیں اتنا پانی کہاں سے آگیا؟“

”ایک عقلمند نے سنا، تو کہا ”یہ وہی پانی ہے جو تم دودھ میں ملایا کرتے تھے۔ خدا نے اسی پانی کو سیلاب بنایا اور تمہیں بے ایمانی اور بددیانتی کی سزا دی۔“

میں نے دیکھا کہ پرویز کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ میں نے رد عمل کی پروا کیے بغیر کہا ”بھائی جی برا نہ ماننا، آپ کی حالت آپ کے ون پلس ون کاروبار کا نتیجہ ہے۔“

اتنی دیر میں کھانا لگ گیا۔ مجھ سمیت بہت سے لوگ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ جبکہ پرویز اور اس جیسے کچھ لوگ ون پلس ون کے چکر میں کسٹرڈ، فیرنی، کھیر، مٹھائی، شامی کباب، بریانی اور اللہ جانے کتنی نعمتوں کو اپنی زندگی سے نکالے بیٹھے تھے۔

یہ سن کر مجھے رسول پاک کا فرمان عظمت نشان یاد آگیا ”اگر تم میں سے کوئی برائی دیکھے، تو اسے ہاتھ سے روکے، اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے برا کہے، اس کی طاقت بھی نہ ہو تو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔“
میں نے انھیں مخاطب کیا اور کہا ”اگر آپ محسوس نہ کریں، تو ایک بات کہوں؟“

پرویز نے کہا ”جی فرمائیے۔“
میں نے کہا ”میں ایک چھوٹی سی پرانی کہانی سنانا چاہتا ہوں جو میں نے میٹرک کی اردو قواعد و انشا کتاب میں پڑھی تھی۔“
پرویز نے ہنکارا بھرا ”جی۔“

”ایک گوالا پہاڑ کے دامن میں رہتا تھا۔ دن بھر گائیں گھاس چرتی رہتیں۔ شام سے ذرا پہلے وہ دودھ دوہتا اور اس میں بہت سا پانی ملا دیتا۔ قریب ہی ایک قصبہ تھا، شام کے اندھیرے میں وہ دودھ لے جاتا اور خالص دودھ کی صدا لگا کر بیچ دیتا۔ جو رقم ملتی، اس سے ضرورت کی چیزیں خریدتا اور واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا۔“

”گا بہ اکثر شکایت کرتے کہ دودھ پتلا ہے اس میں پانی نہ ملایا کرو مگر گوالا تھا کہ ایک کان سنتا، اس کان سے اڑا دیتا اور یہی کہتا: ”دودھ خشک تو ہوتا ہی نہیں۔ دودھ میں پانی کی ملاوٹ قدرتی امر ہے۔ میں پانی ملانے والا کون ہوں؟“

اسی طرح ایک عرصہ گزر گیا۔ گوالے کے پاس بہت سا روپیہ جمع ہو گیا اور اسے اپنی دولت مندی کا احساس ہونے لگا۔ اب وہ تن کر چلتا اور اینٹھنا اینٹھنا پھرتا۔ کسی کی شکایت پر کان نہ دھرتا۔ لالچ بڑھتا گیا اور وہ دودھ میں پہلے سے زیادہ پانی ملانے لگا۔

”ایک دن یکا یک سیاہ گھٹا اٹھی، بڑھی، پھیلی اور آسمان پر چھا گئی۔ سورج کو اپنی لپیٹ میں لیا اور ہر طرف تاریک شامیانہ تن دیا۔“

”گوالا بہت خوش ہوا کہ اب مینہ برسے گا، گھاس بڑھے گی، گائیں کھا کر زیادہ دودھ دیں گی۔ بس وارے

قبول اسلام

فوجا سنگھ اور اس کی بیوی بسنت کور کو اپنے اکلوتے بیٹے سے بہت پیار تھا۔ وہ ان کے مربعوں اور جائیداد کا وارث ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی امیدوں کا سہارا بھی تھا۔ ماں باپ نے بڑے چاؤ سے گور بچن سنگھ کو تعلیم دلائی۔ اس کی پرورش اور نگہداشت کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے فیصل آباد (لاٹل پور) کی زرعی یونیورسٹی میں داخل کرایا۔ یونیورسٹی میں نوجوان گور بچن سنگھ تعلیم پا رہے تھے کہ ایک دن ہم جماعت میاں عبداللہ کے ہمراہ ان کی ترغیب پر پیرسا میں غلام

روڈ پر چک نمبر ۲ ج ب رام دیوالی سے ذرا آگے نہر جھنگ برانچ کے دوسرے کنارے پر ایک گاؤں بوڑے وال آباد ہے۔ تقسیم ہند سے قبل اسی گاؤں میں ایک سکھ سردار فوجا سنگھ رہتا تھا۔ وہ علاقے کا بڑا زمیندار، نمبردار اور سرکردہ شخص تھا۔ اس کی بیوی بسنت کور کی گودہری ہونے کے دن آنے کو تھے۔ اس نے خواب میں ایک بزرگ صورت شخصیت کو دیکھا۔ بسنت کور کا کہنا ہے کہ خواب میں وہ آٹا گوندھ کر فارغ ہوئی تو بزرگ نے کہا ”ایک پیڑ الگ سے رکھ لینا جو ہمارے لیے ہوگا۔“ بات آئی گئی ہو گئی۔ بیٹا پیدا ہوا، تو اس کا نام ماں باپ نے گور بچن سنگھ رکھ دیا۔

سردار گور بچن سنگھ سے

اقبال حسین علیم بننے تک

ایک تعلیم یافتہ اور امیر سکھ کے مسلمان بننے کی ایمان افروز کہانی

ریاض احمد پرواز



محمد المعروف امام جلوئی سے ملے۔ بقول علامہ اقبالؒ

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

گورنجن سنگھ پر مردِ کامل کی نگاہ اثر کر گئی۔ رات کو وہ اپنے گاؤں بوڑے وال پہنچا، تو اس کی حالت متغیر تھی۔ ماں باپ کو پریشانی ہوئی۔ حال احوال پوچھا۔ انھوں نے سوچا کہ کسی نے ان کے بیٹے پر جادو ٹوٹا کر دیا ہے۔ چنانچہ ساری رات فوجا سنگھ اور بسنت کور نے اپنے اکلوتے بیٹے پر پہرہ دیا۔ صبح کو دوبارہ والدین نے بیٹے سے دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ کہ وہ اپنے ایک مسلمان ہم جماعت کے ساتھ مسلمانوں کے ایک گرو سائیس امام جلوئی سے ملے ہیں۔ جس کے بعد ان کے جسم میں جھر جھری آئی اور سینہ منور ہو گیا۔

والدین نے گورنجن سنگھ کو ساتھ لیا اور مسلمانوں کے اس گرو کے پاس پہنچے اور صورت حال کچشم خود دیکھی۔ بعد ازاں والدین نے بہت سمجھایا کہ بیٹا اپنے مذہب ہی پر قائم رہو، لیکن گورنجن سنگھ مسلمان ہو گیا۔ حضرت امام جلوئی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا نام محمد اقبال حسین رکھا، جسے وہ اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ ہر طرح سے ان کا لحاظ رکھتے اور روحانی تربیت کرتے رہے۔ کچھ عرصے بعد محمد اقبال حسین کو شاعری سے شغف ہو گیا۔ چنانچہ نام کے ساتھ علیم لاحقہ بطور تخلص نام کا جزو بن گیا۔ مرید خاص نے بھی ہر طرح سے اپنے مرشد کی خدمت میں دن رات ایک کر دیے اور ان سے فیض یاب ہوتے رہے۔

مسلمان ہونے سے قبل ان کی دو بیویاں تھیں جن سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تولد ہوئی تھیں۔ سکھوں کی روایت کے خلاف ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ اسی اثنا میں تقسیم ہند کے نتیجے میں پاکستان معرض وجود میں آیا۔ تب محمد اقبال حسین علیم کے والدین فوجا سنگھ اور بسنت کور کے علاوہ دونوں بیویاں اور پانچ بچے بھی بھارت منتقل ہو گئے۔ لیکن محمد اقبال حسین علیم نے بھارت جانے سے انکار کر دیا۔ فوجا سنگھ بڑے زمیندار تھے اور بارسوخ شخصیت بھی چنانچہ حکومتی سطح پر انھوں نے معاملہ اٹھایا اور پاکستان حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس کے بیٹے کو بھارت بھیجا جائے۔

معاملہ کمشنر مہاجرین کے پاس لاہور آیا جہاں محمد اقبال حسین علیم کو بلایا گیا۔ چنانچہ وہ اپنے پیر امام جلوئی کے ہمراہ لاہور گئے۔ پیر صاحب عدالت سے باہر رہے اور اقبال حسین علیم عدالت میں حاضر ہوئے۔ ان سے سوال کیا گیا ”گورنجن سنگھ! بتاؤ کیا بات ہے، بھارت کیوں نہیں گئے کیا تم کو کسی نے زبردستی روکا ہوا ہے؟“

انھوں نے بتایا ”میں گورنجن سنگھ نہیں ہوں۔ اب میرا نام محمد اقبال حسین علیم ہے۔ میں اپنی مرضی سے مسلمان ہوا ہوں اور اپنی رضامندی سے پاکستان میں مقیم ہوں۔ چنانچہ بھارتی حکومت کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔ فوجا سنگھ نے بوڑے وال میں واقع اپنی زرعی اراضی کا کلیم بھارت میں جا کر داخل کر دیا۔ اس طرح بوڑے وال کی زمین مہاجرین کے لیے وقف ہو گئی۔ روایت کے مطابق گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر کے حکم سے ان کی وراثتی زمین میں سے دو مربع اراضی خصوصی طور پر محمد اقبال حسین علیم کے نام منتقل کر دی گئی۔ حالانکہ اس زمین کا کلیم بھارت میں ان کے والد فوجا سنگھ حاصل کر چکے تھے۔

کچھ عرصے بعد سائیس امام جلوئی کے حلقہ ارادت میں شامل افراد نے پیر صاحب سے گزارش کی کہ اقبال حسین علیم کی شادی کہیں کرادی جائے۔ جواب میں انھوں نے فرمایا کہ کوئی عام عورت محمد اقبال حسین کے شایان شان نہیں، ان کے لیے کسی بادشاہ زادی کی ضرورت ہے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ اس دوران محمد اقبال حسین نے امریکی یونیورسٹی کے اسکالرشپ پروگرام کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے کی اجازت طلب کی۔ حضرت امام جلوئی نے بخوشی اجازت دے دی۔ امریکا میں کننگی یونیورسٹی سے انھوں نے مائیکرو بیا لوجی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اسی یونیورسٹی میں انھیں پروفیسر بنادیا گیا۔

بعد ازاں وہ یونیورسٹی کے وائس چیرمین بھی رہے۔ مشہور امریکی شخصیات یونیورسٹی میں تدریس کے دوران ان کی شاگرد رہیں۔ ان میں بہت سے سینیٹروں کے علاوہ سابق امریکی صدر

بل کنٹنن بھی شامل ہیں۔ یوں انھوں نے امریکا میں قیام کے دوران اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ یونیورسٹی میں تعلیم پاتے ہوئے ان کی ملاقات ترکی کے بابائے قوم مصطفیٰ کمال اتاترک کی پوتی سے ہوئی۔ ان سے شادی کرنے کی تجویز پر انھوں نے اپنے روحانی مرشد امام جلوئی سے اجازت طلب کی۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ اس طرح سردار محمد اقبال حسین علیم سے ان کی شادی ہو گئی۔ تادم آخر وہ اپنے روحانی مرشد کے ساتھ رابطے میں رہے۔ انھوں نے ۱۹۵۶ء میں اپنے پیر المعروف حضرت غلام محمد المعروف امام جلوئی کی وفات کے بعد ان کے مزار کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔

وہ ہر سال ایک خطیر رقم مزار کے لیے امریکا سے بھجواتے رہے۔ اس مزار کی اندرونی تزئین و آرائش میں استعمال ہونے والا ۱۸ کلو گرام سونا بھی انھوں نے فراہم کیا۔ پنجاب کے وزیر خوراک چودھری محمد اقبال گجر بھی حضرت امام جلوئی کے حلقہ ارادات میں شامل ہیں۔ انھوں نے محمد اقبال حسین علیم کے بارے میں اپنے مرشد کا یہ قول بیان کیا ہے۔ ”محمد اقبال حسین علیم بحرِ وحید میں خاص ہیں اور بارگاہِ غوثیہ میں خواص۔ فیصل آباد سے رکن قومی اسمبلی چودھری عاصم نذیر بھی حضرت امام جلوئی کے ارادات مندوں اور معتقدین میں شامل رہے۔ ان کی بہت سی ملاقاتیں امریکا میں محمد اقبال حسین علیم سے ہوئیں۔ چودھری عاصم نذیر کی روایت کے مطابق اقبال حسین علیم نے وصیت فرمائی تھی کہ وفات کے بعد مجھے میرے مرشد کے قریب مزار کے اندر دفن کیا جائے۔ چنانچہ ان کی نماز جنازہ امام جلوئی کے فرزند ارجمند پیر افتخار حسین نے پڑھائی۔ ۱۴ نومبر ۲۰۰۶ء کو ان کا انتقال کنٹنکی اسٹیٹ یونیورسٹی میں ہوا۔ جسدِ خاکی ۲۰ نومبر ۲۰۰۶ء کو فیصل آباد لایا گیا۔ حکومت پاکستان کی طرف سے صوبائی وزیر خوراک میت کی تدفین کے لیے پروٹوکول آفیسر مقرر ہوئے۔ انھوں نے اہلیہ امام جلوئی کی طرف سے میت وصول کی۔

اقبال حسین علیم اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر گہرا

عبور رکھتے تھے۔ ان کی ذات مراتب فقر اور فانی الشیخ کے منصب پر فائز تھی۔ ان کی کتاب ”اسرار مقطعات“ پر بھارت کی دہلی یونیورسٹی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت بھارت کے سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے کی تھی۔ مرحوم جدید و قدیم روحانی اور دنیاوی علوم سے بہرہ ور تھے۔ امام جلوئی رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید پیر افتخار حسین کی روایت کے مطابق ترکی النسل ڈاکٹر آسمیتاں سے شادی کے بعد اقبال حسین علیم کی بیٹی، بہار پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر آسمیتاں اور ڈاکٹر بہار، دونوں نے طب کے شعبے میں ایم۔ ڈی کر رکھی ہے۔ وہ دونوں بھی اقبال حسین علیم کی میت کے ساتھ پاکستان آئی تھیں۔ پھر آمد کے موقع پر رکن قومی اسمبلی چودھری عاصم نذیر ہی ان کے میزبان تھے۔ مرحوم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے ان کے مولد گاؤں چک نمبر ۵ ج ب بوڑے وال جانے کا پروگرام بنایا۔

معروف شاعر اور صحافی اقبال گوریجہ میرے ہمراہ تھے۔ چنانچہ ہم موٹر سائیکل پر سوار ان دیکھی منزل کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے۔ سرگودھا روڈ پر نکلا کوہالہ کا اسٹاپ آتا ہے۔ وہاں سے بائیں ہاتھ ایک ذیلی سڑک مڑتی ہے۔ وہ سال انڈسٹری اسٹیٹ سے ہوتی سیدھی جھنگ براچ نہر کے کنارے آباد چک نمبر ۵ ج ب بوڑے وال تک لے جاتی ہے۔ یہی وہ گاؤں ہے جہاں کے پرانے باسیوں سے مل کر سردار گوریجن سنگھ ولد فوجا سنگھ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے ہم پہنچے۔ گاؤں میں داخل ہوئے۔ پہلے ہی چوک میں ایک دکاندار سے کہا کہ ہمیں کسی عمر رسیدہ شخص کا پتا بتائیں اس نے اگلے مرکزی چوک میں جانے کا کہا۔

ہمارا رابطہ چودھری محمد صالح رندھاوا سے ہوا۔ انھوں نے ہمارا مدعا معلوم ہونے کے بعد اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اس قدر خوش اخلاقی، مروت اور ایثار کا مظاہرہ کیا کہ ہم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے پُر تکلف کھانا کھلایا۔ پھر گاؤں کے سرکردہ چند افراد کو بلا بھیجا۔ ان میں چودھری محمد صالح

رندھاوا کے والد بزرگوار چودھری محمد اسحاق، گاؤں کے نمبردار چودھری محمد منظور اور ان کے بھائی چودھری مقبول شامل تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ سردار گورنجن سنگھ کے والد سردار فوجا سنگھ علاقے کے سرکردہ لوگوں میں تھے۔ گاؤں میں فوجا سنگھ کی بہت بڑی حویلی تھی۔ معلوم ہوا کہ سردار فوجا سنگھ کے دادا امرتسر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔

انگریزوں نے انھیں یہاں وسیع رقبہ الاٹ کیا تھا۔ اس کی آباد کاری کے لیے فوجا سنگھ کے والد امرتسر سے ہر طرح کے کارندے یعنی لوہار، ترکھان، موچی، درزی وغیرہ ہمراہ لائے تھے۔ انھوں نے گاؤں کی بے آباد زمین آباد کی۔ نزدیکی گاؤں چکدرے والی میں آباد ایک بڑے زمیندار میاں عبداللہ کے ساتھ گورنجن سنگھ کا دوستانہ تھا۔ وہ زرعی کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ انہی کی وجہ سے گورنجن سنگھ اسلام اور تصوف کی طرف مائل ہوئے۔ پھر انہی کی ترغیب پر وہ سائیں غلام محمد المعروف جلوئی کے آستانہ گئے۔ پھر وہ ان کی شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ دین اسلام قبول کر لیا اور ساری زندگی اپنے مرشد کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ آخری آرام گاہ بھی مرشد کی قربت میں ملی۔

تلاش راہ حق میں آدمی نکلے، تو اللہ تعالیٰ بھی راہیں آسان اور منزل سہل کر دیتا ہے۔ پھر مشکل بھی مشکل نہیں رہتی۔ سردار گورنجن سنگھ کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا شوق مجھے کشاں کشاں لیے پھرتا رہا۔ بچپن کے دوست علامہ ارشاد احمد کی اطلاع پر پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبدالقیوم کی تلاش میں میرے تین دن صرف ہو گئے۔ بالآخر پوچھتے پچھاتے میں ان کے دروازے پر بھی پہنچ گیا۔ وہ اسلامی مدرسہ ہائی اسکول محمد پورہ (فیصل آباد) کی انتظامیہ کے سربراہ یا نگران تھے۔ ڈاکٹر حافظ عبدالقیوم نے بتایا کہ گورنجن سنگھ کے علاوہ ایک ہندو نوجوان، کمار ولد چونی لال بھی میرے گہرے دوست تھے۔

میٹرک کا امتحان ہم نے ایک ساتھ ۱۹۴۱ء میں پاس کیا۔ پھر ایک ساتھ ہی زرعی کالج میں داخل ہوئے۔ یوں حصول تعلیم

کے دوران ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک ہم اکٹھے رہے۔ گورنجن سنگھ کو شاعری سے گہرا شغف تھا۔ وہ اچھی اردو شاعری کرتے اور دوستوں کو سناتے تھے۔ ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کے زیادہ قریب تھے۔ حافظ عبدالقیوم بولتے گئے، میرے کان اور دل ان کی باتیں سنتے گئے اور میرا قلم ان بیان کردہ الفاظ کو کاغذ پر سمیٹنے میں مصروف رہا۔ حافظ عبدالقیوم فرما رہے تھے گورنجن سنگھ نے ایگری کیمسٹری میں زرعی کالج سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بطور پرائیویٹ امیدوار ۱۹۵۳ء میں ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ ہم دونوں پھر زرعی کالج میں ریسرچ اسٹنٹ کے طور پر ملازم ہو گئے۔

حافظ عبدالقیوم مزے لے لے کر گورنجن کے ساتھ گزرے ایام کی کہانی سنارہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ گورنجن کو سکھ ہونے کے باوجود بچپن سے تصوف سے گہرا شغف تھا۔ ان کی گفتگو میں تصوف کے ساتھ لگاؤ کی جھلک ملتی تھی۔ سکھ ہونے کے باوجود اردو، عربی اور فارسی کا گہرا مطالعہ رکھتے۔ اقبال حسین علیم ۱۹۵۳ء میں یونیورسٹی اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلے گئے۔ وہ امریکا میں مقیم ہونے کے بعد گاہے گاہے پاکستان آتے رہے۔

۱۹۶۱ء میں جب فیصل آباد کے زرعی کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا، تو یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی مقرر ہوئے۔ اس وقت یونیورسٹی میں تدریسی عملے کی انتہائی کمی تھی اور بعض شعبے ابھی قائم ہونا باقی تھے۔ چنانچہ زیڈ اے ہاشمی نے امریکا میں مقیم ڈاکٹر محمد اقبال حسین علیم کو پیشکش کی کہ اگر وہ پاکستان واپس آجائیں، تو انھیں زرعی یونیورسٹی میں پروفیسر کا منصب دے دیا جائے گا، لیکن ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی کی پیشکش کو انھوں نے قبول نہ کیا۔ محمد اقبال حسین علیم کے مرشد جو ۱۹۵۶ء میں رحلت کر چکے تھے، اگر زندہ ہوتے تو شاید وہ واپس پاکستان چلے آتے۔

آزمائش

جب ایک بیوی نے اپنے شوہر کا امتحان لیا، تو وہ اس میں کامیاب رہا یا ناکام؟

کرٹ المود

نام کی عمر صرف چالیس سال ہے۔ یقیناً اس عمر کے کسی شخص کو آپ بڑھا نہیں کہہ سکتے، لیکن وہ اسی نام سے مشہور ہے۔ وہ شکل و صورت سے بھی بوڑھا نظر نہیں آتا، ہاں اس کی حرکتیں بوڑھوں جیسی ضرور ہیں۔ میں اسے ”ڈارک ہارس“ کہتا ہوں۔ میری دیکھا دیکھی فیکٹری میں کام کرنے والے دوسرے مزدور بھی



اسے ڈارک ہارس کہنے لگے۔ وہ پانچ سال سے میرے ساتھ فیکٹری میں کام کر رہا ہے۔ کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ خاموش رہتا ہے اور الگ تھلگ۔ جب کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش کرے، تو وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چھا جاتی ہے، لیکن اس کی آنکھیں کبھی نہیں مسکراتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھوں سمیت اس کے تمام چہرے میں نہ کوئی کیف ہے نہ کشش۔ وہ اپنے چہرے کے بناؤ سنگھار میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ کبھی کوئی کریم استعمال کرتا ہے اور نہ خوشبو۔

اس کی شیو کئی دن بڑھی رہتی ہے۔ لمبے لمبے بال تیل سے محروم اور الجھے الجھے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا حلیہ دیکھ کر لڑکیاں کراہت سے منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہیں۔ اس کے گھر میں صرف بیماریاں رہتی ہیں۔ گھر بھی اس کا اپنا نہیں بلکہ کرائے کا ہے۔ ایسی صورت میں بھلا کسی لڑکی کو کیا سوچھی ہے کہ اس سے شادی کرے؟

لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک دن اولڈ ٹام نے مجھے مسکراتے ہوئے بتایا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے اور مزایہ ک لڑکی جوان ہے اور خوبصورت بھی۔ پہلے پہل تو مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے اس سے بہت پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے، لیکن اس نے نہیں بتایا۔ ڈارک ہارس کا کوئی راز جان لینا آسان نہیں، وہ ویسے ہی گم صم رہتا ہے۔ جیسے جیسے شادی کی تاریخ قریب آتی گئی، وہ اور بھی اپنے خول میں بند ہوتا چلا گیا۔ بالآخر شادی کی تاریخ بے حد قریب آ گئی۔

ایک دن میں نے تہیہ کر لیا کہ ڈارک ہارس کو زندہ دلی سکھانی چاہیے۔ اگر وہ شادی کے

بعد بھی اسی طرح منہ بسورتی شکل بنائے رہا، تو اس کی بیوی کا گزارہ کس طرح ہوگا۔ وہ بے چاری تو جیتے جی مر جائے گی۔ چناں چہ میں اس کے ساتھ خوب ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کا چہرہ کچھ شگفتہ سا نظر آیا۔ پھر میں نے بیوی کے ساتھ سوشل تعلقات پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ آئندہ زندگی کی ذمے داریاں جتلائیں، لیکن ان باتوں کو اس نے سمجھنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ میں نے بیزار ہو کر اسے سمجھانا ہی چھوڑ دیا۔

شدہ شدہ ایک دن مجھے آخر پتا چل ہی گیا کہ ڈارک ہارس کی ہونے والی بیوی کون ہے۔ یہ تھی نائلٹی پارکس جو اپنے والدین کے ساتھ ڈارک ہاؤس کے محلے میں رہتی بلکہ اس کی ہمسائی تھی۔ دونوں کے مکان ساتھ ساتھ تھے۔ اس کی عمر بیس سال تھی۔ اس عمر میں گدھی بھی حسین ہوتی ہے۔ چناں چہ آپ کا جی چاہے، تو اسے حسینہ کہہ لیجیے، لیکن میں اسے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔

ایک دن میں نے نائلٹی پارکس سے ملاقات کا موقع نکال ہی لیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے اچانک ایک خطرناک سوال پوچھ ڈالا ”کیا تم ڈارک ہارس سے شادی کر رہی ہو؟“

”نہیں وہ مجھ سے شادی کر رہا ہے۔“

”یعنی اس نے پیش کش کی اور تم نے منظور کر لی۔“ میں نے

پوچھا۔

”ہاں! میں اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی کہ وہ آگیا اور کہنے لگا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟ میں نے کہا، نہیں اور پھر وہ منہ لٹکا کر واپس چلا گیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”پھر میں نے اکثر دیکھا کہ وہ بہت افسردہ اور ملول رہنے لگا ہے۔ سرائیکائے کام پر جاتا اور گردن جھکائے واپس آ جاتا۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتا۔ اس کا کھانا پینا بھی کم ہو

گیا۔ آخر کار مجھے اس کی حالت زار پر رحم آگیا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا، تم احمق ہو۔ کہنے لگا ”ٹھیک کہتی ہو۔ اگر میں احمق نہ ہوتا، تو تم سے محبت کیوں کرتا۔“

”میں نے کہا، اگر تم احمق نہ ہوتے، تو مجھے تم پر رحم کیوں آتا۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھ گیا اور پھر ہم دونوں نے شادی کی تاریخ مقرر کر ڈالی۔“

میں نائلٹی سے باتیں کر کے واپس چلا آیا۔ چند دنوں بعد شادی انجام پا گئی۔ پھر کچھ ہی روز گزرے تھے کہ اس یک طرفہ محبت کا المناک انجام دکھائی دینے لگا۔

ایک روز نائلٹی نے اپنے شوہر سے کہا ”تمہاری مختصری تنخواہ سے گزارہ بڑی مشکل سے چل رہا ہے۔ کیوں نہ میں بھی کوئی ملازمت تلاش کروں تاکہ حالات بہتر ہو جائیں۔“

ڈارک ہارس نے فوراً جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور چند دن غور و فکر کے بعد اس نے نائلٹی کو اجازت دے دی۔

دو چار دن کی بھاگ دوڑ کے بعد نائلٹی ایک جگہ ملازمت تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے اپنے شوہر کو اطلاع دی کہ مجھے ملازمت مل گئی۔

”کس جگہ ملازمت ملی؟“ ڈارک ہارس نے پوچھا۔

”بلیک کیٹ بار میں۔“ نائلٹی نے جگہ بتائی۔

”لیکن وہ تو بہت بری جگہ ہے۔ شہر کے تمام غنڈے چور اچکے وہاں آتے ہیں۔ میں تمہیں وہاں کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”لیکن میں نے تو یہ ملازمت منظور کر لی ہے۔ اب کل سے کام پر جاؤں گی۔ ہر رات پچاس ڈالریس گے۔“

”کیا کہا؟ ہر رات۔“ ڈارک ہارس کو زمین اپنے پیروں سے کھسکتی محسوس ہوئی۔ ”خبردار جواب نوکری کا نام میرے سامنے لیا۔ میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔“

”میرے پیارے ڈارک ہارس! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ بس

میرا کام صرف اتنا ہے کہ شام چھ بجے سے رات بارہ بجے تک گاہکوں کو ان کے پسندیدہ مشروب پیش کرتی رہوں۔ ذرا سوچو پچاس ڈالر اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔“

”پچاس ڈالر ہوں یا پچاس ہزار ڈالر میں تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گا۔“ ڈارک ہارس کا منہ پھولا ہوا تھا اور وہ سخت برا فروختہ نظر آ رہا تھا۔

”مگر میں ضرور جاؤں گی۔“ نائلٹی اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

روزانہ اسی بات پر میاں بیوی میں لڑائی ہونے لگی۔ ڈارک ہارس زبانی طور پر لڑائی کا فن نہیں جانتا تھا، چناں چہ اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے کھانا پینا، بولنا اور مسکراتا سب کچھ چھوڑ دیا۔ نائلٹی اسے دیکھتی، لیکن خاموش رہتی۔ سرد جنگ روز بروز شدت اختیار کر رہی تھی۔ لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے، تیسرے دن ڈارک ہارس دیوانہ ہو گیا۔ اس نے ایک خالی بوتل نائلٹی کے سر پر دے ماری، لیکن نشانہ چوک گیا۔ چہرے پر معمولی سا زخم آیا اور خون کی دھار بہ نکلی۔

دوسرے دن جب مجھے اس جنگ کے بارے میں

معلوم ہوا، تو میں دوڑا دوڑا بدحواس وہاں پہنچا، لیکن اندر داخل ہوتے ہی جو کچھ میں نے دیکھا وہ مجھے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے دیکھا کہ نائلٹی، خوب خوش و خرم ہے۔ بات بات پر قہقہے لگا اور اپنے شوہر کو بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

جب میں نے ڈارک ہارس سے جھگڑے کے بارے میں پوچھا، تو اس کے بجائے نائلٹی نے کہا ”جھگڑا کڑا کچھ نہیں۔ بس میں دیکھنا چاہتی تھی کہ میرا شوہر مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ محبت آزمانے کا یہ کون سا انداز تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نہیں سمجھو گے، ارے بھئی! وہ ملازمت والی بات محض ڈراما تھی۔ میں گھر میں اپنے شوہر کی خدمت کروں گی یا ملازمت؟ اسے تم ایک آزمائش کہہ سکتے ہو اور میرا شوہر اس امتحان میں کامیاب رہا۔“

میں نے دیکھا کہ دونوں کی آنکھوں میں محبت کا خمار چھایا ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پیار و محبت اور فخر و غرور سے دیکھ رہے تھے۔

اقوال حضرت جنید بغدادیؒ

☆ خدا کبھی اہل ہمت کو سزا نہیں دیتا، گو اس سے خطا سرزد ہو۔ جو ہمت رکھتا (اور اپنی تحقیق سے کام کرتا ہے) جینا ہے اور جو ارادت رکھتا (اور صرف دوسرے کی پیروی کرتا ہے) وہ اندھا ہے۔ ایک عمل دوسرے عمل سے بہتر نہیں ہوتا اور ایک شخص دوسرے پر سبقت نہیں لے جاتا، مگر ہمت اس کام اور اس شخص میں دوسروں کی ہمت سے بڑھ کر ہوتی ہے (ہمت سے مراد عزم و ارادہ ہے)۔

☆ مومن اور منافق میں فرق یہ ہے کہ مومن کا دل گھڑی میں ستر دفعہ پھرتا ہے اور منافق کا دل ستر سال میں بھی ایک بار نہیں پھرتا (ایمان میں خیر و شر کی تمیز و تحقیق دائم رہتی ہے اور نفاق میں ٹھان لیا جاتا ہے کہ حق کی پرواہ نہ کر کے جو بات مطلب کی ہو وہی پیش نظر رکھی جائے)

☆ میں نے کتاب خدا کو دائیں ہاتھ میں لیا اور طریقہ رسول ﷺ کو بائیں میں..... ان دونوں کی روشنی میں انسان نہ شبہات کے غار میں پڑتا ہے نہ ہلاکت کی تاریکی میں۔ (انتخاب: سدیم رحمٰن، لاہور)

لندن کی راجندر کور

انگلستان میں مقیم ایک سکھنی کی دلدوز کتھا،
اس کا سفر حیات نشیب و فراز سے معمور رہا

ذکیہ علی بیگ

اور گوشت حرام ہے، لیکن بھاجڑے بہت شراب پیتے اور گوشت بھی کھاتے ہیں۔ شادیوں پر ان کی عورتیں چاندی کے جام میں شراب پیتی ہیں اور یہ خاص مواقع کے لیے مخصوص ہے۔

راجندر کور کا تعلق چندی گڑھ کے غریب گھرانے سے تھا۔ چندی گڑھ اسلام آباد کی طرح پنجاب کے ایک پُر فضا مقام پر بسایا گیا ایک صاف ستھرا نیا شہر ہے۔ انگلستان میں مقیم ایک سکھ خاندان راجندر کور کو بہو بنا کر گلاسکو لے تو گیا، لیکن یہ لگن کسی نے قبول نہ کیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ دلھن وہی جو پیامن بھائے اور راجندر کور کے پتی سہیل سنگھ کو یہ بھوک قبول نہ تھا۔ اس کی جبری شادی ہوئی تھی جو برطانوی پاکستانیوں اور سکھوں میں عام ہے۔ وہ خود ایک گوری کے ساتھ رہتا تھا اور گھر کبھی کبھی آتا۔

راجندر کور نے مجھے بتایا کہ جب وہ گھر آتا، تو شراب کے نشے میں دھت ہوتا۔ اس کی پگ کھل کر گلے میں لٹک رہی ہوتی۔ سکھوں میں پگ اور ٹرا ان کی شان کے مترادف ہیں۔ اپنے پتی کو

سکھوں کی ذات بھاجڑوں سے راجندر کور کا تعلق تھا۔ سکھ مذہب اسلام کی طرح ہندوؤں کو ذات پات کے بندھنوں سے آزاد کرانے آیا تھا۔ لیکن بہت جلد ہندوؤں کی طرح سکھ بھی ذات پات کا شکار ہو گئے۔ سکھوں میں سردار، جاٹ، اعران اور بھٹی اونچی ذاتیں ہیں اور بھاجڑے نچلی۔ ان کے گوردوارے الگ ہوتے ہیں اور رسومات بھی۔ سکھ مذہب میں شراب



اس حالت میں دیکھنا اس کے لیے مرجانے کے برابر تھا۔ راجندر کور نے مجھ سے پنجابی میں کہا ”میں نے کہا، سہتپال تو تو پگ کے قابل ہی نہیں۔“ تب سہتپال نے اسے بہت مارا۔

اس کے سسرال والے بہو بیاہ کر نہیں، بلکہ کنیز لائے تھے۔ راجندر کور دن بھر گھر کا کام کرتی۔ ان کے گھر واشنگ مشین تک نہ تھی۔ انگلستان کے موسم میں کپڑے دھونا آسان نہیں، وہ نہ تو سوکتے ہیں اور نہ ہی انھیں باہر دھویا جاسکتا ہے۔ یہ میرے لیے انکشاف تھا۔ ہر گھر میں ۱۹۵۰ء سے مشین یہ کام رہی ہے۔ راجندر کور چولھے پر پانی گرم کرتی، اسے دوسری منزل پر لے جاتی اور نہانے کے ٹب میں کپڑے دھوتی۔ اس کے بقول کھل اور چادریں دھو دھو کر اس کے ہاتھ گل گئے تھے۔

گھر والوں کے نزدیک اسے فارغ دیکھنا پاپ تھا، اسی لیے اسے فیکٹری سے کپڑے لا کر دیے جاتے۔ وہ ان کو سی کرتی کرتی۔ اس کی ساس غسل خانے کے باہر کھڑی ہو کر منٹ گنتی

کہ کب راجندر کور باہر آئے اور کام شروع کرے۔ راجندر کور یہ ظلم پانچ سال سہتی رہی۔ پھر ایک دن پڑوسی نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ اس روز اسے بہت بری طرح سے پیٹا گیا تھا اور اس کی چیخیں پڑوسیوں نے بھی سنیں۔

مجھے حیرت ہے کہ برصغیر کے لوگوں میں ہی بہو پر ظلم کرنے کا رواج کیوں ہے؟ انگریز اور عرب ایسا کیوں نہیں کرتے؟ شاید اس لیے کہ ان کے ہاں جہیز کی لعنت نہیں اور لڑکے والے لڑکی کو داج کی خاطر بیاہ کر نہیں لاتے۔ بہر حال پولیس نے راجندر کور کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اسے رہنے کے لیے جگہ اور گزارے کے لیے رقم دی۔ راجندر کور پر دباؤ تھا کہ وہ بیان واپس لے۔ یہ دباؤ اس کے سسرال والے ڈال رہے تھے۔ ساس نے معافی مانگ کر کہا کہ اب وہ کبھی اس کے ساتھ برا سلوک نہیں کرے گی۔

راجندر کور واپس اپنے سسرال چلی بھی جاتی، لیکن حکومت

برصغیر میں غلامی

غلامی کو لعنت کیوں قرار دیا گیا، یہ کیسے انسانی خون میں سرایت کر جاتی اور کیسے انسان کو حیوان بنا دیتی ہے، اس کا تجربہ مجھے انگلستان آکر ہوا۔ برصغیر کے لوگوں کی رگوں میں غلامی یوں سرایت کر گئی ہے کہ وہ اس سے نجات حاصل نہیں کر پا رہے۔ غلامی کی سب سے بد صورت شکل یہ ہے کہ غلام جسمانی طور پر تو آزاد ہو جائے، لیکن ذہنی طور پر اس میں جکڑا رہے۔ تب وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ کسی کمزور سے لے کر کرنا چاہتا ہے۔ وہ شعور کی اس منزل کو نہیں پہنچ سکتا کہ اسے ظلم کے خلاف لڑنا چاہیے کیونکہ اسی میں نسل انسانی کی بقا ہے۔

اس طرح کارویہ میں نے کئی بار سکھوں کی ایک ذات اور میرپور کے لوگوں میں دیکھا۔ سکھوں کے مذہب میں تو خیر رشتہ داروں میں شادی کرنا منع ہے، لیکن میرپور کے گرد و نواح کے لوگ جو انگلستان میں آئے ہیں، قریبی رشتہ داروں ہی میں شادی کرتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے بہن بھائیوں کی اولاد کو انگلستان لاتے اور پھر ان سے امید کرتے ہیں کہ وہ ان کے تاحیات احسان مند رہیں۔

سکھوں اور میرپوریوں کے ساتھ میرا تجربہ ہے کہ یہ اپنے دامادوں اور بہوؤں سے بہیمانہ سلوک کرتے اور انھیں نچلے درجے کا شہری سمجھتے ہیں۔ ان کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو کبھی نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے نسلی تعصب سے بھرپور گوروں نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ جانے کیوں وہ اس طرح بدلہ لے کر طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ یہ اپنے تفاخر کا نہایت گھٹیا انداز اظہار ہے۔ راجندر کور کی کہانی آپ کے سامنے یہی حقیقت پیش کرے گی۔

(مصنفہ)

نے اسے بہت سہارا دیا۔ اس کی رہائش اور خرچے کی ذمہ داری حکومت نے لے لی۔ اس کا دیزا بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ حکومت کو احساس تھا کہ یہ حرکت اس کے سرال نے جان بوجھ کر کی ہے تاکہ راجندر کور کو دھمکا کر رکھا جائے کہ وہ اس ملک میں غیر قانونی اور ان کے رحم و کرم پر ہے۔

انگلستان میں یہ عام ہے کہ بھارت یا پاکستان سے لائی بہو یا داماد سے اس کا پاسپورٹ لے لیا جاتا اور ان سے بیگاری جاتی ہے۔ ان کے شوہر یا بیوی کسی انگریز کے ساتھ ملوث ہوتے ہیں اور انھیں گھر والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ان حالات میں پولیس کے پاس مقدمہ جانے پر انھیں ملک بدر ہونے کا خطرہ ہوتا تھا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں حقوق خواتین کی غیر سرکاری تنظیموں نے پارلیمان میں درخواست دی کہ ایسی بیویوں کو برطانیہ میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ اکثر حالات میں ایسی لٹی پٹی عورتوں کو ان کے ملک کا معاشرہ بری نگاہ سے دیکھتا اور گھر والے بھی انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔ ان کے بچے برطانیہ میں رہ جاتے یا انھیں پاکستان بھارت میں بہت برے حالات میں زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ یہ حالات مد نظر رکھتے ہوئے ۱۹۹۰ء میں قانون تبدیل کیا گیا۔ اب ناگفتہ بہ حالات کا شکار مرد و زن کو رہائش ویزا مل جاتا ہے۔

مجھے مہندر سنگھ یاد آگیا۔ سوچتی ہوں کہ راجندر کور کے ساتھ مہندر سنگھ کی کہانی بھی سنا دوں۔ دونوں ایک ہی کڑی سے بندھے ہیں۔ مہندر سنگھ پچیس سال کا گھبرو نو جوان تھا۔ اس کو عدالت کی طرف سے مقرر گارڈین (سرپرست) تلاش کر رہے تھے۔ جن حضرات نے میری پچھلی کہانی پڑھی ہے، ان سے میں سماجی خدمت کے اپنے ادارہ اطفال کا تعارف کرا چکی ہوں۔ یہ ایک مربوط ادارہ ہے جس کے پاس بہت سے وسائل اور اختیارات ہیں۔ اگر والدین بچوں کی نگہداشت میں غفلت کا مظاہرہ کریں، تو یہ انھیں عدالت لے جاسکتا ہے۔ عدالت نہ صرف والدین کو وکیل فراہم کرتی ہے تاکہ ان کے ساتھ کوئی

زیادتی نہ ہو بلکہ بچے کے لیے سرپرست مقرر کرتی ہے تاکہ اس کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔

یہ سرپرست ہر حالت میں مہندر سنگھ سے مل کر اس کا موقف سننا چاہتے تھے تاکہ بچے کے حقوق کا بہترین انداز میں دفاع ہو سکے۔ اس نے مہندر سنگھ سے پوچھا ”تم نے اپنی بیوی اور بچے کو لاوارث کیوں چھوڑ دیا؟“

مہندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک لمبے چوڑے جاٹ نو جوان کو آبدیدہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ مہندر سنگھ نے پنجابی میں کہا ”میں ایک معزز جاٹ گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری شادی برطانیہ میں ہوئی اور میں ادھر آ گیا۔ میری بیوی اس شادی پر راضی نہ تھی۔ وہ کسی انگریز کو چاہتی تھی۔ میں نے یہ امر بھی برداشت کر لیا۔ لیکن میری غیرت یہ گوارا نہ کر سکی کہ وہ روزانہ شراب پی کر مختصر کپڑوں میں رات کو تین بجے کلب سے واپس آئے۔ ہم ذات کے جاٹ ہیں اور شراب پینا حرام سمجھتے ہیں۔ وہ ناری ہو کر شراب کے نشے میں چور اپنے دوست کے ساتھ گھر واپس آتی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا، لیکن میری غیرت اس سے زیادہ گوارا نہ کر سکی اور میں اسے چھوڑ اس دکان پر ملازم ہو گیا۔ رات کو دکان پر ہی سو جاتا ہوں۔ میں بھارت واپس بھی نہیں جاسکتا کیونکہ گھر والوں کو کیا منہ دیکھاؤں گا۔ اس سے تو اچھا ہے پھندا ڈال کر مر جاؤں۔“

سرپرست نے کہا ”زیادتی تم دونوں کے ساتھ ہوئی ہے۔ تمہاری بیوی اس ملک میں پیدا ہوئی اور یہاں کے رنگ میں رنگی گئی۔ اس کی زبردستی شادی کر دی گئی تاکہ وہ سدھر جائے اور تم سے جھوٹ بولا گیا۔ شادی دو دلوں کا بندھن ہے، جسموں کا نہیں۔“ مہندر سنگھ نے کہا ”میں اپنے بچے سے ملنا چاہتا ہوں، لیکن سرال والے ملنے نہیں دیتے۔“ اس کی آنکھوں میں درد کا سمندر موجزن تھا۔

یہ کوئی انوکھی کہانی نہیں، میرا ایسی کہانیوں سے روزانہ واسطہ پڑتا ہے۔ کبھی مہندر سنگھ ہوتا ہے، تو کبھی راجا انور! بریڈ فورڈ

قسمت کے لکھے کو قبول کر لیا۔ لیکن اسے تنہائی بہت ستاتی۔ دنوں بارش ہوتی اور ماضی بوند بوند ٹپکتا۔

آخر جب راجندر کور بھارت گئی، تو اسے جگل مل گیا، اس کا پرانا محلے دار! وہ ابھی جوان لگتا تھا۔ اس کی بیوی گزر چکی تھی۔ سب کے یقین دلانے پر راجندر کور نے اس سے شادی کر لی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جوا کھیل رہی ہے۔ ماضی کی تلخ یادیں کبھی کبھی بہت ڈستی تھیں۔ مگر جگل نے اسے دل سے قبول کر لیا اور اس بات کو بھی کہ اب وہ ماں نہیں بن سکتی۔

انہوں نے ننھی یتیم لڑکی، پرکاش کور کو گود لے لیا اور برطانیہ آ گئے۔ لیکن یتیم بچی کو اپنا بڑا مسئلہ بن گیا۔ برطانیہ میں آپ کسی بچے کو یوپی گود نہیں لے سکتے۔ اس کے لیے قانونی شرائط اور جانچ بہت سخت ہے۔ پہلے وقتوں میں لوگ رشتہ داروں کے بچوں کو اپنے بچے بنا کر لے آتے تھے۔ پھر اکثر ان سے گھریلو ملازمین والا سلوک کیا جاتا۔ اب یہ رستہ بند کر دیا گیا ہے اور بچوں کا ڈی این اے ٹیسٹ کرایا جاتا ہے۔

بہر حال راجندر کور کے لیے ایک نئی آزمائش شروع ہو گئی۔ ایڈاپٹیشن ڈیپارٹمنٹ کی ایک خصوصی تربیت یافتہ سوشل ورکر نے ان کی جانچ شروع کی۔ ان کا ہر طرح کا ریکارڈ چیک ہوا۔ رشتہ داروں سے ملاقات کر کے اطمینان کیا گیا کہ وہ شریف انفس لوگ ہیں، ان کے مقاصد نیک ہیں۔ اس کا رروائی نے ایک سال کا عرصہ لیا۔ سوشل ورکر نے رپورٹ تیار کر کے ایڈاپٹیشن پیپل کو دی۔ راجندر کور کے مقدمہ پر ماہرانہ بحث ہوئی۔ میاں بیوی کو بلایا گیا اور ان سے بات چیت بھی ہوئی۔ آخر کار وہ بچی کے قانونی والدین بن گئے۔

یہ سلسلہ ایسے ہی ختم نہیں ہوتا۔ ایک سال تک سوشل ورکر ان سے ملاقاتیں کرتی رہی تاکہ وہ جان سکے، بچی کی پرورش درست طریقے سے ہو رہی ہے۔ گود لیے گئے بچوں اور ان کے والدین کو بہت ساری سہولیات دی جاتی ہیں۔

اس واقعہ کو کچھ سال گزر گئے۔ پھر میری ملاقات راجندر کور

میں میر پور کی ایک لڑکی نے بالکل ایسی کہانی مجھے سنائی۔ اس کی میر پور میں زبردستی شادی کر دی گئی تھی۔ اس کا قصور بھی یہ تھا کہ وہ برطانیہ کے رنگ میں رنگی تھی۔ اپنی ناقص تربیت کو الزام دینے کے بجائے ناعاقبت اندیش والدین اپنی اولاد کو عمر بھر کے روگ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ایسے بچے ذہنی عذاب میں مبتلا رہتے اور نشے میں ڈوب کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نشہ ان کی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں ان کے بچے بھی آوارہ ہو جاتے ہیں۔ اجڑے گھر کے بچے بھی ٹوٹے ہوئے انسان بنتے ہیں یا سوشل سروسز دخل اندازی کر کے ان بچوں کو اپنی تحویل میں لے لیتی ہے۔

ایک ماہر کی حیثیت سے میرا سب والدین کو مشورہ ہے کہ اپنی اولاد کی تربیت پر دھیان دیں۔ ان کے معمولات اور دوستوں سے میل جول پر نظر رکھیں۔ ان کے گھر والوں سے بھی ملاقات کریں تاکہ آپ کو معلوم ہو وہ اپنے بچوں کو کیسی تربیت دے رہے ہیں۔ آپ کے بچے اس ماحول سے بہت کچھ سیکھیں گے۔ بچوں کے اسکول سے رابطے میں رہیں، وہ آپ کو تربیت میں مدد دیں گے۔

اب راجندر کور کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس کو بولٹن میں گھر مل گیا تاکہ وہ اپنے سسرال سے محفوظ زندگی گزار سکے۔ اس کو خرچہ بھی ملتا۔ اسے انگریزی سیکھنے کے ادارے میں بھرتی کر دیا گیا۔ ساتھ ساتھ اس نے ایسے ادارے میں ملازمت کر لی جس کو حکومت فنڈ دیتی تھی۔ اس ادارے کا کام برصغیر سے تعلق رکھنے والے بوڑھے افراد کی مدد کرنا تھا۔ گاڑی انھیں گھروں سے لیتی اور سینٹر لے آتی۔ وہ اپنے دوستوں سے ملتے اور سینٹر میں پکا کھانا کھاتے۔ ان کے لیے تفریح کا بھی بندوبست کیا جاتا۔

راجندر کور برتن دھونے کا کام کرتی۔ اس کی صاف گوئی، منجیدگی، محنت و لگن نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی اور بہت کم مسکراتی۔ وہ چالیس کی ہو چکی تھی۔ زمانے کے حوادث نے اس کے جذبات سرد کر دیے تھے۔ اس نے

اور بھی سے اسکول میں ہوئی۔ پرکاش کوراب اسکول جالی تھی۔ راجندر کور اور اس کا شوہر زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن اپنی بیٹی کو بہترین تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ میں ان کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ دونوں محنت مزدوری کر کے ننھی کے لیے بہترین ماحول فراہم کر رہے تھے۔ گھر میں انگریزی نہ بولنے کی وجہ سے ننھی اس مضمون میں بہت کمزور تھی۔ وہ پڑھائی میں بھی پیچھے تھی اگرچہ وہ بہت محنت کرتی۔

مجھے یہ واقعہ بہت محفوظ کرتا ہے کہ ننھی کی ٹیچر نے راجندر کور اور جگل پر زور دیا کہ وہ پرکاش کور سے رات کو اس کی انگریزی کتاب سے سبق سنیں۔ تین ماہ بعد جب دوبارہ میٹنگ ہوئی، تو ٹیچر نے شکایت کی، ننھی کی پڑھائی بہتر نہیں ہوئی۔ جگل نے زور دیا کہ میں تو روز سبق سنتا ہوں۔ اس نے ننھی سے کتاب نکالنے کا کہا۔ معلوم ہوا کہ ننھی اسے روز ایک ہی سبق سنا رہی تھی۔ چونکہ وہ انگریزی سے نا آشنا تھا، اس لیے یہ سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ ننھی فر فر انگریزی پڑھ سکتی ہے۔ ہم سب ہنس دیے

سین راجندر لور اور جگل نے جد بے بی داد دینا نہ ہوئے۔ ننھی اب میٹرک کر رہی ہے۔ وہ بہت محنت کرتی ہے۔ ذہنی طور پر کمزور ہے، اسی لیے بہت مشکل نظریات کو سمجھ نہیں سکتی۔ کمپیوٹر کے جدید پروگرام اس کی استعداد بڑھانے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ والدین اسے لائبریری لے جاتے ہیں تاکہ وہاں کمپیوٹر استعمال کر کے امتحان کی تیاری کر سکے۔ یہ سب مفت فراہم کیا جاتا ہے۔

ننھی کی خواہش ہے کہ وہ پولیس میں بھرتی ہو۔ اسے پولیس وردی بہت پسند ہے۔ اس کے والدین اسے خوش اور کامران دیکھنے کے متمنی ہیں۔ وہ اسکول سے رابطہ میں رہتے ہیں۔ انھیں ترجمان فراہم کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنا مدعا بیان کر سکیں۔ اسکول نے خصوصی انتظامات کیے ہیں کہ اس کے پرچے قابلیت کے مطابق ہوں۔ شاید وہ اعلیٰ تعلیم تو حاصل نہ کر سکے، لیکن پولیس میں سپاہی بھرتی اور مفید شہری بن کے اپنے والدین کا سرفخر سے ضرور بلند کر دے گی۔

اول خویش....

☆ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا: جب آدمی اپنے اہل و عیال پر ثواب کی میت سے خرچ کرتا ہے تو وہ جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔ (بخاری و مسلم)

☆ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا: بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد بھی خوشحالی قائم رہے اور ابتدا ان لوگوں سے کرو جو تمھارے زیر کفالت ہوں۔ (بخاری، ابوداؤد، نسائی)

رشتے دار کو صدقہ

☆ حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: کسی حاجت مند کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور اپنے رشتے دار کو صدقہ دینا دوسرے ہیں: ایک تو صدقہ اور دوسرا صلہ رحمی۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

اللہ سے مانگو

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک روز نبیؐ کے پیچھے (سوار) تھا تو آپؐ نے فرمایا: ”اے لڑکے! اللہ تعالیٰ کے (احکام کی) حفاظت کرو، وہ تیری حفاظت فرمائے گا، اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھ تو اسے اپنے سامنے پائے گا اور جب تو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کر اور جب تو مدد مانگے تو اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن صحیح کہا ہے)



مجازی خدا

مرحوم شوہر کو ایک بیوی کا جذبات و
احساسات سے بھرپور خراج تحسین

بیگم نسرین ریاض

وہ ایک سہانا دن تھا جب دو معزز خواتین ہمارے گھر آئیں اور ماں سے درخواست کی کہ ہم آپ کی بیٹی کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی خاطر تواضع کی گئی۔ رشتہ مناسب لگا لیکن کچھ دن مہلت مانگ لی کہ گھر والوں اور عزیز رشتہ داروں سے مشورہ کر کے جواب دیں گے۔

میں نے کوئین میری کالج لاہور سے بی اے کیا تھا اور لیڈی مکلین ٹریننگ کالج سے بی ایڈ امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ کچھ عرصہ محکمہ تعلیم میں ملازمت بھی کرتی رہی۔

سب لڑکیوں کی طرح میرے دل میں بھی کچھ ارمان تھے۔ تصور تھا کہ درختوں سے گھری ایک کوٹھی ہوگی۔ ایک بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر خوبصورت جیون ساتھی کے ساتھ اس عالی شان کوٹھی میں داخل ہوں گی۔ ساس نندیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گی۔ دیور سے بھائی کا پیار ملے گا اور جیون ساتھی، توہر پل ساتھ رہے گا۔

سوچ بچار کے بعد رشتہ قبول کر لیا گیا۔ ہیڈ پنجنڈ پر ماموں

جان ایکس ای این (X-E-N) تھے۔ انھوں نے خواہش کی کہ اسلام آباد کے بجائے ہیڈ پنجنڈ آفیسر کالونی میں شادی کی تقریب ہونی چاہیے۔ وہاں ان کی بہت بڑی کوٹھی تھی اور بے شمار نوکر چاکر بھی۔ یہ مشورہ بھی کو بھلا لگا۔

بیابا والے دن کوٹھی بقیہ نور بنی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے برآمدے بیٹوں سے بچے ہوئے تھے۔ دھوم دھام سے برات آئی۔ شادی کی رسمیں ہوئیں۔ نکاح ہوا، میرے نام کے ساتھ ایک اجنبی کا لکھ دیا گیا جسے میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آج سے کئی برس قبل ۷۷ء میں کو میرے بابا نے میرا ہاتھ پکڑا اس اجنبی کے ہاتھ میں دے دیا اور روایتی نصیحتیں بھی کیں۔ مختصر یہ کہ اب میرا ایک مجازی خدا تھا جس کا ساتھ ہر حال میں نبھانا تھا۔ زندگی میں سرد گرم موسم آئے، کچھ تلخ و شیریں لمحات بھی دیکھنے کو ملے۔ اللہ تعالیٰ نے میری جھولی میں دو پھول عطا کیے: ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔

بچے بڑے اور پڑھ لکھ کر فارغ ہوئے۔ ان کی شادیاں اچھے معزز خاندانوں میں ہو گئیں۔ یہ سب میرے اللہ کا کرم تھا کہ بچوں کی طرف سے ہم دونوں مطمئن رہے۔

اب ہم دونوں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ یہی وہ وقت ہے جب میاں بیوی کو صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے ساتھ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے دم سے زندگی میں رونق تھی۔ ریڈیو سننے کے شوقین تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے پرانے گانے سنتے۔ کبھی خود بھی گنگنا تے۔ میں بھی کبھی آواز ملا لیتی۔ بچے بہت مسرور ہوتے۔

کبھی کبھی ہم آپس میں لڑ بیٹھتے۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر برآمدے میں کرسی پر جا بیٹھتے اور آواز دیتے ”یار چائے ملے گی؟“ میں بھی سب کچھ بھول دو پیالی چائے بنا کر لے جاتی۔ خوشگوار ماحول میں چائے پیتے۔ اور پھر باتیں شروع، پرانے قصے

دہرائے جاتے۔ نئے حالات پر بصرہ لرتے۔ اتنے میں پھر نوک جھونک ہو جاتی۔ لیکن بات کرنے میں ہمیشہ وہ پہل کرتے۔

سردیوں کے دن تھے، انھیں ہلکا سا زلہ بخار ہوا۔ ڈاکٹر کے پاس جانے سے کتراتے تھے۔ گھر میں جو نسخے ٹوٹے ہوئے، وہ آزمائے جاتے۔ دو دن میں بخار اتر جاتا، مگر اس بار ایسا نہ ہوا۔ میں نے بیٹی کو فون کر کے بتایا کہ تمہارے پاپا کو بخار ہے۔ وہ روزانہ فون کرتی۔

وہ اسے تسلیاں دیتے ”بیٹی پریشان نہ ہو، میں بالکل ٹھیک ہوں، تمہاری ماں نے خواہ مخواہ تمہیں پریشان کر دیا ہے۔“ لیکن کمزوری بڑھتی گئی۔ کھانا پینا بھی کم ہوتا گیا۔ ڈاکٹر سے فون پر بات کی۔ کہا کہ کلینک پر لے آئیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کے دوست بھی تھے۔ پیغام دیا، تو دکھانے پر راضی ہو گئے۔

بیٹے نے سہارا دیے کرکار میں بٹھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھا اور پھر طاقت کا انجکشن لگایا۔ کہا کہ کمزوری بہت ہو گئی۔ کھانا ضرور کھائیں، چاہے دوائی سمجھ کر۔ ایک ڈرپ کلینک پر لگائی اور دوسری کے متعلق کہا کہ گھر پر لگائیں۔

گھر واپس آئے۔ تھوڑا سا کھانا کھایا اور کہا ”یار جسم میں درد ہے۔ کندھے دکھ رہے ہیں۔“ میں نے کہا، سیدھے بیٹھ جائیں۔ میں کندھے دبا دیتی ہوں۔ اس اثنا میں میرے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی۔ پوچھا ”کیا ہوا؟“

میں نے بتایا ”کل سے سیدھا ہاتھ درد کر رہا ہے۔“ فوراً دعائیں دینے لگے ”تمہیں تو کچھ نہ ہو۔ اللہ تمہیں صحت دے۔ تم سے سارا گھر چل رہا ہے۔ تم ہی سب کا خیال رکھتی ہو۔“ پھر سکون سے دوائیاں کھا کر سو گئے۔ صبح مزید کمزوری بڑھ گئی۔ ڈرپ لگائی گئی۔ دوپہر دو بجے صرف دودھ پیا۔

مجھ سے کہا، تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ معلوم نہیں مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتے تھے، لیکن مجھ کم نصیب نے کہا ”باورچی خانے میں چولہا بند کر کے آتی ہوں۔“

بولے، اچھا میں اب سو رہا ہوں۔ کوئی بھی آئے، مجھے نہ

اٹھانا۔ یہ آخری بات سی جو اھوں لے بھ سے سی۔
شام کو نیم غشی کی کیفیت طاری تھی۔ اسی حالت میں آدھی پیالی بخنی پی، بقیہ منہ سے بہنے لگی۔ بات کی تو صرف ”ہوں“ کر کے جواب دیا۔

میں نے پریشان ہو کر ان کے چھوٹے بھائی کو فون کر کے بلایا۔ وہ آگئے اور کہا کہ جلدی سے انھیں ایمر جنسی لے چلیں۔ بیٹے نے ہاتھوں پر اٹھا کر کار میں بٹھایا۔ دمپر کی شدید سردی تھی اور دھند اتنی دبیز کہ دو گز دور بھی کچھ نظر نہ آتا۔ وہ اسپتال کیا گئے گھر میں ویرانی ٹپکنے لگی۔ موت کا سا سناٹا طاری ہو گیا۔ ساری رات جاگتے گزری۔ ان کا خالی بستر دیکھ کر دل میں ہول اٹھتے۔ دوسرے دن دمپر کی اتار تارخ تھی۔ شام کے سات بجے نماز پڑھ کر فارغ ہوئی، تو اطلاع ملی کہ وہ اللہ کی رحمت میں چلے گئے ہیں۔ یوں دکھ سکھ کا ساتھی مجھے حیران و پریشان کر گیا۔ میرے سر پر سمجھو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ زندگی کے سفر میں بیچ راستے مجھے تڑپتا چھوڑ کر دنیا کی الجھنوں سے دور وہ سکون سے سو گئے۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نوزستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
زندگی اب ریت کا صحرا ہے جہاں میں تنہا کھڑی ہوں۔
صحرا کا یہ سفر نجانے کیسے طے ہوگا؟ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری کوتاہیوں اور خطاؤں کو معاف فرمائے اور میرے مجازی خدا کو نصیب تیرے دل سے اپنا مانا تھا، مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے، آمین۔

وہ نیک دل انسان تھے، ہمدرد اور خیال رکھنے والے! ان کی باتوں میں اتنی چاشنی تھی کہ اجنبی لوگ بھی متاثر ہو جاتے۔ یادداشت بہت تیز اور معلومات وسیع تھیں۔ میں اکثر کہتی، اپنی یادداشتیں مجھے لکھواتے جائیں، کیا پتا انڈیا کی فلم ”باغبان“ کی طرح ہماری بھی لاٹری نکل آئے۔ لیکن ہنس کر ٹال دیتے۔

عجب شخص تھا جو ہمیں حیران کر گیا
ایسا گیا کہ گھر کو ویران کر گیا



مجھے کوئی شام ادھار دو

نئی نسل کے پسندیدہ شاعر
اعتبار ساجد کا پراثر منتخب کلام

ایم اے لودھی

کرنے لگتے۔ اب تک ان کی شاعری کے ہند رہ مجموعے شائع ہو چکے۔ ان میں سے ”مجھے کوئی شام ادھار دو“ کے سولہ ایڈیشن شائع ہوئے اور یہ اب تک نوجوان نسل کی پسندیدہ کتاب چلی آرہی ہے۔

ذیل میں اعتبار صاحب کی غزلوں کا انتخاب پیش خدمت ہے۔ ان غزلوں میں محبت کی کہک ہے اور سلگتے جذبات کی تڑپ بھی۔ یہ قاری کو منفرد جذبات و احساسات سے آشنا کرتی ہیں۔

☆☆

تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں، مرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں، مجھے کوئی شام ادھار دو

مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک سکیں مرے خال و خد
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو، مرے سارے زنگ اتار دو

۱۹۷۶ء کی بات ہے جب اعتبار ساجد کا پہلا مجموعہ یہ کلام ”دستک بند کواڑوں کی“ شائع ہوا۔ یہ دنیا کے اردو شاعری میں ایک نئے شاعر کا جنم تھا۔ ۱۹۷۸ء میں اعتبار ساجد شعبہ درس و تدریس میں داخل ہوئے اور ۲۰۰۰ء تک مختلف کالجوں میں طلبہ کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے رہے۔ پیشہ ورانہ فہمے داریاں انجام دیتے ہوئے نوشکی، کوئٹہ اور اسلام آباد میں قیام رہا۔

معلمی کے ساتھ ساتھ اعتبار صاحب نے قلم سے رشتہ برقرار رکھا۔ آپ نے شاعری کے علاوہ افسانے، ڈرامے، ناول، سفر نامے اور کالم لکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے تمام اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی اور شائقین کو متاثر کیا۔

اعتبار ساجد کو شاعری کی وجہ ہی سے شہرت ملی۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں وہ نوجوانوں کے مقبول شاعر تھے۔ نئی نسل ان کی غزلوں کا انتظار کرتی۔ من پسند اشعار نئی نسل میں گردش

کسی اور کو مرے حال سے نہ غرض ہے کوئی نہ واسطہ
میں بکھر گیا ہوں سمیٹ لو، میں بگڑ گیا ہوں سنوار دو

مری وحشتوں کو بڑھا دیا ہے جدائیوں کے عذاب نے
مرے دل پہ ہاتھ رکھو ذرا، مری دھڑکنوں کو قرار دو
تمہیں صبح کیسی لگی کہو، مری خواہشوں کے دیار کی
جو بھلی لگی تو یہیں رہو، اسے چاہتوں سے نکھار دو

وہاں گھر میں کون ہے منتظر کہ ہو فکر دیر سویر کی
بڑی مختصر سی یہ رات ہے، اسی چاندنی میں گزار دو

کوئی بات کرنی ہے چاند سے کسی شاخسار کی اوٹ میں
مجھے راستے میں یہیں کہیں کس کنج گل میں اتار دو
☆☆

ترے جیسا میرا بھی حال تھا، نہ سکون تھا نہ قرار تھا
یہی عمر تھی مرے ہم نشیں کہ کسی سے مجھ کو بھی پیار تھا

میں سمجھ رہا ہوں تری کسک، ترا میرا درد ہے مشترک
اسی غم کا تو بھی اسیر ہے، اسی دکھ کا میں بھی شکار تھا

فقط ایک دھن تھی کہ رات دن اسی خواب زار میں گم رہیں
وہ سرور ایسا سرور تھا، وہ خمار ایسا خمار تھا
☆☆

آنے والی تھی خزاں، میدان خالی کر دیا
کل ہوائے شب نے سارا لان خالی کر دیا

ہم ترے خوابوں کی جنت سے نکل کر آ گئے
دیکھ، تیرا قصر عالی شان خالی کر دیا

دشمنوں نے شست باندھی خیمہ امید پر
دوستوں نے درہ امکان خالی کر دیا

بانٹنے نکلا ہے وہ پھولوں کے تحفے شہر میں
اس خبر پر ہم نے بھی گلدان خالی کر دیا

لے گیا وہ ساتھ اپنے، دل کی ساری رونقیں
کس قدر یہ شہر تھا گنجان خالی کر دیا

ساری چڑیاں اڑ گئیں مجھ کو اکیلا چھوڑ کر
میرے گھر کا صحن اور دالان خالی کر دیا

ڈائری میں سارے اچھے شعر چن کر لکھ لیے
ایک لڑکی نے مرا دیوان خالی کر دیا

☆☆

ڈھونڈتے کیا ہوا ان آنکھوں میں کہانی میری
خود میں گم رہنا تو عادت ہے پرانی میری

بھیڑ میں بھی تمہیں مل جاؤں گا آسانی سے
کھویا کھویا ہوا رہنا ہے نشانی میری

میں نے اک بار کہا تھا کہ بہت پیاسا ہوں
تب سے مشہور ہوئی تشنہ دہانی میری

یہی دیوار و در و بام تھے میرے ۲۰ راز
انہی گلیوں میں بھٹکتی تھی جوانی میری

تو بھی اس شہر کا باقی ہے تو دل سے لگ جا
تجھ سے وابستہ ہے اک یاد پرانی میری

کربلا دشت محبت کو بنا رکھا ہے
کیا غزل گوئی ہے کیا، مرثیہ خوانی میری

دھیمے لہجے کا سخنور ہوں، نہ صہبا ہوں نہ جوش
میں کہاں اور کہاں شعلہ بیانی میری



بالآخر یہ حسیں منظر مٹا دینا ہی پڑتا ہے
 کسی کے سر کو شانے سے ہٹا دینا ہی پڑتا ہے
 کسی دیر آشنا کو جھوٹے سچے کچھ حوالوں سے
 تعارف کے لیے سب سے ملا دینا ہی پڑتا ہے
 جو سانسوں میں مہکتے ہیں، جو آنکھوں میں دھکتے ہیں
 اچانک ایک دن ان کو بھلا دینا ہی پڑتا ہے
 دیے جو ہم جلاتے ہیں نہایت شوق سے ہر شب
 انہیں خود اپنی پھونکوں سے بجھا دینا ہی پڑتا ہے
 کوئی جب پوچھتا ہے ہم سے، کیسا حال ہے ساجد
 ہمیں محتاط ہو کر مسکرا دینا ہی پڑتا ہے
 چمک اٹھتے ہیں ساجد جب ستارے اس کی پلکوں پر
 اسے دل سے لگا کر حوصلہ دینا ہی پڑتا ہے
 ☆☆

محبت میں محبت کی صفائی دے رہے ہیں ہم
 عجب عاشق ہیں، عذر آشنائی دے رہے ہیں ہم
 ہمارے حال پر جاننا بہت خوش فہم مت ہونا
 دکھانے کے لیے ایسے دکھائی دے رہے ہیں ہم
 کوئی تحفہ تمہیں دینا تو تھا اپنی محبت کا
 تمہیں لو، آج زخم آشنائی دے رہے ہیں ہم
 ہمارے رت جلوں کا تم کو کچھ احساس تو ہو گا
 دم رخصت، تمہیں شام جدائی دے رہے ہیں ہم
 جنہیں خون جگر سے پیش رو تحریر کرتے تھے
 اب ان لفظوں کو دل کی روشنائی دے رہے ہیں ہم
 ہم اتنے شور میں سب سے مخاطب بھی نہیں ساجد
 جو سن سکتے ہیں بس ان کو سنائی دے رہے ہیں ہم
 ☆☆

اب تک نہ سمجھ پائے مرا شور فغاں بھی
 تم لوگ تو پڑھ لیتے ہو آنکھوں کی زباں بھی
 خط اس لیے شاید مجھے اب تم نہیں لکھتے
 کاغذ پہ اتر آتے ہیں سانسوں کے نشاں بھی
 سینے کی گھٹن میں کبھی رکتی نہیں آہیں
 کمرے سے نکلنے کو مچلتا ہے دھواں بھی
 شہرت سے فقط اس لیے آتا ہے مجھے خوف
 مشہور نہ ہو جائے مرا زخم نہاں بھی
 اس درد کے رشتے میں تو یکساں ہیں شب و روز
 جو حال تمہارا ہے وہ عالم ہے یہاں بھی
 کچھ وہ بھی دکھی دل لیے آیا تھا مرے پاس
 کچھ درد بھرا تھا مرا انداز بیاں بھی
 ☆☆

اک روز کوئی تو سوچے گا
 دنیا نے اسے کچھ بھی نہ دیا
 پر اس نے جگ کو پیار دیا
 جاں روتے روتے کھو بیٹھا
 دل ہنستے ہنستے ہار دیا
 جو نظم لکھی بھرپور لکھی
 جو شعر دیا شاہکار دیا
 کیوں جیتے جی درگور ہوا
 کس چاہ پہ تن من وار دیا
 تھا دشمن کون بچارے کا
 کس رنج نے اس کو مار دیا
 اک روز کوئی تو سوچے گا
 اور پہروں بیٹھ کے روئے گا



حیثیت کی دعوت

یاد رکھیے، زندگی اور محبت اتنا ہی بڑھتی
ہیں جتنا ہم انھیں خرچ کرتے جائیں

شبانہ یونس

اس وقت کی بات ہے، جب میری عمر دس سال تھی۔
یہ ہمارے پڑوس میں ایک غریب بیوہ عورت، امینہ اپنے
سات سالہ بیٹے کے ساتھ رہتی تھی۔ امینہ بی بی لوگوں
کے گھروں میں جھاڑو پھیر اور برتن دھو کر گزارہ کرتی۔ اس
مصروفیت کی وجہ سے عام کو وہ شفقت اور محبت نہ مل سکی جس کا وہ
حقدار تھا۔ جب بھی ہم بچے گلی میں کھیلتے تو عامر کو کوئی کھیلنے کی
دعوت نہ دیتا۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں کھڑا دیکھتا رہتا۔
ایک دن اس بیوہ نے ہم بچوں کو پکڑ لیا جب اس کا بیٹا گلی میں کھڑا
رورہا تھا۔ امینہ بی بی نے عامر کو گھر بھیج دیا اور خود گلی میں آکر ہم پر

برس پڑی۔ ”یہ بچہ جب تمھارے قریب آتا ہے، تو تم اسے پیچھے
دھکیل دیتے ہو۔ کیا تم اسے جینے نہیں دینا چاہتے؟“
کئی سال گزر گئے، یہ واقعہ کسی حد تک مجھے بھول گیا۔ مگر
پھر احساس ہوا کہ بعض اوقات لوگوں کے رنج بھرتے ہوئے
انھیں تباہی کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔ وہ فتح یاب ہوں یا
شکست خوردہ، اس میں دوسروں کا ہاتھ بھی ہوتا ہے، بالکل سوج
کی طرح جس کی کریمیں پھلوں اور پھولوں کو رنگ اور تازگی دیتی
ہیں۔ ماہر نفسیات سیڈنی جورالڈ کہتے ہیں۔ ہر انسان اپنی زندگی
میں کسی نہ کسی طور دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض لوگ
دوسروں پر اپنی کمینگی و تنگ دلی کے اثرات چھوڑتے ہیں اور کئی
فراخ دلی اور محبت کے! زندگی میں خرابی اور اچھائی، دونوں ملتی
ہیں۔ کئی لوگ زندگی کی قدر کرتے ہیں۔ انھیں اس سے محبت
ہوتی ہے اور یہی سبق وہ دوسروں کو دیتے ہیں۔

زندگی خدا داد عطیہ ہے۔ مگر کئی لوگ جاننے والوں کی حوصلہ
افزائی کرنے کے بجائے انھیں ہمت ہارنے کا مشورہ دیتے
ہیں۔ ایسے لوگ دوسروں کی تباہی کے ذمے دار ہیں۔ یہ لوگوں

قرآن مجید کی اہم معلومات

☆ قرآن مجید میں دو آیات ایسی ہیں جن میں سب حرف تہجی (اسے ی تک) جمع ہیں: پہلی سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۵۴ اور دوسری سورۃ فتح کی آیت نمبر ۲۹۔

☆ قرآن مجید میں صرف ایک سورۃ ایسی ہے جس کی ہر آیت میں 'اللہ' کا لفظ موجود ہے اور وہ ہے سورۃ مجادلہ۔

☆ قرآن مجید میں صرف ایک سورۃ ایسی ہے جس میں زیر صرف ایک مرتبہ آئی ہے اور وہ ہے سورۃ اخلاص۔

☆ قرآن مجید کی سب سے بڑی سورۃ البقرہ ہے اور سب سے بڑی آیت سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۲ ہے۔

☆ قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورۃ الکوثر ہے اور سب سے چھوٹی آیت سورۃ مدثر کی آیت نمبر ۲۱ ہے۔

☆ قرآن مجید میں ایک مکمل رکوع ایسا ہے جو صرف ایک آیت پر مشتمل ہے یعنی سورۃ مزمل کا آخری رکوع۔

☆ قرآن مجید میں سب سے زیادہ آیات پر مشتمل رکوع سورۃ عبس کا ہے۔ (مرسلہ: احسن کمال یوسف زئی، واہ کینٹ)

کے خواب مجروح کرتے امیدوں کے چراغ گل کرتے، تاریکیاں پھیلاتے اور چہروں سے مسکراہٹ نوچتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بے حس اور سنگدل لوگ ہر کہیں مل جاتے ہیں۔

ایک آدمی کی مثال پڑھیے جس کی بد مزاج بیوی اپنے شوہر کو طعنے دیتی رہتی، مگر شوہر سے بدلے میں محبت اور شفقت چاہتی تھی۔

”کیا تم مرد کھلانے کے مستحق ہو؟“ وہ غصے سے چلاتی۔ یہی بیوی جب کھانا پکا کر شوہر کے سامنے لائے، تو وہ چیخ پڑتا ہے ”تم کبھی کھانا پکا نا نہیں سیکھ سکتی۔“

ایک ایڈیٹر نے مصنف کی اچھے پلاٹ والی کہانی صرف لکھائی کی وجہ سے اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ ایک نئے شاعر کی نظم رد کر دیتا ہے۔ ”یہ کیسی بے ٹکلی نظم ہے۔“ مگر اچھا مصنف اور شاعر پیدا نہیں ہوتا، اس میں اصلاح کی گنجائش ہوتی ہے۔

ہمیں زندگی میں شکست خوردہ کرنے والے بہت سے افراد مل جائیں گے، مگر وہ لوگ عظیم اور شاندار ہیں جو دوسروں کی ہمت افزائی کرتے اور ان میں امید کے چراغ جلاتے ہیں۔ ان کی سعی ہے ہم وہ کچھ بن پاتے ہیں جس کے بننے کی ہم تمنا اور امنگ رکھتے ہیں۔

میں کوئٹہ ہائی اسکول میں پڑھتی تھی۔ ہماری اردو کی استانی انتہائی محبت اور شفقت سے ہمیں پڑھاتی تھی۔ شاید ہی اس دور کی کوئی لڑکی ان مشفق استانی کو بھولی ہو۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ، ہنسنا بولنا حتیٰ کہ ان کی اداسی کو بھی ہم سمجھ جاتیں۔ وہ ہمیشہ بہتر سے بہتر کام کرنے کا حوصلہ دلاتیں اور طالبات میں امنگ پیدا کر دیتیں۔

مشہور ڈراما نویس ایڈورڈ شیلڈن نیویارک کا ایک اور امید بانٹنے والا شخص گزرا ہے۔ تیس سال کی عمر میں جوڑوں کے درد کی بیماری نے اسے تقریباً مفلوج کر دیا۔ ساتھ اس کی بینائی بھی جاتی رہی۔ وہ تمام لوگ جو اسے جانتے تھے، بستر پر اس کی مزاج پرستی کرنے آتے، مگر وہ عزیز دوستوں کے مسائل سنتا، ان کے غم

خوشی میں برابر شریک ہوتا۔ ان کی بہتر زندگی کی تمنا کرتا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اگر کسی میں کوئی خوبی اور اچھائی دیکھیں، تو اس کی تعریف ضرور کریں۔ گھر میں بچے اسکولوں میں اچھی کارکردگی دکھائیں، تو ان کی حوصلہ افزائی میں کچھ انعام سے نوازیں۔ ہم اس وقت ہی زندہ ہیں جب ہم اپنے آپ کے ساتھ سچے ہیں، جب ہم محبت کرتے ہیں۔ دوسروں کے دکھ، تکالیف، مصائب اور خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔

یہ حقیقی خوشی ہے جس کا اثر دیر تک قائم رہتا ہے۔ زندگی کی مسرتوں کا خزانہ جتنا تقسیم کیا جائے، یہ آپ کے پاس دگنا ہو کر آ جاتا ہے۔ زندگی اور محبت اتنا ہی بڑھتی ہے جتنا ہم اسے خرچ کرتے جائیں۔

کونج

یورپ سے پاکستانی جھیلوں کی طرف ہجرت کرنے والے خوبصورت پرندے کا ماجرا

غلام مصطفیٰ سونگی

جادوئی رقص کے باعث تمثیلی اور علامتی حیثیت حاصل رہی ہے۔ چین، جاپان، کوریا، ویتنام، شمالی امریکا، عربستان کے جنوبی علاقوں اور سندھ میں کونج کی دیومالائی حیثیت بڑی حد تک تسلیم شدہ ہے۔ اسلام سے قبل مکہ میں لات، منات اور عزی نامی تین بت ہوا کرتے تھے۔ ان بتوں کو ”تین اعلیٰ مرتبت کونجیں“ بھی کہا جاتا تھا۔ اس وقت عرب کے لوگوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ یہ تینوں کونجیں آسمان سے نازل ہوئیں اور دیوتاؤں کا درجہ رکھتی ہیں۔

مشہور زمانہ کتاب ”جانوروں کی تاریخ“ (The History of Animals) میں یونانی فلسفی، ارسطو نے کونجوں کی ہجرت کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے ”کونجیں موسم سرما میں (یونانی) نیل ندی پر بہت بڑی تعداد میں آتی ہیں۔ یہ ان کی پسندیدہ ندی ہے۔“ ارسطو مزید رقم طراز ہے ”کونج کے پیٹ میں ایک پتھر ہوتا ہے، جس کے ذریعے کھرا سونا پرکھا جاتا ہے۔“

سندھ کی لوک کہانیوں اور داستانوں میں لکھا ہے کہ جب کونجیں سندھ کی طرف ہجرت کریں، تو کسی بڑی عمر والی کونج کو ڈارکاسٹری یا چوکیدار مقرر کرتی ہیں۔ وہ سنتری کونج اپنے بچے میں ایک پتھر لے کر اڑتی ہے۔ جب دیکھتی ہے کہ کسی کونج پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا ہے، تو اسے بیدار رکھنے کے لیے اسے پتھر دے دیتی ہے۔

کے لوک ادب اور شاعری میں سب سے زیادہ جگہ دنیا لینے والا کونج (Crane) دراصل ایک پہاڑی پرندہ ہے، لیکن میدانی علاقوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ گردن لمبی، سریلی آواز، سحر انگیز اڑان اور پورے کا پورا حسن و جمال ہے۔ ہمارے صوبہ سندھ میں نومبر کے مہینے جب دھان (چاول) کی فصل پک کر زرد رنگ پکڑے، تو کونجوں کے غول یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے پہاڑوں اور میدانوں میں دھان کی فصل پکنے کی منادی کر دی گئی ہو۔ بے چاری کونجیں سارا سال چاول کی فصل کی آرزو مند ہوتی ہیں۔ وہ اپنے پر پھڑپھڑاتیں سندھ کے دھان والے علاقوں کی طرف کئی میل اڑتی اور محبت سے چہچہاتیں بالآخر چاول کی فصل تک پہنچ جاتی ہیں۔ وہ رات کے اندھیرے میں کسی نہ کسی فصل پر اترتیں اور دھان کے چند دانے کھا اپنی آرزو پوری کرتی ہیں۔ ورلڈ کریں فاؤنڈیشن، آئی یو سی این (I.U.C.N) اور وِیلوڈ بلیو ایف (WWF) کی تحقیق کے مطابق کونج سندھ میں ہزاروں سال سے اور بغیر کسی وقفے کے آرہی ہے۔ قدیم دور سے دنیا کی کئی ثقافتوں میں کونج کو خوبصورتی اور

ہمارے پڑوسی اور دوست ملک چین میں کونج کو 'آسمانی پرندہ' سمجھا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ وہ آسمان سے دانش و حکمت لے کر زمین پر آیا اور انسانوں میں بانٹ دی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قدیم دور میں چین کے بزرگ کونجوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر آسمانوں کی سیاحت کیا کرتے تھے۔

چین، جاپان، کوریا اور ویتنام میں کونج کو خوش قسمتی اور طویل عمری کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ ویتنام کے لوگ کونج کو اپنی ثقافت کا اہم حصہ تصور کرتے ہیں۔

پاکستان کی لوگ داستانوں اور مقامی گانوں میں بھی کونج کا ذکر ملتا ہے۔ جیسے ایک مشہور پنجابی گیت کے بول ہیں:

نی سیو کونج وچھڑ گئی ڈاروں نے لہجہ دی سبناں نوں
جاپان میں ماضی میں جاگیرداروں کی طرف سے کونج کو بہت تحفظ ملتا تھا اور کاشت کاروں پر یہ لازم تھا کہ وہ اپنی فصل میں سے کچھ حصہ کونجوں کو بھی کھلائیں۔ بیسویں صدی میں جب جاپان سے جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہوا تو کونج کا تحفظ بھی خطرے میں پڑ گیا۔ لیکن پھر جاپانی حکومت کی طرف سے کونج کو بچانے کی کوششیں کی گئیں۔ جاپان نے اپنے ایک سیٹلائٹ کا نام بھی تسورو یعنی کونج رکھا ہے۔ مزید برآں جاپان میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ اگر کوئی بیمار آدمی ایک ہزار کونجوں کو دیکھے، تو وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔

کونج ایک بڑا، طویل ٹانگوں اور لمبی چونچ والا پرندہ ہے۔ اس کا تعلق پرندوں کے 'گروئیڈا' (Gruidae) خاندان سے ہے۔ اس وقت دنیا میں کونج کی کل پندرہ اقسام پائی جاتی ہیں۔

کونجوں میں 'سارس' (Sarus) سب سے بڑی کونج ہے۔ اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ کونج ہمارے صحرائے ٹھر میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ دنیا کا سب سے زیادہ بلند قامت اڑنے والا پرندہ ہے۔

عظیم سائبیرین کونج کا شمار بھی بڑی کونجوں میں ہوتا ہے۔ اس کا رنگ سفید اور وزن دس کلو سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ آج کل اس کونج کی نسل چند ہزار تک محدود ہو گئی ہے۔ یہ کونج ہر سال

سائبیریا سے چین کی 'پویانگ جھیل'، سندھ کی 'منجھر جھیل' اور 'لنگسی جھیل' اور بھارت کے صوبے راجستھان میں واقع بھرت پور اور سلطان پور کی جھیلوں کی طرف ہجرت کرتی ہے۔

چین کی سرخ تاج والی کونج پوری دنیا میں مشہور ہے۔ چین کے لوگ ادب میں اس کونج کا بھرپور تذکرہ ملتا ہے۔ چین میں اس پرندے کی اڑان، رقص اور مختلف حرکات کے انداز کو زبردست طریقے سے مصوری میں ڈھالا گیا ہے۔

کونجیں بلندی پر خاص نظم و ضبط سے قطار بنائے اڑتی ہیں۔ یہ نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔ ان کا ڈسپلن ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا۔

نومبر کے آغاز ہی میں سرخ تاج والی کونج کے علاوہ دو قسم کی کونجیں سندھ کے نشیبی علاقوں، دلدلوں اور صحرائی میدانوں میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان میں بڑی سرمئی کونج کا قد چار فٹ اور وزن ساڑھے پانچ کلو تک ہے۔ پوری دنیا میں اس کونج کی تعداد دو لاکھ سے لے کر پونے تین لاکھ تک رہ گئی ہے۔

دوسری قسم کی چھوٹی سرمئی کونج سندھ میں خاص طور پر کاچھو کے میدانی علاقوں میں بہت بڑی تعداد میں رین بسیرا کرتی ہے۔ اس کا قد تین فٹ اور وزن دو سے تین کلو تک ہوتا ہے۔ یہ کونج ٹھر کے میدانوں، کوٹ ڈیجی میں واقع مہرانو جھیل، منجھر جھیل، بابچی جھیل، حمل جھیل اور لنگسی جھیل میں بھی موسم سرما میں آتی ہے۔ پوری دنیا میں اس کی تعداد دو سے ڈھائی لاکھ تک ہے۔

کونج موسمی پرندہ ہے۔ یہ اپنی خوراک بھی موسم کے مطابق کھاتا ہے۔ خاص طور پر چھوٹے جنگلی چوہے، مینڈک، مچھلی، کیڑے مکوڑے، دھان کی کھڑی فصل، بیر اور نازک گوشوں والے پودے کونج کی پسندیدہ خوراک ہیں۔

کونج پرندہ انٹارکٹیکا اور جنوبی امریکا کے علاوہ پوری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ کچھ کونجیں دور دراز کے مقامات کا سفر کرتی ہیں اور کچھ بالکل ہجرت ہی نہیں کرتیں۔ کونجوں کی اقسام میں امریکی کونج (Whooping Crane) مٹنے کے خطرے سے دوچار ہے۔

تازہ کہانی

موت کی سرحد سے جا ملتا

انتظار

ایک نادان انسان کی دلخراش کتھا جو اپنے پیاروں کو بھول کر دنیا کی رنگینیوں میں مست ہو گیا

نائلہ بلغ الرحمن

صبح کے چھ بج چکے تھے۔ آمنہ نے نماز پڑھ لی تو حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو گئی۔ عبد اللہ ابھی مسجد سے واپس نہیں آئے تھے۔ آمنہ نے قرآن پاک پڑھ لیا، تو بستر پر تکیے کا سہارا لیے بیٹھ گئی۔ اس

کی نگاہ بار بار کیلنڈر کو دیکھتے کچھ یاد دل رہی تھی۔ وہ بار بار باہر کے دروازے کی سمت دیکھتی۔ رفتہ رفتہ اس کی بے چینی پریشانی میں تبدیل ہو گئی۔ عبد اللہ نماز پڑھ کر فوراً واپس آ جاتے تھے۔ آج جانے کیا بات تھی کہ دیر ہو گئی۔ گھنٹا مزید گزر گیا۔ اچانک اسے باہر کے دروازے پر لگے تالے کے کھلنے کی آواز آئی، تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

”کیا بات ہے، آج آپ نے بہت دیر کر دی؟ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔“ اس نے شوہر سے پوچھا۔

”ہاں راستے میں احمد صاحب مل گئے۔ بس باتوں باتوں میں دھیان ہی نہ رہا کہ وقت کافی گزر چکا اور تم پریشان ہو رہی ہو گی۔“ ناشتا بن گیا۔

”نہیں میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم آؤ تو بناؤں۔“ آمنہ کچھ دیر شوہر کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی ”تم کچھ بھول رہے ہو عبد اللہ!“ نگاہوں میں شکوکے تھے اور نظریں کیلنڈر کی طرف۔

”میں کچھ نہیں بھولا بلکہ تم کچھ بھول رہی ہو کہ آج کے دن کا آغاز ہم کیسے کرتے تھے؟“ دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑے۔



”تو پھر تم نے آج کا کیا پروگرام بنایا؟“ آمنہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”بھئی آج میری بیگم سارا دن آرام فرمائے گی اور مابدولت ان کے ناز اٹھائیں گے۔ سب سے پہلے تو تمہیں بہت بہت مبارک ہو آمنہ، پچاس سال پہلے آج ہی کے دن ایک نازک اندام گڑیا نے میرے گھر میں اجالے بکھیرے تھے۔ گولڈن جوبلی مبارک ہو میری گڑیا سے ہونے والی بڑھیا!“ عبداللہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہیں یاد ہے نا آمنہ، ہم ہر سال یہ دن کیسے مناتے ہیں۔“

دونوں ماضی کی طرف لوٹ گئے۔ دسمبر کی ۲۴ تاریخ تھی جب وہ اسی گھر میں دلہن بن کے آئی۔ موٹی موٹی آنکھوں اور نازک اندام آمنہ نہ صرف صورت بلکہ سیرت میں بھی منفرد تھی۔ دونوں میاں بیوی خوشیوں سے بھرپور زندگی گزارنے لگے۔ شادی کے دو سال بعد احمران کے لیے خوشیاں بن کے آیا۔ وہ بھی ۲۴ دسمبر کو پیدا ہوا۔ عبداللہ نے پہلے دن اپنی بیوی سے ساتھ نبھانے کے جو عہد و پیمان کیے تھے، وہ ہمیشہ ان پر پورا اترے۔ وہ آمنہ کو سکھ پہنچانے کی بھرپور کوشش کرتے۔

شادی کا دن ہمیشہ یادگار طریقے سے مناتے۔ عبداللہ کی خواہش ہوتی کہ آمنہ اس دن مہکتے پھولوں سے سजी رہے۔ دن کا آغاز عبداللہ ایک گلاب دے کے کرتے۔ وہ اپنے ہاتھ سے آمنہ کے بالوں میں پھول لگاتے۔ آمنہ اتراتی ہوئی پھرتی۔ عبداللہ اس دن بیوی کو کوئی کام نہ کرنے دیتے۔ ناشتا باہر سے آتا، دوپہر کا کھانا باہر کھایا جاتا۔ دونوں نئے سرے سے ساری عمر وفاداری نبھانے کی قسمیں کھاتے۔ آمنہ کا دن مزے سے کٹتا۔

وہ ایک سادہ سی عورت تھی۔ جانتی تھی کہ کم آمدنی میں اس نے کیسے گزارا کرنا ہے۔ صابروشا کرتھی۔ اس نے عبداللہ سے کبھی بے جا فرمائشیں نہیں کی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی محبت کا جادو سرچڑھ کے بول رہا تھا۔ عبداللہ نے آمنہ سے بار بار کہا

تھا کہ میں تمہیں بہت زیادہ آسائشیں تو دے نہ سکا، لیکن عمر بھر کوئی تکلیف بھی نہیں دوں گا۔ آمنہ مسکراتے ہوئے احمر کو آگے کر دیتی اور کہتی ”میری باقی ماندہ خواہشات آپ کا احمر پوری کرے گا، ہے ناں احمر؟ اپنی اماں کے لیے بڑی سی گاڑی لائے گا اور بڑے گیٹ والا گھر بنائے گا۔ پھر میرا احمر دلہا بنے گا اور اس گھر میں دلہن چھم چھم کرتی پھرے گی۔“

”چھم چھم کیوں اماں، کیا میری دلہن بکری ہوگی؟“ ایک بار احمر نے معصومیت سے پوچھا کیونکہ حال ہی میں بڑی عید گزری تھی۔ تب عید کے جانور گلے میں رنگ برنگے زیور پہنے گھومتے اور چھم چھم چھم چھم کی آوازیں آتی رہتیں۔

وقت کا پہیہ کبھی نہیں رکتا۔ احمر بڑا ہو گیا، اتنا بڑا کہ اب وہ اس چھوٹے سے گھر میں سما نہیں سکتا تھا۔ پھر وہ بڑا آدمی بن گیا، قابل انجینئر جو تھا۔ اسے پاکستان تو کیا باہر کی کمپنیاں بھی ہاتھوں ہاتھ لیتی تھیں۔ آخر کار اس نے ایک بڑی کمپنی سے معاہدہ کیا اور برطانیہ چلا گیا۔

شروع شروع میں سال دو سال بعد اس کا پاکستان چکر لگ جاتا۔ آہستہ آہستہ دورانہ بڑھتا گیا۔ عبداللہ اور آمنہ اب گھر میں اکیلے رہتے۔ ان کی محبت اسی طرح تازہ تھی۔ عبداللہ نے جو وعدے پہلے دن کیے تھے، وہ ابھی تک نبھاتے چلے آ رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آمنہ بے شک احمر کو بہت یاد کرتی، مگر اس نے دل کو روگ نہیں لگایا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بیٹا اب ایک کامیاب انسان ہے۔ ہر ماں کی طرح وہ بھی ہمیشہ اس کے لیے دعا گو رہتی۔ وہ احمر کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتی تھی۔ آج ۲۴ دسمبر کو بھی وہ اپنے بیٹے کے لیے دعا گو تھی۔

”ناشتے کا کیا پروگرام ہے عبداللہ؟“ آمنہ ماضی سے لوٹ آئی۔

اسی سالہ عبداللہ نے چونک کر آمنہ کی طرف دیکھا اور بولے ”مہارانی صلابہ، تشریف رکھیے، ہم باورچی خانے جا

رہے ہیں۔“

عبداللہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھنے کی سعی کرنے لگے۔ کافی عرصہ ہوا اب وہ باہر کا ناشتا نہیں کھا سکتے تھے۔ کھڑے ہوتے ہوئے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی۔ گھٹنوں کا درد عذاب جاں بن گیا تھا۔ اٹھنے بیٹھنے سے گھٹنوں میں خاصا درد ہوتا۔ پھر وہ شوگر کے بھی مریض تھے۔

”تم رہنے دو عبداللہ، میں جاتی ہوں ناشتا بنانے۔“ آمنہ نے شوہر کی تکلیف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں، آج تم ہمیشہ کی طرح کوئی کام نہیں کرو گی۔ اور آج تو بالکل بھی نہیں، آخر اپنی شادی کی گولڈن جوہلی ہے۔“ لیکن تم ایک کام تو بھول گئے عبداللہ۔“ آمنہ مسکراتی۔

”ہرگز نہیں بھولا۔“ عبداللہ نے اپنی جیب میں ہاتھ مارا، تو ہاتھ میں تسبیح آگئی۔ تسبیح انھوں نے میز پر رکھی۔ دوبارہ جیب میں ہاتھ مارا۔ اب ان کے ہاتھ میں آمنہ اور اپنی دوائی کے ننھے ننھے پلاسٹک کے تھیلے نکلے۔ دوائی انھوں نے قریب کھڑی آمنہ کو پکڑادی۔ اب ہاتھ دوبارہ جیب میں گھس گئے۔

دوائیوں کی رسیدیں، آنکھوں میں ڈالنے والے قطرے کی شیشی، وہ ساری چیزیں میز پر رکھ رہے تھے۔ آخر انھیں مطلوبہ چیز مل گئی۔ وہ مسکرائے۔ اب ان کے ہاتھ میں ایک مڑا تراگلاب کا پھول تھا جو وہ اپنی محبوب بیوی کے لیے لائے تھے۔ اب وہ آمنہ کے قریب ہوئے جو ہنس رہی تھی۔ بولی ”کیا تمہارے گلاب کو بھی شوگر ہے کہ مرجھایا پڑا ہے۔“

”اللہ کی بندی، نماز کے بعد اسی وجہ سے تو مجھے دیر ہو گئی۔ سب سے پہلے احمد کے گھر سے گلاب لیا اور جیب میں ڈالا۔ اچھا نہیں لگتا تھا ہاتھ میں پکڑا ہوا پھول! پھر مجھے یاد آیا کہ ہماری دوا بھی ختم ہو چکی۔ وہ میڈیکل اسٹور سے خریدی۔ کئی دنوں سے آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ سو چا آئی ڈراپ بھی لے لوں۔ گھر آیا تو باتوں میں پھول نکالنا یاد نہ رہا۔“ انھوں نے گلاب آمنہ کے بالوں میں لگاتے ہوئے کہا۔

پھول لھسک کے نیچے لر پڑا۔

”عبداللہ! تمہارا یہ پھول میرے مرجھائے بالوں میں کس طرح نکلے گا۔ لاؤ مجھے پکڑا دو کوئی دیکھے گا، تو کیا سوچے گا کہ بوڑھا بڑھیا سٹھیا گئے ہیں۔“

”کوئی کچھ کیوں کہے بھئی؟ میرے رب نے اگر اتنے ڈھیروں سال ہمیں خوشیاں سمیٹنے کے لیے دیے ہیں، تو کیوں نہ ہم بھرپور طریقے سے انھیں گزاریں۔ اگر ہم بوڑھے ہیں تو کیا ہوا، ہماری محبت تو جوان ہے۔ کیا بڑھاپے میں محبت کم ہو جاتی ہے، نہیں بلکہ یہ تو بڑھتی جائے گی۔“

”اچھا ہیر و صاحب، اب کھانے کا کچھ کرو۔ دل ڈوب رہا ہے بھوک سے، ویسے تم کھلا کیا رہے ہو؟“

”چائے پاپے اور کیا؟ تم جانتی تو ہو آمنہ کہ بازار کی کوئی بھی چیز اب میرا معدہ قبول نہیں کرتا۔ اب صبح چائے پاپے، دوپہر کو بغیر گھی کی چینی پیتے ہیں اور شام کو کھانا تو ہم کھاتے نہیں، تھوڑا کسٹرڈ بنالیں گے۔“

”لیکن تم نے تو میٹھا کھانا نہیں اور نہ ہی میں تمہیں کھانے دوں گی۔ بلا وجہ اپنی شوگر بڑھا لو گے۔ کسٹرڈ رہنے دو۔ اچھا ایک بات کہوں، آج باہر گھومنے چلیں کیا؟“

یہ سن کر عبداللہ کو اپنی بیگم پرانی والی آمنہ لگی۔ شادی کی سالگرہ والے دن آمنہ ہمیشہ عبداللہ سے باہر جانے کی فرمائش کرتی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ سارا دن شوہر کے ساتھ گزارے۔ دونوں اس دن کو یادگار کے طور پر منانا چاہتے تھے۔ سو شہر سے دور کسی پرسکون جگہ بیٹھ جاتے۔ مستقبل کے سہانے خواب دیکھے جاتے۔ دوپہر کا کھانا باہر کھاتے اور شام ڈھلے گھر لوٹتے۔ ”کہاں جاؤ گی اور کیسے جاؤ گی؟ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اتنی ہمت اور طاقت ہے تم میں؟ تمہارا چلتے ہوئے سانس پھول جاتا ہے۔“

”مگر میرا دل چاہ رہا ہے، آج میں ان تمام جگہوں کی سیر کروں جہاں جہاں ہم شادی کے اولین برسوں میں جایا کرتے

بھے ہم رتے پر جا میں کے۔“ آمنہ نے فیصلہ سنا دیا۔

”رکشا تو بہت پیسے لے گا۔ تمہیں معلوم تو ہے آمنہ، آخری تاریخیں چل رہی ہیں۔ پنشن بھی ختم ہونے والی ہے۔ اس بار تمہاری بتیسی بھی نئی لگوائی ہے، اس پر کافی خرچہ ہو گیا۔“ عبداللہ نے جواز پیش کیا۔

”واہ صاحب، اب مجھے اپنی بتیسی کے طعنے ملنے لگے۔ بیوی تمہاری ہوں، تو بتیسی بھی تم ہی نے لگوائی تھی۔ کیا پڑوسی لگوا کے دیتے؟“ آمنہ غصے میں آکر زور زور سے اپنی بتیسی ہلانے لگی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد دانت اس کے ہاتھ میں آ گئے۔ ”لو پکڑو اپنی بتیسی، مت کرو احسان مجھ پر۔“ آمنہ نے بتیسی عبداللہ کی طرف پھینک دی۔

وہ یک دم پریشان ہو گئے کہنے لگے۔ ”آمنہ! پچاس سال گزر گئے، وقت کتنا بدل گیا، لیکن تم نہیں بدلی۔ منٹ میں ناراض ہو جاتی ہو۔ میں نے تو ویسے ہی کہا تھا۔ تم سے اچھا ہے کچھ؟“ بولو“

عبداللہ آمنہ کی تلخی کا سبب جان گئے تھے۔ کہنے لگے ”اچھا چلو اٹھو شام پہلے ناشتا کرلو، باہر بھی چلتے ہیں۔ جلدی سے اپنی بتیسی فٹ کرو، میں ابھی ناشتا لایا۔“

☆ ☆

”بس بھئی، رکشے والے اسی جگہ روک دو۔“ رکشے والا حیرانی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں دریائے راوی کے کنارے کھڑے تھے۔

”یاد ہے نا عبداللہ، ایک بار میں نے یہاں آنے کی کتنی ضد کی تھی اور وہ بھی رات کو! ہم کنارے پہ پر سکون جگہ ڈھونڈ کے بیٹھ گئے تھے۔“

”ضدی تو تم شروع سے ہی ہو۔“ یہ کہہ کر عبداللہ ہنسنے لگے۔ کئی سال گزر گئے تھے اس بات کو، جگہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ لیکن اس جگہ کھڑا جوڑا ویسا نہ رہا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ اپنے پرانے ٹھکانے پر پہنچ نہ پائے کیونکہ دونوں میں

پہلے جیسا دم خم نہ رہا تھا۔ آخر وہ ایک جگہ پتھر یلے بچ دیکھ کر بیٹھے اور اپنا حسین ماضی یاد کرتے رہے۔

☆ ☆

شام ڈھلے دونوں گھر پہنچے۔ وہ تھک کے چور ہو چکے تھے۔ ”اب تو خوش ہو آمنہ؟“ عبداللہ نے تھکن بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں بہت زیادہ۔“ آمنہ نے سرشار لہجے میں جواب دیا رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم لیٹے تھے۔ آمنہ دیکھ رہی تھی کہ عبداللہ بے چینی سے ادھر ادھر کروٹیں لے رہے ہیں۔ ان کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ شاید رو رہے ہیں بغیر آواز کے! سر ہانے رکھا موبائل وہ بار بار دیکھ رہے تھے۔۔۔۔ شاید کوئی میسج یا کوئی مس کال۔۔۔۔

عبداللہ سوچ رہے تھے کہ آج احمر بھی بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھا اپنی سالگرہ منا رہا ہوگا۔ کیا وہ بھول گیا کہ اس کے والدین یہ دن ہمیشہ کیسے منایا کرتے تھے! کیا اسے یاد نہیں، دور بیٹھے بوڑھے ماں باپ اس کی ایک کال کے منتظر ہیں؟ امید کا ننھا سا دیا ابھی روشن تھا، شاید احمر کا فون آ ہی جائے، ابھی تو ۲۲ تاریخ ختم ہونے میں آدھا گھنٹا باقی ہے۔

وہ پھر سوچنے لگے، انھوں نے آج بھی آمنہ کو اتنا مصروف رکھا کہ وہ سارا دن یہ سوچ ہی نہ سکی، ہمیشہ کی طرح احمر ان کا وجود بھلائے بیٹھا ہے۔ عبداللہ کو وہ دن یاد آیا جب احمر کی کوئٹہ میں بہت اچھی ملازمت لگی تھی۔ آمنہ اور عبداللہ بہت زیادہ خوش تھے۔ پھر احمر نے انھیں بتایا کہ کوئٹہ میں اسے بہت اچھا گھر مل گیا ہے۔ ”اماں اب آپ اپنے سارے ارمان اس گھر میں پورے کرنا۔“ اس نے کہا تھا۔

آمنہ نے فخر سے بیٹے کی جانب دیکھا تھا۔ احمر کی جلد ہی شادی کر دی گئی تاکہ اسے گھریلو مسائل سے سابقہ نہ پڑے۔ پھر دونوں میاں بیوی سوچنے لگے کہ وہ احمر کے پاس کوئٹہ چلے

جائیں۔ ان کے لیے تنہا رہنا مشکل ہو گیا۔ اب وہ اپنی ذمے داریوں سے فارغ ہو چکے تھے۔ بیٹے کی جدائی بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”عبداللہ! احمر کو فون کرو، اب میں بالکل بھی نہیں رہ سکتی احمر کے بغیر۔ ویسے بھی بیٹا بہو پریشان ہوں گے کہ ماں باپ نے کوئٹہ بھیج کر دوبارہ خبر ہی نہیں لی۔ وہ دونوں تو اپنی اپنی ملازمت پر چلے جاتے ہیں، بھلا نوکروں کے سہارے بھی گھر چلتے ہیں؟ میں سنبھالوں گی گھر تاکہ دونوں بغیر کسی پریشانی کے اپنے فرائض انجام دے سکیں۔“ آمنہ نے کوئٹہ جانے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔

فون کرنے کے کچھ ہی دن بعد احمر بغیر اطلاع کے آگیا۔ آمنہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ”لوجی میاں صاحب، تیاری پکڑو۔ میرا شہزادہ آگیا ہمیں لینے۔ اور ہاں تم ایسا کرو کہ ساتھ والوں کے بچے بلوا کے سارا سامان ایک ہی کمرے میں رکھ کر تالا لگا دو۔ تم اکیلے اتنا کام نہیں سنبھال پاؤ گے۔“ آمنہ کی خوشی سنبھالنے نہیں سنبھل رہی تھی۔

”ہاں ہاں فکر نہ کرو تم، میں نے احمد سے کہہ دیا ہے، وہ میری مدد کرے گا۔“ عبداللہ نے آمنہ کو جواب دیا۔

”میں نے کھانا بنا دیا ہے۔ میں ذرا خالہ سکینہ کا پتا کر آؤں، کافی بیمار ہیں۔ پھر شایہ ملیں نہ ملیں، سب زندگی کے میلے ہیں۔ ہم نے ویسے بھی چلے ہی جانا ہے۔“

آمنہ چلی گئی۔ دونوں باپ بیٹائی وی دیکھ رہے تھے۔ باپ نے پوچھا ”احمر یار کب تک چلنا ہے، ہماری تیاری تو مکمل ہی ہے۔“

”کہاں؟“ احمر نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز آہستہ کرتے ہوئے کہا۔

”کوئٹہ اور کہاں؟ کافی کام تو سمٹ گیا، بس ایک دو دن اور لگیں گے گھر سمیٹنے میں۔ اب ہم سے تنہا نہیں رہا جاتا بیٹا۔“

”لیکن بابا.....“ احمر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”بولو۔“ عبداللہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ احمر نے نظریں جھکائی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ پایا۔ ”آپ کی بہو کو آپ کا کوئٹہ آنا اچھا نہیں لگ رہا۔“ آخر احمر نام لہجے میں بولا۔

عبداللہ گم صم بیٹھے رہ گئے۔

”بابا آپ کی بہو بہت ضدی عورت ہے۔ آپ کو کیا معلوم، آپ کے فون آنے پر اس نے کتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میں نے ہر طرح سے اسے منانے کی کوششیں کیں مگر.....“

احمر بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔ ”اور بابا، میں آپ دونوں کا خرچ بھیجتا رہوں گا۔“

”بس احمر بس!“ عبداللہ صاحب چیخ اٹھے ”ہمیں تمہارے خرچے یا دولت کی ضرورت نہیں۔ احمر ہم بھوک تو برداشت کر سکتے ہیں مگر تنہائی نہیں۔ ابھی میں اپنا اور تمہاری ماں کا خرچ اٹھا سکتا ہوں۔ تمہارے سہارے کے بغیر بھی ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ میرا رب ہے نا سبب بنائے والا۔ میری پنشن ہم دونوں کے لیے کافی ہے۔ تم کیا سمجھ رہے ہو کہ ہم خراج وصول کر رہے ہیں؟ تمہاری پرورش ہمارا فرض تھا جو ہم نے نبھایا۔“

”ہاں ایک احسان ضرور کرو ہم پہ، تم پاکستان چھوڑ دو۔ تم یہاں رہو گے، تو تمہاری ماں بے چین رہے گی تمہارے لیے۔ جانتے ہو تم میں آمنہ کی جان ہے۔ تیری ماں وہ عورت ہے جو صرف محبت کی مٹی سے بنی ہے۔ وہ جواب میں محبت ہی چاہتی ہے اور تو نے تو اسے آسمان سے اٹھا کے زمین پہ گرا دیا۔ اس کے سارے خواب چکنا چور کر دیے۔ مگر میں ابھی زندہ ہوں، اسے خاک میں رلنے نہیں دوں گا۔ ہمارے حال پر رحم کر بچے!“

عبداللہ صاحب روتے ہوئے احمر کو کہہ رہے تھے۔

اگلے دن احمر واپس چلا گیا۔ عبداللہ نے تبھی آمنہ کو مبارک باد دی ”مبارک ہو آمنہ، تیرا بیٹا کامیابی کے ایک اور زینے پر چڑھ گیا۔ اپنے احمر کو برطانیہ سے بلاوا آیا ہے۔ بہت بڑی کمپنی ہے، تنخواہ بھی زیادہ ہے۔ احمر آیا بھی اسی لیے آیا تھا۔ وہ ہم دونوں

کے لیے پریشان تھا۔ میں نے جانے کی اجازت دے دی۔ احمر تو کہہ رہا تھا کہ برطانیہ جاتے ہی ہم دونوں کو بلوالے گا۔ میں نے کہا، تم پہلے اپنے قدم جمالو وہاں، ہم بھی آہی جائیں گے۔ میں نے صحیح کہنا آمنہ؟“ عبداللہ نے آمنہ سے پوچھا۔
”آپ نے کبھی کچھ غلط نہیں کیا، تو آج بھی صحیح قدم اٹھایا۔“ آمنہ نے جواب دیا:

آج پھر ۲۴ دسمبر تھا۔ گواب ان کی صحت نے دم خم چھین لیا تھا پھر بھی وہ آمنہ کی خوشنودی میں لگے رہے۔ وہ آج کے دن اسے خاص طور پر مصروف رکھتے تاکہ آمنہ کچھ بھی نہ سوچ سکے۔ آمنہ کو تو انھوں نے سلا دیا مگر خود بے سکون ہو رہے تھے۔ آج ان کی شادی ہوئی تھی، تو احمر بھی پیدا ہوا تھا، ان کا مان اور بازو! عبداللہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ بے آواز رو رہے تھے۔ کروٹ لیے ہوئے تھے تاکہ آمنہ ان کا چہرہ نہ دیکھ لے۔ وہ بار بار اپنا موبائل چیک کر رہے تھے..... شاید آج احمر کو خیال آہی جائے!

دوسری چار پائی پرلیٹی آمنہ سوچ رہی تھی ”عبداللہ ہر سال کی طرح اب بھی تم نے اپنے زخم چھپا کر ایک تڑپتی ماں کے دل کو سکون پہنچانے اور اپنے بیٹے کا بھرم رکھنے کی خاطر سارا دن بچوں کی طرح مناتے گزارا۔ عبداللہ تم نے بیٹے کا مان رکھا تو میں تمہارا بھرم کیسے توڑ دوں؟ ایک ماں کے دل کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے تم نے اپنا سینہ زخمی کر لیا۔

تم نہیں جانتے، میں نے اسی دن سب کچھ سن لیا تھا۔ خالہ سکینہ کا پتا کرنے لگی، تو وہ اسپتال جا چکی تھی۔ میں جلد لوٹ آئی۔ دیکھا تم احمر کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہو۔ جو میں نے دیکھا اور سنا، وہ کسی پہاڑ سے بھی بھاری غم تھا۔ تم صرف اسی لیے باپ ہو کر بیٹے کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے تھے کہ تمہاری آمنہ کو کوئی دکھ نہ پہنچے۔ میں نے بھی تمہارا بھرم رکھا۔ احمر کے بارے جو تم کہتے گئے میں مانتی گئی۔ تم کہتے، آمنہ اس گھر میں تیری ڈولی آئی تھی، اس گھر میں ہم نے اپنی محبتوں کے بہت سے

یادگار دن گزارے ہیں، میں یہ گھر چھوڑنا نہیں چاہتا۔
”میں نے کہا، مست چھوڑو۔ تم نے کہا، مجھے گوروں کے دیس نہیں جانا۔ میں نے چپ چاپ تمہاری تائید کر دی۔ میں نے کبھی تمہیں محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ میں سب جان چکی۔ میں کئی بار تمہیں راتوں کو آنسو بہاتے دیکھتی ہوں۔ اگر ماں کا دل بیٹے کے لیے تڑپتا ہے، تو باپ کا دل بھی تو اسی لوٹھڑے سے بنا ہے جس سے ماں کا قلب!“

اس نے دیکھا، عبداللہ نے ایک بار پھر تکیہ اٹھا کے موبائل نکالا اور واپس رکھ دیا۔ ”عبداللہ!“ آمنہ نے آہستہ سے آواز دی۔ وہ ایک دم ہڑبڑا گئے۔

”ہوں۔“ انھوں نے دھیمی آواز میں جواب دیا
”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟ کب سے سڑسڑ کر رہے ہو۔“
”شاید ٹھنڈ لگ گئی۔ سارا دن تمہیں لیے لیے پھرا ہوں، زکام ہو گیا۔ آنکھوں سے پانی بہ رہا ہے۔“ عبداللہ نے آمنہ کی طرف کروٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے بہتا پانی صاف کر رہے تھے۔

”موبائل بند کرو عبداللہ، اب رات کو بھلا کس کا فون آنا ہے۔ بار بار موبائل دیکھ رہے ہو۔ ابھی صبح ہونے میں دیر ہے۔ میں جانتی ہوں، تمہیں پریشانی ہے کہ کہیں صبح اٹھنے میں دیر ہو جائے۔ میں ہوں نا، تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔“
آمنہ نے گہری بات کہہ ڈالی تھی۔

”تم سکون سے سو جاؤ، میں نے صبح کے لیے الارم لگا دیا ہے۔“ آمنہ نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے عبداللہ سے کہا۔
دونوں اپنی اپنی سوچوں میں کم ایک دوسرے سے اپنے دکھ اور آنسو چھپاتے اندھیرے میں جانے کیا تلاش کرنے لگے۔
نیندان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ۲۴ دسمبر ختم ہوتا جا رہا تھا، مگر دونوں کا انتظار ختم نہ ہوا۔ بارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ شاید کوسوں میل دور بیٹھے احمر کو خیال آہی جائے شاید..... دونوں موبائل فون بجنے کے منتظر تھے۔

صفر

پُر پیچ انسانی جذبات و احساسات
عیاں کرتی ایک کرب ناک کتھا

نیلا فرا اقبال



لاہور سے کراچی کا سفر کرتے ہوئے
شکیل کے پاس سوچنے کے لیے پورا

ڈیڑھ دن تھا۔ اس کا بیٹا نشست پر پاؤں

رکھ پھلانگتا ہوا اوپر والی برتھ پر چڑھ چکا تھا۔ شکیل نے اپنا بیگ،
جس میں تولیہ، بنیان اور شیو کا سامان وغیرہ تھا، سر کے نیچے رکھ لیا
اور ٹانگیں پسار لیٹ گیا۔ سامنے والی نشست پر سات آنٹھ ماہ کا
بچہ آدھی نشست گھیرے سویا پڑا تھا۔ ”یہ بچہ ضرور سارے راستے
تنگ کرے گا۔“ شکیل نے سوچا۔ ”... بس جاگنے کی دیر ہے۔“
بچے کی ماں اطمینان سے کوئی رسالہ پڑھنے میں مجھٹی۔
پاؤں کے پاس پانی کی صراحی رکھی تھی۔ ”بس اب کمپارٹمنٹ
کے آدھے فرش پر پانی ہوگا جو فرش کی گندگی کے ساتھ مل کر کیچڑ نما
سا بن جائے گا۔“ صراحی کے برابر ناخچی رنگ کی پلاسٹک ٹوکری
تھی، جس میں سے پراٹھوں اور آملیٹ کی مخصوص خوشبو کے بھکے
سے اٹھ رہے تھے۔ بیوی نے بھی کھانا ساتھ دینے کا ارادہ کیا تھا،
لیکن بیٹے نے اس پر شدید احتجاج کیا تھا اور ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ
وہ ڈائننگ کار کا کھانا ہی کھائے گا۔

جانب دیہی مناظر دکھائی دینے لگے تھے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی
کے پہیوں کی آواز ایک مخصوص لے میں ڈھل گئی۔ شکیل نے
دھیرے دھیرے اس کے ساتھ ایک فلمی گانے کے سر ملانے کی
کوشش کی۔ پھر دوسرے تیسرے بند پر پہنچ کر اس نے کچھ سوچ
کر خود کو روک لیا۔ کیا یہ موقع خوش ہو ہو کر گانے کا ہے؟
”نہیں، شاید مجھے رنجیدہ ہونا چاہیے۔ لیکن میں منافق تو
نہیں کہ خواہ مخواہ غمزہ ہونے کی اداکاری کروں۔“ وہ خط
اسے وہ خط یاد آ گیا جو دراصل اس سفر کا باعث تھا۔ اس نے لیٹے
لیٹے بڑی مشکل سے پتلون کی جیب میں ہاتھ گھسا کر لمبا بے تکا
سادہ کاغذ نکالا جس پر بہن کی مخصوص بدخطی میں لکھی ہوئی تحریر تھی:
”پیارے بھائی! خوش رہو۔ یہ خط ملتے ہی تم کراچی چلے
آؤ۔ بھائی شوکت کی حالت بہت خراب ہے۔ خدا جانے
تمہارے پہنچنے تک رہے بھی کہ نہ۔ اب دس دن سے وہ اسپتال

گاڑی شہری مضافات پیچھے چھوڑتی، کھلے میدانی علاقے
میں داخل ہو رہی تھی۔ کھڑکیوں میں سے اب پنڑی کے دونوں

میں ہے۔ کینسر جگر سے ہو کر معدے اور پھیپھڑوں تک پھیل چکا۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے، مشکل سے چار پانچ دن اور ہیں۔ اللہ اس پر رحم کرے! اب ضروری بات یہ ہے کہ شوکت بھائی کا فلیٹ خالی کر کے ہم نے چابی مالک مکان کو دے دی ہے اور اس کا سارا سامان ہم لے آئے ہیں۔ کئی قالین ہیں، صوفے ہیں، فریج، ٹی وی، بے شمار کپڑے اور کراکری ہے۔ بہن شمیم نے فیصلہ کیا ہے کہ سارا سامان تمہیں دے دیں۔ اس بد نصیب کی تو بیوی ہے اور نہ اولاد۔ ویسے بھی اس کی کمائی جس طرح کی تھی، ہم اس میں سے کچھ نہیں لینا چاہتیں۔ تم واپسی پر بک کرا کے سارا کچھ ساتھ لے جانا۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتا ہے اور بلوایا ہے۔ امید ہے تم خط پڑھتے ہی آ جاؤ گے۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے!..... تمہاری بہن۔“

شکیل نے اطمینان سے خط کو تہ کیا اور سر ہانے رکھے بیگ میں اڑس دیا۔ لیکن اطمینان کا یہ احساس چند لمحوں بعد ندامت اور احساسِ جرم سا بن گیا..... میرا بھائی..... میرا بھائی مر رہا ہے..... کیا مجھے اس کے مرنے کا کوئی رنج نہیں؟ میری آنکھیں بار بار چھلک کیوں نہیں رہیں۔ بار بار؟ میری آنکھیں تو ایک بار بھی نہیں چھلکیں..... کیا اس میں قصور میرا ہے؟ اگر میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا تو کیا سارا قصور میرا ہے؟

نہیں..... اگر میں کسی سے محبت نہیں کرتا تو قصور میرا نہیں دوسرے کا بھی ہے۔ رشتہ دار، عزیز یا اپنا ہونا الگ چیز ہے اور محبت کے قابل ہونا قطعی الگ چیز..... اور یہ شوکت بھائی؟ بلاشبہ یہ ایک ایسا شخص تھا جس کے ساتھ ایک کمرے میں بھی کچھ دیر ٹھہرنا میرے لیے محال ہوا کرتا تھا، گفتگو کا وہ بیہودگی کی حد تک جارحانہ انداز جس مزاح میں وہ لچر پن کہ سننے والے تو بہ تو بہ کراہیں اور زندگی کے بارے میں ایسا غیر سنجیدہ اور سطحی انداز فکر کہ اپنی زندگی کو بد نظمی، ناکامی اور تباہی کی مثال بنا کر رکھ چھوڑا..... یہ تھا شوکت بھائی!

میرا بچپن برباد کرنے میں کس قدر اس کا ہاتھ تھا۔ وحشیانہ مار پیٹ اور اذیت پسندی کی ایسی جدت طرازیوں..... وہ واقعہ میں کیسے بھول سکتا ہوں جب اس نے مجھے انار کے درخت کے ساتھ

باندھ دیا تھا۔ درخت پر رینگتے وہ سیاہ موٹے موٹے لکڑے! میرے بازوؤں اور رانوں پر اس نے شہد مل دیا تھا۔ اس دن مارتے مارتے اباجی کی لٹھی ٹوٹ گئی تھی۔ پھر بلوغت..... رات کے دو دو بجے چٹاخ چٹاخ دیوار سے جوتے پھینکنے کی آواز پھر بلی کی طرح دیوار پھلانگ کر اندر آنا۔ اب اباجی نے مارنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب وہ آگے سے ڈنڈا پکڑ لیتا تھا..... جوانی جو آگئی.....

وہ اور اس کے دوست امتحانی سینٹروں میں پیسہ کھلاتے، ایک دوسرے کی جگہ پر بچے دیتے امتحان پاس کرتے چلتے گئے۔ پھر ایک ایسے محکمے میں ملازمت ملی جہاں روپیہ بنانے والوں کی چاندی تھی۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ شوکت بھائی لاکھوں میں کھیلنے لگا۔ اماں نے ایک شریف لڑکی سے شادی کروادی۔ لیکن شریف عورتیں اسے کہاں راس آتی تھیں۔ لڑکی جا کر ماں باپ کے گھر بیٹھ گئی اور وہ کراچی چلا گیا۔ پھر شادیوں اور طلاقوں کی خبریں آنا معمول بن گیا۔ کبھی کبھار گھر والوں سے کسی موقع پر ملتا۔

بہنیں تازہ ترین بھاوج سے ملوانے کی فرمائش کرتیں..... ”وہ اس قابل نہیں کہ آپ ملیں، فیملی ٹھیک نہیں“ وہ کہتا۔ ”پھر لعنت ہے تجھ پر“ وہ جل کر کہتیں اور وہ ڈھٹائی سے ہنستا۔ ادھ کھلے سوٹ کیسوں سے بھڑکیلی ٹائیاں، سلک کی قمیصیں اور رنگ برنگے دھاری دار زیرجامے جھانکتے۔ بچوں کے ہاتھوں پر ہزار ہزار کے نوٹ دھرتا۔ جب تک رہتا مٹھائیوں اور پھلوں کی ریل پیل رہتی..... ”بڑا بادشاہ آدمی ہے..... بڑی شاہی طبیعت پائی ہے۔“ سب کہتے..... یہ تھا شوکت بھائی!

دوسری طرف شکیل کی اپنی زندگی تھی۔ ہائی اسکول ٹیچر کی سخت زندگی، محنت زیادہ اور کم معاوضہ۔ اب جبکہ وہ خود کو سینئر استاد سمجھنے لگا تھا تو کیا حاصل کر پایا..... قسطوں پر حاصل کیے گئے پانچ مرلوں پر مکان، جس کے لیے وہ کم از کم چار آدمیوں کا مقروض تھا۔ پرانالی وی جو گھر کے بجائے مرمت کے لیے دکان پر زیادہ رہتا تھا۔ چھوٹا سا کینڈہنڈ فریج جس میں سے پانی ٹپک ٹپک کر جمع ہوتا رہتا تھا اور جس میں اب کھیاں اور چیونٹیاں آزادی سے آنے جانے لگی

تھیں..... اور کار..... کار تو وہ چیز تھی جس کے بارے میں وہ جاگتی آنکھوں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا کوئی شاگرد اسے ویگن اسٹینڈ پر کھڑے دیکھ کر اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ یا کار روک کر پہنچا دینے کی پیش کش کرتا، تو وہ کتنی سکی محسوس کرتا تھا.....

اور اب..... اب اس کا بھائی اسے وہ سب کچھ دیے جا رہا تھا جو وہ برسوں جان مارنے کے بعد بھی حاصل نہ کر پایا تھا..... کیسی انہونی اور انوکھی صورت حال تھی! یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا..... اس کا بھائی مر رہا تھا اور اپنا سب کچھ اسے دیے جا رہا تھا..... بھائی کی موت..... موت..... میرا بھائی مر رہا ہے!..... بھائی..... میرا بھائی..... میرا بے چارہ بھائی۔ اس نے کئی بار دل ہی دل میں دہرایا۔ اس کے دل میں اچانک گداز سا پیدا ہوا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ کہنی کے خم سے اس نے آنکھیں خشک کیں۔ ساتھ ہی اطمینان کی ایک لہری اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ بھائی کی حالت پہ اپنی سخت دلی اور لائقیتی پر جو ندامت سی تھی، آنکھوں میں آئی ہوئی اس ذرا سی نمی میں گھل کر ڈھل گئی۔

ریل اگلے روز دوپہر کے قریب کراچی پہنچ گئی۔ گھر پہنچے تو کھانے کا وقت تھا۔ اس کی بہنیں مضطرب اور تھکی تھکی سی تھیں۔ ”تھک گئیں، ہم تو بالکل..... پھر کیا کریں..... بھائی جو ہوا“ بڑی بہن تنہا نے کہا۔ ”کھانا کھا کر ذرا تھکن اتار لو..... پھر شام کو رکشا لے کر اسپتال چلے جانا..... ہم ذرا آرام کر لیں گی آج۔“ ”رکشا کیوں؟ گاڑی نہیں کوئی؟“

”وہ تو بڑا لے جاتا ہے دفتر۔ دیر سے آتا ہے۔ اور ملاقات کا وقت پانچ سے سات ہے۔“ ”اور شوکت بھائی کی گاڑی؟“ ”شکیل نے بڑے قدرتی انداز سے پوچھا۔

”وہ“ بہن نے ”وہ“ کو لمبا کھینچا ”وہی بیچ کر تو اسپتالوں کے خرچے اٹھائے جا رہے ہیں..... پینسٹھ ہزار میں بکی تھی۔ اب پندرہ گئے ہیں..... لگتا ہے پورے ہی ہو جائیں گے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اور جی پی فنڈ..... بینک بیلنس..... نقد رقم..... کچھ نہیں؟“ ”نقد..... خاک اور مٹی.....“ ”اور پلاٹ..... پلاٹ بھی تو تھا؟“

”وہ تو اس نامراد..... میرے منہ سے کچھ نکلے گا..... اس نے دو سال پہلے ہی بیچ باج کر شادی کر لی تھی..... خدا جانے کدھر کی تھی..... بڑے زیور چڑھائے نامراد کو..... بہنوں کو تو کبھی چھلا تک نہ دیا۔ مشکل سے ایک سال گزارا کیا اس بد ذات نے..... جو کچھ بچا تھا وہ دے دلا کر جان چھڑائی اس سے..... یہ تو حال تھا تمہارے اس بھائی کا..... بد نصیب!“

”بد نصیب“ شکیل غصے سے بھنا کر بولا: ”ایسے لوگ بد نصیب نہیں ہوتے..... بد فطرت..... بد اطوار..... بد نظم..... بد خصلت..... بدنیت..... بد اور صرف بد.....“ ”بس کر شکیل..... بس کر..... رہنے دے۔ مر رہا ہے بد نصیب۔ بس کچھ نہ کہو اس کو۔“

”کیوں نہ کہوں کچھ کہہ بیٹھوں گا میں آپ کو بھی کیوں نہ کہوں؟ کبھی پوچھا اس نے اپنوں کو؟ اب یاد آئے نا اپنے..... لاکھوں کمائے، لاکھوں اڑائے..... اوباش لنگے دوستوں، آوارہ عورتوں اور ان کے ذلیل ہوتوں سوتوں پر..... اور اب سنبھالنے کا وقت آیا ہے تو ہم لوگ؟ کہاں ہیں وہ سارے جن کو بلا بلا کر شراہیں پلاتا تھا..... ٹھیک ہے وہ کراچی میں رہتا تھا، میں لاہور میں، لیکن رپورٹیں دینے والے بھی بہتیرے تھے۔ ساری عیاشی کی داستانیں پہنچتی رہتی تھیں۔ پچیس سال سے کیسے گزارا کر رہا تھا اس کا بھائی، کبھی پوچھا؟ ایسے بے فیض لوگ، جو اپنا بھلا کر سکیں نہ کسی دوسرے کو فیض پہنچا سکیں، صفر کہتا ہوں میں ایسے لوگوں کو..... صفر بنا صفر..... زندگی میں بھی صفر..... موت میں بھی صفر۔“

”رحم کر شکیل اس پر۔ بیٹا بیٹھا ہے تیرا..... چپ کر جا۔ بس معاف کر اسے۔ دیا نہیں تو کچھ لیا بھی تو نہیں کسی سے اس نے..... اب تو دے کر ہی جا رہا ہے بے چارہ سب کچھ..... ساتھ تو کچھ نہیں لے جا رہا۔“ اس کی بہن بڑبڑاتی، باورچی

خانے میں چلی گئی۔

”اب بھی نہ دیتا“ شکیل کرسی دھکیل کر اٹھتا ہوا بولا اور پھر اپنے اس سفید جھوٹ پر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی اسے سامان والا کمر اکھول کر دکھائی دے، لیکن بھائی کے متعلق وہ اتنا کچھ بک چکا تھا کہ ایسی خواہش کا اظہار منہ سے اب نہ چتا۔

شام کو اسپتال جانے کے لیے نکلا، تو سامان والے کمرے کی کھڑکیوں کے سامنے سے گزرنا پڑا۔ دل چاہا کہ جالیوں میں سے جھانک لے، لیکن بیٹے کی وجہ سے جھجک گیا۔ اچانک اس کا بیٹا ٹیکسی ٹیکسی کہتا گیٹ کی جانب دوڑا۔ اس نے بے ساختہ کھڑکی کی جالی کے ساتھ منہ لگا کر جھانک لیا۔ کارٹن پر کارٹن اور چیزوں پر چیزیں چڑھی نظر آئیں۔ بالکل سامنے بارہ کیوبک فٹ کا فریج دھرا تھا اور اس کے پہلو میں شاید ایرکنڈیشنر..... راستے بھر وہ سوچتا رہا..... ٹھیک ہے یہ سب مجھے مل رہا ہے، لیکن اس میں شوکت بھائی کا احسان مند ہونے والی کوئی بات نہیں۔ چونکہ کوئی دوسرا قانونی وارث نہیں تھا، لہذا میرا حق بن گیا۔ اس میں احسان، مروت یا محبت والی کون سی بات ہے؟

اسپتال کے برآمدوں کی بھول بھلیاں میں وارڈ نمبر ۶ تلاش کرتے شکیل نے بڑی کوفت سے سوچا کہ آج یہ آدمی اس حال کو پہنچ گیا ہے کہ پرائیویٹ کمرات تک لینے کے قابل نہیں۔ وارڈ میں پڑا ہے..... کیسا افسوس کا مقام ہے!

پوچھتے پچھاتے آخر وہ وارڈ نمبر ۶ پہنچ گئے۔ دروازے میں کھڑے ہو کر نظر دوڑائی، سفید چادروں اور سرخ کمبلوں سے آراستہ تین تین کی قطار میں چھ بیڈ لگے ہوئے تھے۔ لیکن شوکت بھائی کسی بیڈ پر نہیں تھا..... شکیل نے ایک وارڈ بوائے سے پوچھا۔

”شوکت صاحب؟ بیڈ نمبر ۵.....“ وہ سامنے! وارڈ بوائے نے اشارہ کیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور بستر کے پاس جا کر ششدر سا کھڑا ہو گیا۔ یہ چھوٹا سا سکڑا ہوا مکوڑا نما آدمی بھائی شوکت ہی تھا۔ اس وقت وہ کسی قیص میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ جس طرح کوئی کیڑا پشت کے بل گر پڑنے سے کلبلاتا ہے،

اسی طرح وہ اپنے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ شکیل نے بلند آواز سے سلام کیا۔ اس نے قیص میں سے سر نکال کر دیکھا۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر مسکراہٹ کے آثار اس کے چہرے پر آئے۔

”شکیل صاحب، آئیے۔ آئیے۔ آئیے..... جناب۔ جناب۔ جناب..... صاحبزادے بھی ہیں ساتھ..... ماشاء اللہ!“ شوکت اسے ہمیشہ شکیل صاحب ہی کہتا تھا۔

”لائیں میں پہنا دوں قیص۔“ شکیل کے بیٹے نے آگے بڑھ کر آستین بازو پر چڑھانے کی کوشش کی۔ پلپلے لٹکتے ہوئے گوشت کو، جو ہڈیوں کو مکمل طور پر چھوڑ چکا تھا، چھوتے ہوئے اسے بھر جھری سے آگئی۔ اس نے ہچکچا کر بازو چھوڑ دیا۔

”میں نے پہچانا ہی نہیں“ شکیل نے کہا ”دراصل آپ کے بال.....“ بھائی شوکت کے گھنے گھنگھریالے بال، جو اس کی شخصیت کی سب سے جاذب نظر چیز تھے، ان کی جگہ ملگجا، سلیٹی سا رواں، میلی روئی کی طرح سر پر چپکا ہوا نظر آ رہا تھا..... کیا ایک سال میں کوئی شخص اتنا بھی بدل سکتا ہے؟ سکڑتے چہرے پر اب صرف دو گول سیاہ نتھنے نمایاں تھے اور دانت پہلے سے کہیں بڑے اور ابھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ لمبا چوڑا انسان سمٹ کر اصل کا منی ایچر بن چکا تھا۔ آواز میں سے زندگی کا عنصر سلب ہو چکا تھا اور پھنسی پھنسی کھوکھلی سی غرغراہٹ رہ گئی تھی۔

”میرے بال؟ حجامت کرائی تھی نا۔ پھر بڑھے ہی نہیں۔“ دراصل سارے سسٹم ختم ہو جاتے ہیں آہستہ آہستہ۔ یہ ان چور کے بچوں کی کیمو تھراپیاں ہیں۔ یہ دیکھو میری ٹانگیں..... کھال ختم..... کالے کالے کھرنڈ بن گئے ہیں۔ خون تو سارا نکال لیا انھوں نے۔ روز سرنج بھر کر نکال لیتے ہیں بھوتنی کے اور یہ پانی سا چڑھا دیتے ہیں۔ دراصل مارنے کے بہانے ہیں سارے..... بس دیکھ لیا کوئی والی وارث نہیں..... کوئی پوچھنے والا نہیں..... وہ سامنے بستر والا میر پور یا بڈھا ڈھنچر..... بیوی روز تیل ملتی ہے اس کی ٹانگوں پر، بیٹے ٹانگیں دباتے ہیں۔ قسمت ہے اپنی اپنی..... ایک ہم ہیں، پڑے ہوئے ہیں..... بہنیں ہیں ہماری بھی، لیکن..... خیر!“

شکیل کا دل چاہا، کہے کہ آپ نے کون سی خدمت کی بہنوں کی جواب توقعات باندھ رہے ہیں ان سے، لیکن ضبط کر کے بولا: ”وہ تو بے چاری خود بوڑھی عورتیں ہیں۔ کر رہی ہیں جو کر سکتی ہیں۔ یہ کھانا بھیجا ہے۔“ اس نے کھانے کی ٹوکری بیڈ کے برابر رکھی چھوٹی سی فولادی الماری کے اوپر رکھ دی۔

”یہ جو کھانا بھیجتی ہیں بہنیں ہماری، کوئی آدمی کا بچہ اسے نہیں کھا سکتا۔۔۔۔۔ خیر، آپ لائے ہیں، بڑی مہربانی آپ کی۔۔۔۔۔ ایسا بد ذائقہ، ایسا بدرنگ۔ بھنڈی میں کریلے کا ذائقہ، کریلے میں بینگن کا ذائقہ۔۔۔۔۔ دراصل چھ مہینے فریزروں میں رکھ چھوڑتی ہیں، پھر لاما کر گھٹا واسا بنا کر ٹر خادیتی ہیں۔ ٹھیک ہے، بیمار ہوں، پر انسان ہوں، جانور تو نہیں بن گیا۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ پھر احسان یہ کہ کھانا بھیجتی ہیں۔ لوجی یہ کھانا بھیجتی ہیں۔ کئی دفعہ سوچا بالٹی میں ڈال دوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ اللہ کا رزق ہے، بے حرمتی ہوگی۔ بھنگی کو دیتے بھی شرم آتی ہے۔ خیر، آپ لائے ہیں۔ مہربانی آپ کی۔۔۔۔۔ ماشا اللہ ساٹھ ساٹھ سال کی ہونے والی ہیں، پر کھانا پکانا نہ سیکھا۔ دراصل شکیل صاحب یہ بھی ایک آرٹ ہے۔ بہت بڑا آرٹ ہے یہ۔ آپ آئے نہیں کبھی ہمارے گھر۔۔۔۔۔ میں کھاتا آپ کو پکا کر۔ پتا چلتا کھانا کہتے کس کو ہیں۔۔۔۔۔“

شکیل کو غصہ ضبط کرنا محال ہو رہا تھا۔ ختم ہو رہا ہے یہ شخص، پر بد دماغی اور تنازعہ شامی میں مجال ہے جو کوئی فرق آیا ہو۔ اور اوپر سے ناشکرے پن کی انتہا۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے ضبط کر کے بولا: ”وہ بے چاریاں تو پرہیز کے خیال سے اس طرح بناتی ہیں۔“ ”خیر کچھ نہ کہیں ان سے۔ مہربانی ہے سب کی۔۔۔۔۔ میں تو کینٹین سے منگوا لیتا ہوں۔ وہ جو لڑکا کھڑا ہے ادھر، کوئی فرشتہ ہے۔ بڑی خدمت کرتا ہے میری۔ سو روپے روز دیتا ہوں۔ ادھر آنا یار۔۔۔۔۔ ایک لارج پلیٹ بریانی، ماش کی دال، چار روٹیاں لاؤ۔۔۔۔۔ یار ذرا سپیڈ مارا کرو۔ سچ کر دیتے ہولاتے لاتے۔۔۔۔۔“ شوکت بھائی نے اس طرح آرڈر دیا جیسے وہ اسپتال میں نہیں کسی پنج ستارہ ہوٹل کی روم سروس سے مخاطب ہے۔

”اتنا زیادہ کھانا کس کے لیے؟“

”آپ کے لیے۔۔۔۔۔ آپ مہمان ہیں ہمارے۔۔۔۔۔ یہ بچہ بھی پہلی بار آیا ہے۔ حق بنتا ہے ہمارا۔“

شکیل سر اسیمگی کے عالم میں نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وارڈ کے پراگندہ بیمار ماحول اور طرح طرح کی ناگوار بوؤں سے بو جھل فضا میں کھانا تو درکنار کھانے کا تصور بھی جی کو الٹا دینے والا تھا۔ بلکہ وارڈ میں داخل ہونے کے بعد وہ تو شروع شروع میں پوری طرح کھل کر سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔ پھر یہ سوچ کر کہ شکر ہے، کینسر چھوت کی بیماری نہیں، اس نے کچھ کھل کر سانس لیا تھا۔ اس نے رحم طلب نگاہوں سے شوکت کی طرف دیکھا۔ شوکت بھائی کے ہونٹ کلیجی کی رنگت اختیار کر گئے تھے۔ سیاہ ہاتھ اور پیر، جن کے سلیٹی اور زرد ناخنوں میں جیسے پیپ جم کر خشک ہو گئی تھی۔ پیٹ کے ساتھ لگی ٹکلی، جس میں سے گزرتا گہرا زرد پیشاب بیڈ کے ساتھ لٹکی تھیلی میں جمع ہو رہا تھا۔ بالٹی کے اندر پانی میں روئی کے بڑے بڑے پھاہے تیر رہے تھے۔ اس نے گہرا کرتیزی سے کہا ”پلیز! میں گھر سے سیدھا کھانا کھا کر نکلا تھا۔ اب نہیں کھا سکتا۔ پلیز!“

”کوئی بات نہیں، یہ بچہ کھائے گا۔“

”نہیں انکل بالکل نہیں، مجھے بالکل بھوک نہیں۔“ لڑکا پریشان ہو کر بولا۔

”اچھا بھائی رہنے دو“ شوکت بھائی نے وارڈ بوائے کو منع کر دیا۔ ”ہمارے مہمانوں کو ہی خاطر داری منظور نہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آپ آگئے ہیں یہی بڑی بات ہے۔ میں نے خود بلوایا تھا خط لکھوا کر۔۔۔۔۔ دراصل بہت ساری باتیں ہوتی ہیں۔ ہر بات آدمی عورتوں سے نہیں کر سکتا۔ ویسے تو بڑی نیک ہیں ہماری بہنیں۔۔۔۔۔ شرع کی پابند۔۔۔۔۔ پر کچھ لکیر کے فقیر سے ہو جاتے ہیں ایسے لوگ۔۔۔۔۔ دل بھی بڑے سخت ہوتے ہیں ان کے۔ اللہ کی مرضی! شاید پارسائی کا غرور ہوتا ہے۔ حالانکہ خدا کو غرور ہی ساری باتوں سے زیادہ ناپسند ہے۔ سمجھتے ہی نہیں کہ ہر آدمی کی الگ الگ زندگی ہوتی ہے۔ اللہ نے ہر آدمی کو الگ بنایا ہے، لیکن وہ سمجھتی ہیں

جیسے وہ اور ان کے خاوند ہیں، دنیا کا ہر آدمی اسی طرح ہونا چاہیے۔
ایسے لوگوں سے بات کرنی ذرا مشکل ہوتی ہے، اس لیے آپ کو
تکلیف دی۔ سامان..... سامان سارا لے آئی ہیں۔ دیکھا آپ
نے..... بہت سارا سامان ہے، پورے گھر کا سامان.....“

شکیل نے نظریں جھکا لیں اور سوچا، اب یہ مجھ پر سامان کا
احسان چڑھائے گا۔ ہتھوڑے کے ساتھ منیخ کی طرح میرے سر
میں اچھی طرح ٹھونکنے کا..... ٹھیک ہے، کہہ دوں گا شکریہ، بلکہ یہ
بھی کہنے کو تیار ہوں کہ خدا آپ کو اپنا سامان خود استعمال کرنا
نصیب کرے۔ لیکن شوکت کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے بڑی
مشکل سے پہلو بدلا اور بولا: ”شکیل صاحب! اب غور سے سنیں
میری بات..... نہیں پہلے وہ واسکٹ پکڑائیں۔ ادھر پیروں کی
طرف پڑی..... کالے رنگ کی۔“

شکیل نے سیاہ واسکٹ پکڑا دی۔ وہ کچھ دیر اس کی مختلف
جیبیں ٹوٹا رہا۔ پھر اندر کی جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔

”یہ دیکھیں۔۔۔۔۔ یہ ایک پتا ہے۔“

شکیل نے کاغذ کھول کر پڑھا: ۴۹ بی۔ جہانگیر آباد۔
”زیادہ دور نہیں..... مشکل سے پندرہ منٹ کا راستہ ہے
یہاں سے ٹیکسی پر۔“

”کس کا پتا ہے؟“

”بتاتا ہوں۔“ وہ کچھ دیر رک کر گویا الفاظ جمع کرنے لگا۔
”بتاتا ہوں، شکیل صاحب! اسی لیے تو تکلیف دی اتنی دور سے
آپ کو..... کوشش کرتا ہوں بتانے کی۔“ وہ کچھ دیر کے لیے
خاموش ہو گیا، پھر بولا: ”میری زندگی دراصل کچھ عجیب
طرح..... بڑی جلد گزر گئی میری زندگی..... یا شاید ہر ایک کو ایسا
ہی لگتا ہوگا۔ لیکن خیر..... بڑی اچھی زندگی گزاری میں نے، بڑی
شاہی زندگی! خیر اب بھی اللہ کا شکر ہے۔ کوئی فکر فاقہ نہیں۔
لوگوں کو سو فکریں ہوتی ہیں۔ اب دیکھیں نا میرے بھی بیوی بچے
ہوتے تو فکر ہوتی کہ نہیں؟ دراصل اللہ ہمیشہ مہربان رہا مجھ پر۔
کوئی ذمہ داری نہیں..... نہ کوئی غم نہ فکر..... ہر کسی کو نہیں ملتی

ایسی موت..... یہ بہترین موت ہوتی ہے!“
شکیل نے محسوس کیا کہ اسے کہنا چاہیے کہ ایسی بات منہ
سے نہ نکالیں۔ ان شاء اللہ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے.....
لیکن اتنا واضح جھوٹ وہ بول نہ سکا اور چپ رہا۔

”بس ایک کام رہ گیا ہے۔ وہ ہو گیا تو سمجھ لیں میرا ہر بوجھ
ہلکا ہو گیا۔ اسی کے لیے تکلیف دی آپ کو اتنی دور سے.....“
”آپ یہ میری تکلیف کا ذکر نہ کریں بار بار۔ دکھ پہنچتا ہے
مجھے اس سے“ شکیل سر جھکا کر بولا۔

”در اصل ایک ظلم ہو چکا ہے مجھ سے..... غلطیاں تو بہت
کیں میں نے..... پر یہ واقعی ظلم تھا۔ شاید بے عقلی تھی..... بات یہ
ہے کہ..... ایک شادی کی تھی میں نے۔“ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش
ہو گیا۔ سوچتا رہا۔ پھر بولا: ”شادیاں ساری فیل ہو گئیں
میری..... کچھ میرا دماغ خراب، کچھ لوگ بھی اللہ کی مرضی، ہمیشہ
غلط ہی ملے۔ خیر چھوڑیں..... جس شادی کی میں بات کر رہا ہوں،
یہ دوسری تھی، یعنی اماں نے جو کروائی تھی، اس کے بعد والی..... وہ
عورت ٹھیک نہیں تھی۔ شک سا رہتا تھا مجھے اس پر۔ بڑی غلط
رپورٹیں ملتی تھیں اس کے متعلق۔ دراصل اس کے گھر والے
خراب لوگ تھے۔ اوپر سے میرا مزاج ساتویں آسمان پر! پیسے کا
نشہ بھی بڑا تھا! ایک لڑکی ہوئی تھی اس کی۔ میں نے تسلیم نہ کی۔“

”اس نے بڑی قسمیں کھائی، قرآن اٹھائے، روئی پیٹی،
پیروں پر گری..... شاید غلطی تھی میری..... پر میں نے لڑکی
قبول نہیں کی۔ گھر سے نکال دیا۔ طلاق دے دی۔ پھر اس کی
کہیں اور شادی ہو گئی۔ لڑکی کو نانی لے گئی۔ اسی نے پالا۔ کوئی
پانچ چھ سال بعد مجھے ایسے ہی خیال آ گیا۔ میں لڑکی کو دیکھنے
چلا گیا۔ اللہ کی قسم نری ہماری فیملی کی کاپی — یا شاید وہم تھا
میرا۔ خیر پھر میں سال چھ مہینے میں چلا جاتا اور کچھ دے دلا
آتا۔ اب پندرہ سولہ سال کی ہو گئی ہے وہ۔ اب مسئلہ اس کا ہے۔
ساری عمر کچھ نہیں دیا اس کو..... یہ پتا اس کی نانی کے گھر کا ہے۔
میں چاہتا ہوں میرے بعد جو بھی سامان ہے، آپ ایک ٹرک

کروا کے وہاں پہنچادیں۔ شاید کچھ مداوا ہو جائے اسی طرح۔“
 ”نام کیا ہے لڑکی کا؟“ شکیل، جس کے اعصاب سن ہو چکے تھے، خواب کے سے عالم میں بولا۔

”نام..... نام..... عجیب بات ہے، نام تو کبھی پوچھا ہی نہیں، شاید پوچھا ہو کبھی..... میں تو بے بی یا کا کی شا کی کہہ دیتا تھا..... ہاں البتہ ایک مہربانی کریں مجھ پر..... ان بہنوں کو نہ بتائیں ابھی۔ مجھ میں طاقت نہیں ان کے سوال جواب سننے کی۔ کہیں گی کیا ثبوت ہے کہ لڑکی تمھاری ہے۔ دیکھا جائے تو واقعی کیا ثبوت ہے۔ مجھ میں اب بحث مباحثوں کی ہمت نہیں اور نہ میرا وقت ہے لعنتیں پھنکاریں سننے کا.....“

”لعنت پھنکار تو آپ پر واقعی پڑنی چاہیے بھائی صاحب۔“ شکیل نے دانت پیستے ہوئے دل ہی دل میں جل بھن کر سوچا۔

☆☆

نیکسی پر جہانگیر آباد جاتے ہوئے شکیل کے پاس پندرہ منٹ مکمل سکون کے ساتھ سوچنے کے تھے۔ پچھلے تین روز طوفان اور جھکڑ کی طرح گزرے تھے۔ شوکت بھائی کی موت..... تدفین..... قتل..... اور آج تیسرا دن..... اور اب یہ لڑکی..... جب وہ گھر سے نکلنے لگا، تو اس کا لڑکا خوب بن سنور کر آیا تھا۔ کھرچ کھرچ کر کی گئی شیو سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

”آپ شوکت تایا کی لڑکی سے ملنے جا رہے؟ میں بھی چلوں ساتھ؟“ اس نے بڑے اشتیاق سے کہا تھا۔

”چپ رہو بے وقوف..... اور یہ تم بن ٹھن کر کیوں آئے ہو؟ ٹائی کیوں لگائی تم نے؟ موت کی خبر سنا نے جا رہا ہوں، کسی پارٹی میں نہیں جا رہا..... جاؤ اپنا کام کرو.....“ لڑکے کے چہرے پر تکلیف اور حیرت کے آثار نمودار ہوئے اور وہ خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

نیکسی میں بیٹھے ہوئے شکیل نے انتہائی بے مزہ ہوتے ہوئے سوچا: یہ شخص جو میرا بھائی تھا، اس کی زندگی تھی یا کوئی بھونڈا

مذاق؟ ایسی زندگیوں پر نہ ہنسا اور نہ رویا جاسکتا ہے..... بتاؤ اب لڑکی کہاں سے کھود کر نکال لی؟ لڑکی بھی وہ جس کے متعلق اسے خود بھی پورا یقین نہیں کہ اس کی ہے بھی کہ نہیں..... یہ میری ہی انسانیت ہے کہ اس بیہودہ ترین مشن پر نکل کھڑا ہوا ہوں۔ اور وہ بھائی..... آفرین ہے اس پر کہ آخر میرے لیے کھوٹا سکھ ہی ثابت ہوا..... اور اب حال یہ ہے کہ کراچی کے سلم ایریا میں ایک ایسی لڑکی ڈھونڈنے نکلا ہوں جو سو فیصدی یقین بھی نہیں کہ اسی کی ہے..... کیسا گند مذاق ہے!

نیکسی ایک گلی میں چھوٹے سے بوسیدہ مکان کے سامنے رک گئی۔ دروازے پر کونکے کے ساتھ بھدے سے الفاظ میں لکھا تھا: ۴۹ بی۔ شکیل نے ہچکچاتے ہوئے دروازے پر دستک دی اور خود ہیٹ کر ایک طرف کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ خدا جانے کون لوگ ہیں، گلے ہی نہ پڑ جائیں۔ ویسے بھی اس گھر کے مکینوں پر اس خبر کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ یقیناً لا تعلقی سے خبر سنی جائے گی۔ ہاں البتہ بیٹھے بیٹھے لاکھوں کا سامان مل جانے کی خوشی یقینی ہے۔ دروازہ چرچا کر کھلا اور بوسیدہ سی ساڑھی پہنے ایک بوڑھی عورت سامنے آگئی۔

شکیل نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ کچھ دیر حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہی، پھر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر افلاس زدہ ماحول کی مخصوص فضا تھی۔ اور غربت اور محرومی کی بساند۔ شکیل نے بغیر ایک منٹ ضائع کیے کمرے کے وسط میں کھڑے کھڑے سامنے دیوار پر لگے برسوں پرانے میلے سے کیلنڈر پر نظریں جمائے بڑے نپے تلے الفاظ میں بھائی شوکت کی موت کی خبر سنا دی۔ پھر اس خبر کا اثر دیکھنے کے لیے ایک اچھٹی سی نظر بڑھیا کے چہرے پر ڈالی..... توقع کے خلاف بوڑھی عورت کے چہرے پر صدمے اور رنج کے جذبات نمودار ہوئے۔ وہ کچھ دیر سر جھکا کر ساکت اور خاموش کھڑی رہی۔

”بیٹھو۔“ اس نے لوہے کی ایک بھدی زنگ آلود کرسی کی طرف اشارہ کیا ”میں جا کر لڑکی کو بتاتی ہوں۔“

وہ اندر کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ شکیل نے کمرے کے وسط میں کھڑے کھڑے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ جو حالت نظر آرہی ہے، اس میں چھپڑ پھاڑ کر اتنا کچھ مل جانا، لاکھوں روپے کا سامان بیٹھے بٹھائے! واقعی کیا قسمت ہوتی ہے کچھ لوگوں کی۔ ابھی تو خیر انھیں معلوم ہی نہیں، لیکن اتنی بڑی خوش خبری سننے کے بعد شاید انھیں میرا آنا برا تو کیا اچھا ہی لگے گا۔

برابر والے کمرے سے اچانک آہوں اور سسکیوں کی آواز بلند ہوئی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ شکیل کمرے میں ساکت کھڑا آوازوں کو حیرت سے سننے لگا۔ عورتیں بھی عجیب چیز ہوتی ہیں۔ موت کا سن کر روتی ضرور ہیں خواہ کسی کی بھی ہو۔

تھوڑی دیر بعد بوڑھی عورت دروازے میں نمودار ہوئی اور اس نے شکیل کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اخلاقاً اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ اس کمرے میں دو چار پائیوں اور دو ایک صندوقوں کے سوا کوئی سامان نہ تھا۔ ایک چارپائی پر ایک دہلی، سوکھی سی لڑکی، جو شوکت کی بتائی ہوئی عمر سے کہیں کم دکھائی دے رہی تھی، اوندھی پڑی سسک سسک کر رہی تھی۔

”ابو..... ابو“ سسکیوں کے درمیان وہ بار بار یہ لفظ دہرا رہی تھی۔ ”ابو؟ شوکت بھائی اور ابو؟“ شکیل نے حیران ہو کر یہ لفظ سنا۔ شوکت بھائی کے لیے لفظ ابو تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ شوکت بھائی اور ابو، اسے ان دو لفظوں میں بڑا مضحکہ خیز سا تضاد دکھائی دیا۔

”ابو..... ابو“ لڑکی روتے ہوئے بار بار کہہ رہی تھی۔ شکیل کچھ دیر گوگو کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر موقع کا تقاضا محسوس کرتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر چارپائی پر جھک کر لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مت رو۔ شاباش۔ روتے نہیں۔“

”ابو“ لڑکی نے کہا اور اس کی ہچکیاں تیز تر ہو گئیں۔

”بہت خوش ہوتی تھی باپ کے آنے پر..... بہت کم آتے

تھے..... پر انتظار کرتی رہتی تھی.....“ بوڑھی عورت نے آہستہ سے کہا اور ساڑھی کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

شکیل نے محسوس کیا کہ اسے کچھ اور بھی کہنا چاہیے بلکہ اب تو خوش خبری سنا دینی چاہیے۔

”اب چپ ہو جاؤ..... ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔ تمہارے لیے..... تمہارے ابو تمہارے لیے بہت سارا سامان..... بہت ساری چیزیں چھوڑ گئے ہیں۔ خوش ہو جاؤ اب۔ رونے سے کیا فائدہ..... بہت ساری چیزیں ملیں گی تمہیں۔“ اس نے بھونڈے انداز میں کہا۔

لڑکی تڑپ کر سیدھی بیٹھ گئی۔ پھر بلک بلک کر روتی ہوئی بولی: ”چیزیں نہیں چاہیے..... چیزیں نہیں..... ابو چاہیے..... ابو چاہیے..... ابو.....“ وہ پھر اوندھے منہ چارپائی پر گر پڑی اور ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔ ”چیزیں نہیں ابو، چیزیں نہیں ابو..... چیزیں نہیں!“

شکیل پریشان ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنا آپ اور سامان سے بھرا ٹرک بیچ اور حیرانہ نظر آنے لگا۔ وہ کچھ دیر ایک مجرم کی طرح کھڑا رہا جیسے لڑکی کی اس حالت کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ پھر بے ساختہ آگے بڑھا اور لڑکی کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھالیا۔ ہچکیوں کی وجہ سے لڑکی کا استخوانی پنجرہ بری طرح لرز رہا تھا۔ شکیل کو یوں لگا جیسے لڑکی کے وجود میں سے ایک برقی روسی نکل کر اس کے دل کو چھوتی گزر گئی۔ اس نے لڑکی کو گلے لگا لیا اور بے اختیار رو پڑا۔

بوڑھی عورت وقفے وقفے سے آنکھیں پونچھتی رہی۔ پھر شکیل نے آہستگی سے لڑکی کو چارپائی پر بٹھایا اور کمرے سے نکلتے ہوئے پلٹ کر کہا: ”سامان کا ٹرک کل بارہ بجے تک پہنچ جائے گا۔“

وہ تیزی سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ اس کا دل بھاری تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا بھائی شوکت آج ہی مرا ہے اور اس کی لاش اس بوسیدہ مکان میں پڑی ہے۔



سسی پنوں

غریب دھوبن اور ایک نوجوان
شہزادے کے عشق کی لافانی سرگزشت

اشیر عبدالقادر شاہوانی

دو ایسے عاشقوں کی داستان ہے جن کے عشق کی یہ خوشبو پورے برصغیر میں پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ (مکران) کے شہزادے میر پنوں (۱) اور بن بھور (۲) کی شہزادی سسی (۳) کی داستان محبت ہندوپاک، ایران، افغانستان اور برصغیر کے دیگر ملکوں میں یکساں

طور پر مشہور اور کئی زبانوں میں زعام ہے۔ ہر زبان کے شعرا نے اسے شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے۔

اس دل دوز داستان کی کہانی کچھ یوں ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی کے حاکم کچھ، میر عالی ہوت بلوچ کا خوبصورت جیلا بیٹا، شہزادہ میر پنوں من پسند و لائق رفیقہ حیات کی تلاش میں مختلف علاقوں کی نوردی کر رہا تھا۔ گھومتے گھومتے اس نے سندھ کے بن بھور نامی علاقے میں پڑاؤ کیا، تو اسے پک ایسی دوشیزہ نظر آئی جو چندے آفتاب اور چندے مہتاب تھی۔ یہ دوشیزہ ایک غریب دھوبی کی لے پالک بیٹی تھی جس نے اسے دریائے سندھ کی موجوں میں بہ کر آنے والے چوٹی صندوق سے نکالا تھا۔ بے اولاد دھوبی نے اس ننھی جان کو پال پوس کر جوان کیا اور اپنی زندگی کے سب سے مہرے ماہ و سال سسی جیسی شہزادی پر بچھا کر دیے۔

سسی اصل میں بھٹہ وائین کے ہندو مہاراجا کی بدقسمت بیٹی تھی، جسے اس نے پیدا ہوتے ہی صرف اس وجہ سے سندھ کی موجوں کی نذر کر دیا کہ جوتشی نے پیشگوئی کی تھی، وہ (بچی) مسلمان ہو کر مہاراجا کی رسوائی کا سبب بنے گی۔ سسی کی جنم بھومی کے آثار آج بھی صادق آباد سے چند کلومیٹر دور موجود ہیں۔ ان دنوں وہاں ڈاہر قبیلہ آباد ہے۔ سسی کی زندگی تین علاقوں سے وابستہ رہی: بھٹہ وائین، پنجاب میں جنم لیا، بن بھور، سندھ میں پرورش پائی اور حسن پیر، بلوچستان میں



مدفن نصیب ہوا۔

پنوں نے سستی کو دیکھا، تو پہلی ہی نظر میں فریفتہ ہو گیا۔ اس نے سستی کے باپ (دھوبی) کو رشتے کا پیغام بھیجا، لیکن وہ گوگو میں مبتلا ہو کر کوئی جواب نہ دے سکا، مگر جس طرح زلیخا حضرت یوسف کو خواب میں دیکھ کر ان پر دل و جان سے نثار ہو چکی تھی، اسی طرح سستی بھی پنوں کو ایک رات خواب میں دیکھ کر اسے دل دے بیٹھی۔ اس نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ پنوں سے ہاں کر دے۔ سستی کے باپ نے پنوں سے ان شرائط پر ہاں کر دی کہ وہ ایک دفعہ تمام شہریوں کے کپڑے دھوئے اور مستقل طور پر یہاں رہائش اختیار کر لے۔ پنوں شرائط نہ مانتا، تو کیا کرتا؟ اس نے شہریوں کے کپڑے دھوئے اور ہر لباس کے ساتھ ایک اشرفی باندھ دی۔ لوگ پنوں کی سخاوت سے بہت متاثر اور خوش ہوئے۔ دھوبی کی مسرت کا بھی ٹھکانہ نہیں رہا اور اس نے سستی سے پنوں کی شادی کرادی۔

پنوں سستی کے ساتھ پیار و محبت سے رہنے لگا۔ کچھ عرصے بعد پنوں کے باپ نے اسے ایک درد بھرا خط لکھا:

”پنوں! اے جوان

تم یہاں واپس کیوں نہیں آتے؟

میں درد و غم سے نڈھال یہاں بیٹھا ہوں

اور تم! ادھر اس چاند جیسی کبوتری کے ساتھ

لعل و یاقوت کے اس ثمر کے ساتھ

اس آفتاب و مہتاب تمثیل کے ساتھ خوش ہو

اے نو جوان پنوں!

اب واپس پھر کر کیچ آ جاؤ

یہاں نخیل پر شگوفے پھوٹ رہے ہیں

بڑے بڑے اور گول موصلی ترنج پکنے کو ہیں“

لیکن پنوں سستی کی محبت میں ایسا گرفتار ہو چکا تھا کہ اسے ماں باپ اور وطن یاد ہی نہیں آیا۔ جب خط پا کر پنوں واپس نہیں آیا، تو باپ نے اس کے بھائیوں کو بھیجا کہ وہ اسے لے کر

آئیں۔ بھائیوں کی منت سماجت کے بعد بھی پنوں راضی نہیں ہوا، تو وہ اسے نشہ آور مشروب پلا مدہوشی کے عالم میں رات کو اونٹ پر بٹھا کر لے گئے۔ جب پیکر مہر و وفا سستی صبح بیدار ہوئی، تو پنوں کو نہ پا کر برہنہ پا ہر طرف بھاگتی ”پنوں! پنوں!“ کی صدا لگاتی اُسے ڈھونڈنے لگی۔ دیدار محبوب کے لیے ترستی نگاہوں والی سستی پھر روتی پینتی پنوں کو لے جانے والے مہاریوں کے نشان پا کے ساتھ ساتھ دوڑتی بھاگتی چلتی رہی:

شاعر کہتا ہے۔

”اونٹوں کا راستہ اور ان کے

پاؤں کا نشان لے کر وہ چلی چلتی رہی“

رعد و برق کی طرح

تین منزلیں اس نے پایادہ طے کر لیں

اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے

اور بدن درد سے ٹوٹنے لگا“

موند رقبیلے کے علاقے میں سنگر کے مقام پر ایک وحشی چرواہے نے حسین دوشیزہ کو تنہا دیکھا، تو اسے پکڑنے دیوانہ وار آگے بڑھا۔ اس گلگوں محبوبہ نے اپنی عزت بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی:

”یارب! مجھے تو خود بچا

تو ہی حفاظت کرنے والا ہے

اور تو ہی میرا ماں باپ ہے

مجھے اس کے ہاتھ میں نہ دے

اس نا سمجھ جاہل اور لعین سے مجھے بچائے رکھ“

سستی کی دعا مستجاب ہوئی

”رعد کی طرح زبردست دھماکا ہوا

وہ مشکیں زمین شق ہو گئی

اور اس شگاف کے اندر سستی دھنس گئی

اور چرواہا بے ہوش ہو کر گر پڑا“

ادھر جب پنوں کو ہوش آیا، تو وہ بھائیوں سے لڑ جھگڑ کر پیادہ

بن بھور کی طرف واپس چل پڑا۔ چلتے چلتے آخر اس مقام پر پہنچا
جہاں وہ چرواہا بیٹھا کسی کو باہر نکالنے کے لیے زمین کھود رہا تھا۔
”پنوں نے“

اس پہاڑی چرواہے کو دیکھا
جو زمین کھود کر مٹی باہر نکال رہا تھا
پنوں نے اس سے پوچھا
اے چرواہے!

یہاں تمھاری کیا چیز کھو گئی؟
چرواہے نے جواب دیا
ایک عورت یہاں میرے پاس آئی
جو آفتاب و مہتاب کے مانند تھی
مگر اس کے نہ تو پرو بازو تھے
اور نہ ہی وہ گھوڑے پر سوار تھی

اس پری رو کے ساتھ کوئی نوکر بھی نہ تھا
میں چلا آیا کہ اس نیلو فر کو پکڑ لوں مگر زمین شق ہو گئی
اور وہ لعل زمین میں دھنس گئی
اس کے دوپٹے کا ایک ٹکڑا
اب تک زمین سے باہر نظر آتا ہے
میں اس کے دوپٹے کے نشان کھود رہا ہوں۔

تاکہ موتی کے اس دانے کو
اس لعل کو باہر نکال لوں

پنوں چنی کے اس ٹکڑے کو دیکھنے جھکا، تو اس سے پھوٹنے
والی بھینی بھینی خوشبو اس کے مشام جان میں سرایت کر گئی۔ اس
نے عالم کیف و مستی میں اپنے ہاتھ اٹھا کر دعا کی:
”اے رب العالمین!

میرا سر اور میری جان تجھ پر قربان ہو
مجھے میری محبوبہ سے جدا نہ کر
یا رب تو جو دانا بینا ہے
آج میری دستگیری کر

میری فریاد سن!

اور میری عرض قبول کر

کسی کے ساتھ مجھے بھی اس جہاں سے اٹھالے۔“

پنوں کی دعا قبول ہوئی اور:

”زمین اس جگہ سے پھر شق ہو گئی

اور پنوں اس شگاف کے اندر چلا گیا

وہاں اس نے کسی کو اپنی آغوش میں لے لیا

اس پھول جیسی محبوبہ کا ہم راز

اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے

اور اسے آغوش میں لیے

خوش خوش چلا گیا

اس جہاں سے بے نیاز ہو کر

دو دل آپس میں مل گئے۔“

چرواہا حیران و ششدر وہاں کھڑے کھڑے یہ تماشا دیکھتا

رہا۔ جب اس کے ہوش و ہواس بحال ہوئے، تو چرواہے نے

اس جگہ پتھروں کے ڈھیر لگا کر دو قبریں بنادیں اور مجاور بن بیٹھا۔

یہ قبریں اب تک لسبیلہ میں شاو بلاول اور اھل کے درمیان سنگر

کے جنگل میں موجود ہیں۔ دور دور سے لوگ ان کی زیارت کے

لیے آتے اور اظہار عقیدت کرتے ہیں۔ جبکہ مختلف علاقوں میں

اہل دل اور صاحب عرفان بزرگ اس مرقد پر حاضر ہوئے، چلے

کھینچا اور انھوں نے سستی پنوں کا دیدار کیا۔

سستی پنوں کی مشترکہ قبر سے خاص فاصلے تک اونٹ کا

داخلہ ممنوع ہے۔ اگر کوئی اونٹ قبر کی طرف لے جانے کی

جسارت کرے، تو اسے نقصان پہنچتا ہے۔

حواشی

(۱) پنوں بمعنی نیکو کار

(۲) کسی بمعنی چاند

(۳) بن بھور بمعنی گھنا جنگل۔ اسی نام سے مری (اسلام

آباد) میں بھور بن نامی مقام واقع ہے۔

حکیم دوست محمد صابر ملتانی کی شخصیت اور فن طب میں مہارت اجاگر کرتے دلچسپ واقعات

پروفیسر (ر) عطاء الحق سبحانی

میں اپنی گرتی صحت اور ہر قسم کے علاج ۱۹۷۰ء معاہدے کی ناکامی کے بعد راقم بہت پریشان تھا۔ تب اپنے ایک مخلص دوست رانا ریاض احمد خان کی وساطت سے مرحوم حکیم دوست محمد صابر ملتانی کا پتا معلوم ہوا۔ ان کے فطری طریق علاج یعنی علاج بالغذا کی بدولت اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت کاملہ عطا فرمائی۔ خدا غریق رحمت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ علم طب پر مرحوم حکیم صابر ملتانی کو مکمل دسترس حاصل تھی اور علاج بالغذا پر بالخصوص زبردست عبور رکھتے۔ جب میں پہلی دفعہ بغرض علاج حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے مجھے دوران علاج روٹی اور چاول کھانے سے سختی سے منع کیا۔ ہدایت

کی کہ کھانے کے وقت حسب خواہش دیسی گھی ڈال پیٹ بھر سالن چھج سے کھالیں۔ اس پر میں نے فوراً سوال کیا کہ حکیم صاحب کیا صرف سالن سے میرا پیٹ بھر جائے گا؟ انھوں نے فرمایا:

”بھینس کو بھوک لگنے پر عموماً بھوسے (توڑی) کے ایک ٹوکڑے میں تھوڑی سی کھلی اور بنولے کا آمیزہ (جسے پنجابی میں ونڈوڑیواں کہتے ہیں) ڈال دیتے ہیں۔ اگر بھینس کو بھوک لگنے پر بھوسے کا ٹوکڑا نہ دیں، لیکن کھلی اور بنولے کے آمیزے کی مقدار حسب ضرورت تین یا چار گنا کر دیں، تو بھینس کو غذائیت کس صورت میں زیادہ ملے گی؟“

میں نے فوراً عرض کیا کہ دوسری صورت میں جب ہم ”ونڈوڑیویں“ کی مقدار بڑھا دیں گے، مگر اس میں بھوسہ نہ ڈالیں۔ میرا جواب سن کر حکیم صاحب مسکرائے اور فرمایا: ”بس میں نے آپ کی توڑی (بھوسہ) یعنی روٹی اور چاول بند کر دیے اور ونڈوڑیواں یعنی سالن کی مقدار بڑھا دی تاکہ آپ کو زیادہ سے زیادہ غذائیت ملے۔“ حکیم صاحب کا جواب سن کر میں ان کے منطقی طرز استدلال پر بہت حیران ہوا اور محظوظ بھی۔ حکیم صاحب اپنی کتابوں میں جا بجا لکھتے ہیں کہ جب بھی کھانا کھائیے، تو ہمیشہ



روٹی کم اور سالن زیادہ کھائیں۔ کیونکہ سالن میں غذائیت اور حرارت زیادہ ہوتی ہے۔

ہم لوگ روٹی کھانے کے عادی ہو چکے۔ اس لیے بعض مریض ضد کرتے کہ ان کو تھوڑی بہت روٹی کھانے کی اجازت دی جائے۔ ایسے مریضوں کو سالن کی افادیت اور روٹی کے مضر اثرات سمجھانے کی خاطر حکیم صاحب بڑا دلچسپ طریقہ اپناتے۔ حکیم صاحب سوال کرتے کہ اگر آٹا گوند کر ایک دودن کرے میں پڑا رہے، تو معلوم ہے کیا ہوگا؟ پھر خود ہی وضاحت فرماتے کہ گندھے آٹے میں ایک دودن بعد خمیر پیدا ہو جائے گا اور اس میں سے گیس کے بلبلے اٹھیں گے۔ اسی لیے آٹے کی روٹی کھانے سے منع کر رہا ہوں تاکہ آپ کے پیٹ میں نہ خمیر پیدا ہو اور نہ ہی گیس کے بلبلے بنیں۔

ایک دفعہ میں نے حکیم صاحب سے عرض کیا کہ آپ ہمیشہ مجھے دیسی گھی کھانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ لیکن آپریشن کے ذریعے میرا پتہ نکال دیا گیا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر مجھے گھی اور چکنائی سے پرہیز کی ہدایت کرتے ہیں۔ یہ سن کر پہلے تو حکیم صاحب نے پوچھا کہ پتہ کیوں نکال دیا گیا؟

میں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے، پتے میں سوزش ہو گئی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا فعل کرنے سے قاصر تھا۔ حکیم صاحب نے فرمایا:

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر آپ کا کوئی بازو کام کرنا چھوڑ دے، تو اسے کاٹ دیا جائے۔ آپ کی آنکھ اگر کام نہ کرے، تو اسے نکال دیا جائے؟ اسے تو علاج نہیں کہتے۔ اگر آپ کا پتہ سوزش کی وجہ سے کام نہیں کرتا تھا، تو اسے بذریعہ علاج اس قابل بنانا چاہیے تھا کہ وہ اپنا کام کرنا شروع کر دے۔ یہ تو کوئی علاج نہ ہوا کہ اسے نکال کر باہر پھینک دو۔ باقی رہا دیسی گھی کا مسئلہ۔ آپ کا جتنا دل کرے دیسی گھی استعمال کریں۔ ڈاکٹر حضرات کی باتوں پر مت جائیں، کچھ نہیں ہوتا۔“

حکیم صاحب کا لب و لہجہ اس قدر پُر اعتماد تھا کہ میں ان کی

بات سے مطمئن ہو گیا۔ لہذا میں آج بھی حسب طلب سالن میں دیسی گھی یا زیتون کا تیل ڈال کر کھاتا ہوں۔ بعض اوقات موسمی اثرات کی وجہ سے دسمبر جنوری کے ایام میں دیسی گھی اور میٹھی اشیا کھانے کو بہت دل کرتا ہے۔ چنانچہ دیسی گھی میں تر بتر سو جی یا گاجر کا حلوہ استعمال کرتا ہوں اور اللہ کے فضل سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ حکیم صاحب آپ ہمیشہ بنا پتی گھی سے پرہیز کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ لیکن اگر دیسی گھی نہ ملے، تو پھر کیا کریں؟ میری بات بغور سن کر آپ نے فرمایا: ”بنا پتی گھی اور کپڑے دھونے والے صابن بنانے کا فارمولا کسی حد تک ملتا جلتا ہے۔ اسی لیے دیسی گھی استعمال کرنے کی ہدایت دیتا ہوں۔ البتہ اگر خالص دیسی گھی نہ ملے، تو سرسوں کا خالص تیل سالن وغیرہ پکانے میں استعمال کیجیے۔ سرسوں کا تیل خالص نہ باتاتی ہوتا ہے اور بنا پتی گھی سے بدرجہا بہتر۔“

۱۹۶۵ء میں میرے کانوں میں پیپ آنے لگی۔ کبھی کبھی اس میں خون کی آمیزش بھی ہوتی۔ ہر وقت کانوں میں کھجلی رہتی۔ ناچار میں نے ایلوپیتھتی علاج کروایا جس سے وقتی طور پر تو آرام آ گیا۔ تاہم وقتاً فوقتاً مرض پھر عود کر آتا۔

۱۹۷۰ء میں جب مجھے گیس اور قبض کی مسلسل شکایت رہنے لگی، تو میرے کانوں میں بھی وہی دیرینہ شکایت پیدا ہو گئی۔ ایلوپیتھتی اور ہومیو پیتھتی، دونوں قسم کے علاج کروائے مگر خاطر خواہ افادہ نہ ہوا۔ انہی دنوں میں حکیم صابر ملتانی کے زیر علاج تھا۔ ساتھ ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے کانوں کا علاج جاری تھا۔ ان کی ہدایت پر دن میں تین بار کانوں میں دوائی کے قطرے ڈالا کرتا۔

۱۹۷۰ء میں جب میں دوسری دفعہ حکیم صابر ملتانی صاحب سے دوائی لینے لاہور گیا، تو عرض کیا کہ حکیم صاحب، میرے دونوں کان کئی سال سے خراب رہتے ہیں اور ان میں پیپ اور کھجلی کی شکایت رہتی ہے۔ کیا آپ کے پاس اس مرض کا بھی

کوئی علاج ہے؟ حکیم صاحب نے فرمایا:

”میں آپ کے معدے کا علاج کر رہا ہوں۔ جب آپ کا معدہ تندرست ہوا، تو کان خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔“

میں نے اسی وقت حکیم صاحب کے مطب ہی میں دونوں کانوں سے روئی نکال کر پھینک دی جو میں قطرے ڈالنے کے بعد کانوں میں ٹھونس دیتا تھا۔

اللہ کی قدرت دیکھیے، تین چار ہفتوں بعد جب میرے معدے کو آرام آگیا، تو کان بھی بالکل ٹھیک ہو گئے اور آج تک کبھی پھر وہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ حکیم صابر ملتانی کا کہنا تھا، ہر مرض معدے کی خرابی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر خرابی دور کر دی جائے، تو جسم میں نمودار ہونے والی تمام بیماریاں خود بخود رفع ہو جاتی ہیں۔

ایک دفعہ حکیم صابر ذیابیطس (شوگر) کے ایک مریض کو غذا کی بابت ہدایات دے رہے تھے۔ مریض نے پوچھا کہ چائے میں چینی ڈال کر نوش کروں یا بغیر چینی کے؟ جو حکیم صاحب نے فرمایا: ”اگر آپ کو چینی کھانے سے منع کر کے ذیابیطس کا علاج کیا، تو پھر وہ علاج نہ ہوا۔ آپ معمول کے مطابق چینی کا استعمال کیجیے۔ گھر میں میٹھا (کسٹرڈ، حلوہ، سویاں وغیرہ) پکائے جائیں، تو وہ بھی بلا خوف کھائیے۔“

جن دنوں میں حکیم صاحب کے زیر علاج تھا تو میرے بڑے بھائی، میاں محمد سعید سبحانی مجھے ملتان تشریف لائے۔ باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ میری دوائی ختم ہونے والی ہے اور ایک دو روز میں لاہور حکیم صاحب سے دوائی لینے جاؤں گا۔ چونکہ راقم سفر سے بہت گھبراتا ہے، اس لیے بھائی صاحب نے کہا کہ وہ پرچی دکھا کر حکیم صاحب سے دوائی لے آئیں گے۔ جب بھائی دوائی لیے واپس ملتان آئے، تو مجھے کہنے لگے کہ آپ کے حکیم صاحب کی مجھے تو سمجھ نہیں آسکی، وہ ولی اللہ ہیں یا کوئی پُر اسرار شخصیت۔

ظاہر ہے برادرِ م نے یہ تاثر حکیم صاحب کا خستہ حال مطب دیکھ کر لیا جس میں صرف دس پندرہ ادویہ کی شیشیاں پڑی تھیں۔ مطب میں دو تین پرانی کرسیاں اور ایک بچ نظر آتا۔ حکیم

صاحب خود انتہائی سادہ اور ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حکیم صاحب روپے پیسے کے سلسلے میں بالکل بے نیاز تھے۔ ان کا اصل مقصد مریض کی مدد اور فنِ طب کی خدمت کرنا تھا۔ میں نے بھائی صاحب کی بات سن کر کہا:

”میں حکیم صاحب کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہوں۔ آپ کا پہلا اندازہ بالکل درست ہے۔ واقعی حکیم صاحب ولی اللہ ہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک اس مادی دور میں جو شخص روپے پیسے سے بے نیاز ہو کر عوام کی خدمت میں مگن ہو، وہی ولی اللہ ہو سکتا ہے۔“ حکیم صابر ملتانی کے پاس بعض ایسے مریض بھی آتے جنہیں دوائی دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ حکیم صاحب کی مجوزہ غذا اور پرہیز ہی سے تندرست ہو جاتے۔ ایسے مریضوں سے حکیم موصوف نہ تو کوئی فیس لیتے تھے اور نہ ہی کوئی نذرانہ قبول کرتے۔ کیا یہ شانِ درویشی نہیں؟

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو، وہ قیصری کیا ہے
(اقبال)

جب بھی حکیم صابر ملتانی کی خدمت میں فنِ طبِ علاج مالِ غذا کا علم سیکھنے کی غرض سے حاضر ہوا، تو ہر سوال کا جواب پوری وضاحت اور خلوص سے دیتے۔ علمی مجلسوں میں اکثر یہ جملہ کہتے: ”میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں کہ یہ چراغِ سحر کب گل ہو جائے۔ آپ جو کچھ مجھ سے حاصل کر سکتے ہیں، کر لیجیے۔“

یہی وجہ ہے کہ آپ اپنی تحقیق اور طبی نسخوں کی سرعام تشہیر کرتے۔ یہاں تک کہ تب دق اور ہیضہ جیسے موذی امراض کے انتہائی ارزاں اور اکیسرنسخے عوام کی بھلائی کے لیے اپنی تصانیف میں درج کر دیے اور اپنا علم طب دوسروں کو منتقل کرنے میں ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیا۔ انھوں نے ۱۹۷۲ء میں وفات پائی۔ ایسے گوہرِ نایاب صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں، جو اپنا علمی اثاثہ دوسروں کو منتقل کرنے کے لیے بے چین رہیں۔

ہزاروں سالِ نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہندوستانی فوجی پہلے ہی سے پوری طرح چوکس تھے۔ انھوں نے پاکستانی فوجیوں پر مشین گنوں اور توپوں سے گولوں کی بارش شروع کر دی۔ وہ ایک بلند چوٹی پر اپنے محفوظ مورچے میں چھپے ہوئے تھے اور انھیں وہاں سے ہٹانا آسان نہ تھا لیکن کیپٹن سرور کی قیادت میں یہ سب کچھ ممکن ہو گیا اور مجاہدین ایک ایسی چٹان بن گئے جسے تسخیر کرنا دشمن کے بس میں نہ تھا۔

کیپٹن محمد سرور شہید کا تعلق ایک معزز راجپوت بھٹی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد راجا محمد حیات فوج میں حوالدار تھے۔ کیپٹن سرور ۱۰ نومبر ۱۹۱۰ء کو سنگھوری تحصیل گوجر خان میں پیدا ہوئے



جنہیں پہلا نشانِ حیدر ملا

جذبہ حب الوطنی اور بے خوفی نے شہید کو اس مقام پر فائز کر دیا جہاں صرف خوش قسمت ہی پہنچ پاتے ہیں

محمد داؤد طاہر

اور میٹرک تک تعلیم اس وقت کے ضلع لائلپور میں پائی۔ ۱۹۲۹ء میں سپاہی کے طور پر فوج میں بھرتی ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں کمیشن کے لیے منتخب کر لیے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے کیپٹن کے عہدے پر ترقی پائی۔ قیام پاکستان کے وقت وہ پنجاب رجمنٹ میں تعینات تھے۔

دشمن کی جوابی کارروائی جاری تھی کہ اچانک اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ یہ آواز پلاٹون کے برین گنر فرمان علی کی تھی۔ وہ جام شہادت نوش کر گئے، تو کیپٹن سرور نے ان کی گن خود سنبھال لی اور دشمن کے مورچے سے بیس گز کے فاصلے پر پہنچ گئے۔ اس

۱۹۴۸ء میں دشمن نے کشمیر میں ایک اہم مقام پر

قبضہ کر کے اپنا مضبوط مورچہ بنا لیا۔ اب اس کا ارادہ پیش قدمی کا تھا۔ پیش قدمی روکنے کا کام

پنجاب رجمنٹ کے سپرد ہوا۔ کیپٹن سرور اس وقت جنرل ہیڈ کوارٹرز، راولپنڈی میں ایک کورس کر رہے تھے چنانچہ جوں ہی تربیت ختم ہوئی وہ اپنے کمانڈنگ افسر کی خصوصی اجازت سے محاذ جنگ پر جا پہنچے۔ اس اہم اور مشکل مشن کی تکمیل کی ذمہ داری کیپٹن سرور نے رضا کارانہ طور پر قبول کی تھی لہذا وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر پیش قدمی کرنے لگے۔

جولائی

موقع پر انکشاف ہوا کہ دشمن نے اپنے مورچے کو خاردار تاروں سے محفوظ کر رکھا ہے۔ کیپٹن سرور اس نازک اور غیر متوقع صورت حال سے بالکل ہراساں نہ ہوئے اور مسلسل دشمن پر فائرنگ کرتے رہے۔

دشمن نے جب انھیں تنہا لڑتے دیکھا، تو اپنی گولہ باری کا رخ ان کی طرف کر دیا۔ عین اس وقت ایک گولی کیپٹن سرور کے دائیں شانے میں لگی لیکن وہ مرہم پٹی سے بے نیاز خون میں لت پت پیش قدمی کرتے رہے اور خاردار باڑ کے بہت قریب پہنچ گئے۔ اسی دوران باقی مجاہدین بھی ان سے آن ملے۔ کیپٹن سرور کے جسم سے بہت خون بہہ چکا تھا لیکن پھر بھی وہ تارکائے میں مصروف رہے۔

اسی دوران دشمن کی ایک گولی ان کا سینہ چھلنی کرتے ہوئے پار نکل گئی۔ مجاہدین نے جب اپنے کمانڈر کو شہید ہوتے دیکھا، تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انھوں نے دشمن پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ اپنا مورچہ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کیپٹن سرور شہید کی اس عظیم الشان قربانی پر انھیں بہادری کا سب سے بڑا اعزاز ”نشان حیدر“ عطا کیا گیا۔ وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والے پاک فوج کے پہلے افسر ہیں۔

شہید کو ”تل بہتر“ کے مقام پر سپرد خاک کر دیا گیا لیکن ان کی یادگار سنگھوری میں تعمیر کی گئی۔ یہ یادگار ایک ہشت پہلو ستارے کی شکل کے ایک پلیٹ فارم پر آٹھ ستونوں والے گنبد کی صورت میں ہے۔ اس کے نیچے سنگ مرمر کی ایک تختی پر شہید کے کارنامے کی تفصیل درج ہے۔

شہید کی بیوہ محترمہ کرم جان صاحبہ جو اپنے میاں کی شہادت کے بعد تقریباً نصف صدی تک حیات رہیں، ۲۴ فروری ۲۰۰۲ء کو وفات پا کر اس یادگار کے احاطے کے بالکل ساتھ دفن ہوئیں۔

میں کئی سال پہلے جب پہلی بار شہید کی یادگار پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا، تو ایک فرہ اندام، سادہ لباس اور سادہ مزاج سا

شخص وہاں پہلے سے موجود تھا۔

”یہ شیخ محمد عزیز ہیں۔“ میرے دوست قربان نے ان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا ”آڑھتی ہیں لیکن شہید کے ساتھ انھیں قلبی تعلق ہے۔ ذرا سی فرصت پائیں، تو یہاں آ جاتے ہیں۔ اس یادگار میں جاؤ ب کشتی کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔“

ترکین نو کے بعد یہ یادگار پہلے سے زیادہ خوبصورت بن چکی ہے۔ اس کی خوبصورتی میں سنگ مرمر سے تعمیر شدہ سفید مسجد کا بھی بہت دخل ہے جہاں سے دن میں پانچ بار اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی ہے۔

”یہ مسجد بھی حکومتی خرچ سے تعمیر ہوئی ہے؟“ میں نے امام مسجد سے پوچھا۔

”نہیں“ انھوں نے جواب دیا ”یہ مسجد شیخ محمد عزیز نے تعمیر کرانا شروع کی تھی لیکن ابھی کچھ کام باقی تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں یہ کام ان کے بچوں نے پایہ تکمیل کو پہنچایا بلکہ میری تنخواہ بھی وہی ادا کر رہے ہیں۔“

جب شہید کے بھتیجے اور داماد، راجا حسن اختر سے بات ہوئی، تو انھوں نے بتایا ”اپنے کسی خواب کی بنا پر شیخ محمد عزیز کی خواہش تھی، بعد از وفات اسی مسجد کے احاطے میں دفن ہوں لیکن بوجہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔“

”اس حوالے سے آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں؟ شیخ محمد عزیز نے ۶ ستمبر کو وفات پائی تھی۔ یوم دفاع کے موقع پر جب فوجی جوان شہید کو سلامی دینے آتے، تو شیخ محمد عزیز ہمیشہ یہاں موجود ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس سال جب شہید کی یادگار پر پھولوں کی چادریں چڑھائی جا رہی تھیں تو راولپنڈی میں ان کا جنازہ اٹھ رہا تھا۔“

”شہید کے حوالے سے کوئی ایسی بات بتائیں جو اب تک ریکارڈ پر نہ آئی ہو۔“ میں نے راجا حسن اختر سے ملاقات کا

فائدہ اٹھاتے ہوئے درخواست کی۔

”جب کمیٹن سرور شہید ہوئے، تو میں بہت چھوٹا تھا اس لیے میں صرف سنی سنائی باتیں ہی دھرا سکتا ہوں۔“

”یہ باتیں یقیناً درست ہوں گی، آپ ارشاد فرمائیے۔“

”ایک قابل ذکر بات، تو یہ ہے کہ سرکاری ریکارڈ کے مطابق وہ سنگھوری میں پیدا ہوئے تھے جبکہ فی الواقعہ ان کی پیدائش چک نمبر ۲۲۹ گ ب ضلع فیصل آباد میں ہوئی تھی۔ اب یہ کمیٹن سرور شہید پر تحقیق کرنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ اس بات کو درست تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔“

”یہ ایک اہم بات ہے اور میرا خیال ہے متعلقہ حلقوں کو اس پر ضرور غور کرنا چاہیے۔“

”شہید کے حوالے سے مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ہمارے بزرگ بیان کیا کرتے تھے کہ قیام پاکستان کے وقت ان کی تعیناتی راولپنڈی میں ہوئی تھی۔ ایک بار وہ گاؤں گئے،

تو لوگوں نے اپنی کل کرنسی ایک تھیلے میں ڈال ان کے حوالے کر دی تاکہ وہ اسے پاکستانی کرنسی میں تبدیل کرا لائیں۔ جب شہید ریلوے اسٹیشن پر پہنچے، تو ایک شخص نے یہ تھیلا اس بچے کے ہاتھ سے چھین لیا جو اسے اٹھا کر ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

”شہید کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار ہوا جہاں اس کے بعض مسلح ساتھی پہلے سے موجود تھے۔ مگر شہید نے اس کا تعاقب کیا اور اس کے مسلح ساتھیوں سے گھبرائے بغیر جاتے ہی اس پر اپنا پستول تان لیا۔ وہ ان کی مدد برتری کے باوجود تھیلا واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔“

یہ واقعہ سن کر میں نے کہا ”جذبہ حب الوطنی کے ساتھ مل کر اسی بے خونی نے تو شہید کو اس مقام پر سرفراز کیا جہاں پہنچنے کی صرف آرزو ہی کی جاسکتی ہے۔“

اندھے کو کیا چاہیے؟

کہتے ہیں کہ ایک فقیر ایسی جگہ پہنچا جہاں کا مالک سخی دل انسان تھا۔ اس سخی کے پاس بزرگوں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ وہ بڑے خوش طبع اور ظریفانہ فطرت لوگ تھے۔ یہ فقیر صحرا کے سفر کی تکلیفیں برداشت کر کے پہنچا تھا۔ تھکا ماندہ اور بھوک سے نڈھال تھا۔ ان بزرگوں میں سے ایک نے مذاقاً فقیر سے کہا، ہم باتیں کیے جا رہے ہیں آپ کو بھی کچھ کہنا چاہیے۔ اس نے کہا، میں نہ بزرگ ہوں اور نہ علم و ادب سیکھا ہے۔ میری جانب سے تو صرف ایک شعر سن لیں۔ سب نے شوق سے شعر سنانے کے لیے کہا۔ فقیر نے شعر سنایا جس کا ترجمہ یہ ہے: میں فاقہ زدہ روٹی کے دسترخوان کے پاس ایسا ہی ہوں جیسا کہ کوئی بغیر بیوی کے عورتوں کے حمام کے دروازے پر! یہ سن کر سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ پھر اندازہ لگا لیا کہ اسے بھوک لگی ہے۔ فوراً اس کے لیے دسترخوان بچھایا۔ میزبان نے پُر تکلف کھانے کا عزم کر کے تھوڑی دیر ٹھہرنے کو کہا کہ نوکر پُر تکلف کھانے اور کوفتے تیار کر رہے ہیں۔ اس پر فقیر نے دوبارہ سراٹھایا ہنسا اور کہا، اگر میرے دسترخوان پر کوفتہ نہیں، تو کوئی بات نہیں۔ تھکے ماندے کو تو روکھی سوکھی ہی کوفتہ لگتی ہے۔

درس حیات:

۱۔ جب کسی کو سخت بھوک ہو، تو وہ لذیذ کھانے کا انتظار نہیں پسند کرتا۔ ۲۔ بھوک پیاس والا انسان رنگین محفل یا دلچسپ کو پسند نہیں کرتا۔ ۳۔ جس کو کسی چیز کی تشنگی ہو، وہ اس کا دل و جان سے خواہش مند رہتا ہے۔ ۴۔ تھکے ماندے اور بھوکے کے لیے روکھی سوکھی بھی کوفتہ ہے۔ (شیخ سعدی شیرازی، انتخاب: حاجی فراز احمد سلیم، شیخوپورہ)

تجربیاتِ زندگی

بیٹھ گیا، تو مسکراتے ہوئے پوچھا ”کہو بھی کیسے آنا ہوا، لگتا ہے کوئی بہت خاص کام ہے۔“

ابرار بھی مسکرایا، لیکن مسکراہٹ خاصی شرمیلی سی تھی۔ وہ اپنی جیب سے موبائل نکالتا ہوا بولا ”یار مجھے میسج کرنا تو سیکھا دو۔ دفتر میں تم سے اس لیے نہیں کہا کہ ہر وقت لوگ ارد گرد بیٹھے ہوتے ہیں۔ کوئی سنے گا، تو کیا کہے گا کہ اس شخص کو ابھی تک میسج کرنا نہیں آتا۔“ بات سن کر میں نے بے ساختہ زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”یار یہی بات کئی دن سے میں تم سے کہنے کا سوچ رہا تھا لیکن شرم کی وجہ سے کہ نہیں پایا۔“

ابرار نے مجھ سے بھی زیادہ زوردار اور طویل قہقہہ لگایا اور بولا: ”یار تم سے یہی امید تھی۔ ہم لوگ بھی عجیب ہیں، پچپن ساٹھ سال کے ہو چکے اور ہمیں میسج تک کرنا نہیں آیا۔ یار واقعی ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اچھا چھوڑو اپنے دونوں لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلاؤ، ان دونوں کو یقیناً میسج کرنا آتا ہوگا۔“

”ہاں، ہاں، بالکل آتا ہے۔ اور بہت کچھ آتا ہے۔ دونوں پورے موبائل ماسٹر ہیں۔ لیکن اس وقت ایک بھی گھر پر نہیں، صبح سے کرکٹ کا میسج کھیلنے نکلے ہیں۔ واپسی شام تک ہی ہوگی۔“



بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

دورِ نوع میں سرعت سے جنم لیتی
تبدیلیوں کا ایک شگفتہ روپ

قاضی شارق محمود

فروری کا مہینا اور اتوار کا دن تھا۔ صبح کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا اخبار کا مطالعہ کرتے ساتھ ہی فروری کی میٹھی اور پیاری دھوپ سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا کہ گھر کی اطلاعی گھنٹی نے زوردار انداز میں کسی کی آمد کی اطلاع دی۔ چھت کی منڈیر سے جھانک کر نیچے دیکھا تو ابرار کھڑا نظر آیا۔ ابرار میرے دفتر کا ساتھی ہے۔ میرا اور اس کا روزانہ آٹھ نو گھنٹے کا ساتھ ہے، اس لیے ہمیں ایک دوسرے کے گھر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کبھی کبھار ہی آنا جانا ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے دیکھا، تو مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ دل ہی دل میں سوچا کہ اسے بھلا میرے گھر آنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ بہر حال اخبار میز پر رکھ نیچے اتر اور اسے لیے چھت پر چلا آیا۔ واپس آتے ہوئے اپنی شریک حیات رابعہ سے چائے کا کہنا نہ بھولا۔ ابرار اطمینان سے



”اچھا چلو خیر..... پھر کبھی سہی..... لیکن مطلوب، یہ تو بتاؤ، جب تمہارے دونوں بیٹے موبائل ماسٹر ہیں، تو تم ان ہی سے میسج کرنا کیوں نہیں سیکھ لیتے؟“

ابرار کی بات نے پھر مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ میں ہنستے ہوئے بولا، ”بھئی تم اپنے بچوں سے کیوں نہیں سیکھتے؟ شرم کی وجہ سے نہ! مجھے کامل یقین ہے، تمہارے بچے بھی اتنے ہی موبائل ماسٹر ہوں گے جتنے میرے! تم اپنے بچوں سے میسج کرنا اس لیے نہیں سیکھتے کہ کہیں بچے یہ نہ سوچیں کہ ہمارا ابا، ابا ہے یا کوئی ڈبا! جسے میسج کرنا تک نہیں آتا۔“

”ہاں، ہاں بالکل یہی بات ہے، یہی بات ہے۔“ ابرار نے تیزی سے گردن ہلاتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا۔ میں بھی قہقہے میں شامل ہو گیا۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ہمارے قہقہے ابھی پوری طرح ختم بھی نہیں ہو پائے تھے کہ رابعہ نے آواز دی۔ میں چائے اوپر لے آیا۔ چائے پینے کے دوران مجھے ایک خیال آیا۔ ابرار سے پوچھا ”یار یہ تو بتاؤ، تمہارے بچے اس وقت گھر پر ہیں یا نہیں؟“

”گھر پر ہی ہیں، کیوں؟“

”میرا خیال ہے میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلتا ہوں۔ تمہارے بڑے لڑکے اظہار سے میسج کرنا سیکھ لوں گا، پھر تمہیں سکھا دوں گا۔ اس طرح ہم دونوں کا مسئلہ بخوبی حل ہو جائے گا۔“

”واہ..... زبردست..... بہت اچھا خیال ہے۔“ پھر چٹکی بجا کر اٹھتے ہوئے بولا ”تو چلو اٹھو، نیک کام میں دیر کیسی۔“

میں کچھ ہی دیر بعد ابرار کے ساتھ اس کے گھر پہنچا۔ بیٹھک میں مجھے بٹھانے کے بعد وہ اظہار کو لینے چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد تنہا ہی واپس آیا اور بولا ”یار مطلوب، اظہار کو تو اس کی ماں نے کسی کام کے سلسلے میں اپنی بڑی بہن کے گھر بھیجا ہے۔ البتہ اعتبار گھر پر ہے۔ وہ ابھی آرہا ہے، تم اس سے میسج کرنا اچھی طرح سیکھ لینا۔“

”اعتبار؟ یار وہ تو ابھی صرف نو سال کا ہے۔ اسے رہنے دو۔ میں اظہار کا انتظار کر لیتا ہوں۔ وہ ماشاء اللہ پندرہ سال کا سمجھ دار بچہ

ہے، اچھی طرح سمجھا سکے گا۔“

ابرار ہنستے ہوئے بولا ”یہ سمجھ داری کی بات بھی تم نے خوب کی۔ ارے بابا آج کل جتنا چھوٹا بچہ ہو وہ اتنی ہی خوبی سے موبائل اور کمپیوٹر استعمال کرنا جانتا ہے۔ تم بس اس سے ایک مرتبہ کہنا تو سہی، پھر دیکھنا وہ کتنی ذہانت کے ساتھ تمہیں میسج کرنا سیکھاتا ہے۔“

واقعی ایسا ہی ہوا۔ نو سالہ اعتبار نے نہایت مہارت سے مجھے میسج کرانا سکھایا۔ اس کی بتلائی ہوئی ایک ایک بات میرے دماغ میں بیٹھتی چلی گئی۔ میں نے اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ابرار سے کہا ”تمہارا نو سالہ بچہ واقعی بہت ذہین ہے، اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔ آج کل کے بچے واقعی گلاب کے پھولوں کے مانند ہیں۔ ان کی ذہانت کی خوشبو سے سارا گھر مہکتا ہے۔ ایک زمانے میں ہم بھی بچے تھے، لیکن بس کاغذی پھولوں کی طرح جن میں خوشبو کا کوئی نام و نشان تک نہیں ہوتا۔“

اس سے پیشتر کہ ابرار میری بات پر کوئی تبصرہ کرتا، اعتبار مسکراتے ہوئے بولا ”ارے انکل آج کل تو کاغذی پھول بھی اصلی پھولوں سے بھی زیادہ خوشبو دیتے ہیں۔ میرے کمرے میں کاغذ سے بنے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ رکھا ہے۔ سچ اتنی پیاری خوشبو دیتا ہے کہ اصلی تازہ گلاب کے پھول بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کہیں تولا کر دکھاؤں۔“

”ہاں، ہاں، کیوں نہیں، ہم بھی تو دیکھیں کہ وہ کیسے کاغذی پھول ہیں جو تازہ اصلی گلاب کے پھولوں سے بھی زیادہ خوشبو دیتے ہیں۔“

اعتبار یہ سن کر بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں گیا۔ کچھ دیر بعد بھاگتا ہوا ہی واپس آیا۔ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا کاغذی گلدستہ تھا۔ آتے ہی کاغذی پھول میری ناک سے لگا دیے۔ میری ناک گلاب کی خوشبو سے بے تحاشا بھر گئی، میں نے حیرت بھری آواز میں کہا۔ ”واہ بھئی، تمہارے گھر کے تو کاغذی پھول بھی بلا کی خوشبو دیتے ہیں، کمال ہے۔“

میرے تحسین بھرے الفاظ سن کر اعتبار خوشی خوشی اپنے پھول

لیے واپس چلا گیا۔ ابھی اسے کمرے سے نکلے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ اس کی ماں، فائزہ کی غصہ بھری آواز سنائی دی:

”اعتبار کے بچے ادھر آؤ، کدھر جا رہے ہو؟“

”اپنے کمرے میں امی“ اعتبار کی سہمی سی آواز سنائی دی۔

”کمرے کے بچے، میں کہتی ہوں ادھر آؤ، کیا چیز لے کر جا رہے ہو؟“

”کچھ نہیں امی، کچھ نہیں۔“ اب اعتبار کی آواز میں پہلے سے بھی زیادہ خوف تھا۔

”کچھ نہیں کے بچے یہ کیا چیز چھپا رہے ہو، میں کہتی ہوں باتھ آگے کرو..... اوہ..... یہ تو پھول ہیں۔“

”جی..... جی امی..... پھول..... وہ ذرا انکل کو پھولوں کی خوشبو.....“

”خوشبو..... خوشبو کے بچے تیری، تو آج میں اچھی طرح خوشبو نکالتی ہوں.....“ ساتھ ہی چٹاخ چٹاخ کی دو تین زوردار آوازیں سنائی دیں۔ میرا خیال ہے اس پھول جیسے بچے کے رخساروں پر ماں نے بھرپور تھپڑ مارے تھے۔ میرا دل لرز کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا یہ طمانچے بچے نہیں میرے دل کے رخساروں پر پڑے ہوں۔ ساتھ ہی میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

یہ رابعدھی، سننے لگی کہ آپ کی چھوٹی بہن شہنیل اپنے شوہر اور چار سالہ بیٹی سعدیہ کے ساتھ آئی ہے، جلدی سے گھر پہنچ جائیں۔ اور میں جلد گھر پہنچ گیا۔ جب کبھی میں اپنی چھوٹی لاڈلی بہن شہنیل کا نام سن لوں، تو پھر مجھ سے رہا نہیں جاتا، جتنی جلد ممکن ہو، فوراً گھر پہنچ جاتا ہوں۔ جب شہنیل انتہائی والہانہ انداز میں بھائی، بھائی پکارتے میرے گلے سے آن لگے، تو ایسا لگتا ہے جیسے پوری کائنات میرے سینے سے آگئی ہو۔

شہنیل اذان مغرب سے کچھ دیر پہلے شوہر اور اکلوتی بچی کے ساتھ اپنے گھر واپس گئی۔ میں دونوں بیٹوں کے ساتھ مسجد نماز پڑھنے چلا گیا۔ مسجد میں پرانے محلے کے پڑوسی سجاد ضیا سے ملاقات ہوئی۔ سجاد صاحب بچوں کی مار پیٹ کے سخت خلاف تھے۔ اکثر مجھے اس بات کی تلقین کرتے کہ دیکھو اپنے بچوں کو کبھی

مت مارنا، کوئی بھی مسئلہ ہو، ہمیشہ انھیں پیار سے سمجھانے کی کوشش کرنا۔ مار کسی بھی مسئلے کا حل نہیں، یوں چھوٹا مسئلہ بھی پھیل کر بڑا ہو جاتا ہے۔ بات سلجھتی نہیں مزید الجھ جاتی ہے۔

میں سجاد صاحب کی باتوں سے بالکل متفق ہوں۔ یہی وجہ ہے، ان سے ملاقات کے بعد چٹاخ چٹاخ کی آوازیں میرے دل و دماغ میں تازہ ہو گئیں۔ یہ ان طمانچوں کی آوازیں تھیں جو فائزہ نے اعتبار کے پھول جیسے پیارے رخساروں پر مارے تھے۔ پھر یہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ میں بستر پر سونے جا لیٹا۔ جب یہ تھم نہ سکیں، تو یکدم گھبرا کر اٹھ بیٹھا، موبائل نکال کر برابر کا نمبر ملایا اور بولا ”یار یہ تمہاری بیگم اپنے بچوں کو ہمیشہ ہی اس بری طرح مارتی ہے کیا، اور وہ بھی بلا وجہ؟“

”بری طرح مارتی ہے؟ اور وہ بھی بلا وجہ.....، یار یہ آخر تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”وہی کہہ رہا ہوں جو میں آج تمہارے گھر دیکھ کر آیا۔“ میرے کانوں میں اب بھی ان طمانچوں کی آواز مسلسل گونج رہی ہے جو تمہاری بیوی نے معصوم سے بچے اعتبار کے گالوں پر مارے۔ تم یقین کرو، یہ طمانچے مجھے اب تک اپنے دل و دماغ پر لگتے محسوس ہو رہے ہیں۔“

”تم خواہ مخواہ جذباتی ہو گئے۔ لگتا ہے تم کچھ زیادہ ہی حساس طبیعت کے مالک ہو۔ ارے بابا میری بیوی بچوں کو مارنے والی ماؤں میں سے ہرگز نہیں، وہ صرف اسی وقت مارتی ہے جب بچے اسے چیخ چیخ کر خود بیل کہ آمی مجھے مار۔ اور جب وہ تنگ آ کر کسی بچے کو مار بھی لے، تو پھر گلے سے لگا کر پیار بھی کرتی ہے۔ پیار کر کے اتار دیتی ہے کہ خود بچہ پریشان ہو کر اسے چپ کرانے لگتا ہے۔ یار یہ اپنا اعتبار ہے نا یہ جتنا ذہین ہے اتنا ہی شریر بھی ہے۔ آئے دن اپنی نت نئی شرارتوں سے ناک میں دم کر کے رکھ دیتا ہے۔ آج بھی بتا ہے کیا ہوا تھا، اس نے فائزہ کی پوری عرق گلاب کی شیشی کاغذی پھولوں پر انڈیل دی تھی۔ تم اب کچھ سمجھے یا نہیں؟“

ابراہیم نے یہ کہہ کر زندگی سے بھرپور ایک طویل قہقہہ لگایا۔

میرے ہونٹوں سے بھی ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔

بیٹی کی فریاد

مصیبت کی ماری ماں کا ماجرا،
قسمت نے اس پر بلا مسلط کر دی تھی

خدیجہ ارشاد

خانے کی طرف چل دی۔
ثانیہ اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس کی شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے، مگر تاحال اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ اس کا میکہ امی اور اکلوتے بھائی دانیال پر مشتمل تھا۔ ابو کی وفات کے بعد اس کی والدہ زبیدہ خاتون اکیلی رہ گئی تھی، اسی لیے انھوں نے سال پہلے دانیال کی شادی کر دی۔ اس وقت سب اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔

ثانیہ نے آہستہ سے باورچی خانے کا دروازہ کھولا، تو سانسے زبیدہ خاتون آنا گوندھ رہی تھی۔ ”امی! آپ اس وقت آنا کیوں گوندھ رہی ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
”بھوک لگ رہی تھی۔“ انھوں نے ہولے سے جواب دیا۔ ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت باورچی خانے میں اپنی موجودگی کو ثانیہ سے چھپانا چاہتی تھیں چونکہ اب وہ دیکھ چکی تھی، اس لیے انھیں ناگوار گزارا۔
”کسے؟ آپ کو؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں! دانیال کو۔“

”یہ پیٹو بھی نابلس، ہمیشہ بھوکا ہی رہتا ہے۔“ وہ ہنس دی۔ اس کے لہجے میں بھائی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ پھر اچانک کچھ یاد آنے پر بولی ”مگر اس نے آپ کو کیوں جگایا؟ بھابی سے کہہ دیا ہوتا۔“

سیاہ رات چھا چکی تھی۔ بادلوں نے چاند کو اپنی گہری اوٹ میں چھپا کر تاریکی میں مزید اضافہ کر دیا۔ وقفے وقفے سے بجلی چمک رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ماحول کا حسن بڑھا رہے تھے۔ ثانیہ کھڑکی سے سر نکالے بادلوں اور چاند میں ہونے والی آنکھ پھولی دیکھ رہی تھی۔ دفعۃً اسے باورچی خانے میں کھٹ پٹ کا احساس ہوا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، رات کے دس بج رہے تھے، اس وقت وہاں کون کیا کر رہا ہے؟ اس نے حیرت سے سوچا اور باورچی



”اس نے نہیں جگایا، میں خود آئی ہوں۔“ انھوں نے کافی تیز لہجے میں کہا، تو ثانیہ کو عجیب سا احساس ہوا۔
اس نے سر جھٹک کر دوبارہ پوچھا ”مگر آپ کو کیسے پتا لگا کہ اسے بھوک لگی ہے؟“

”میں ماں ہوں اس کی زبیدہ خاتون چلائیں“ اگر مجھے نہیں پتا ہوگا کہ میرے بیٹے کو بھوک لگی ہے، تو اور کسے ہوگا؟
کون رکھے گا اس کا خیال؟“

ثانیہ بکی بکی ماں کا منہ تکتے لگی۔ تب انھیں اپنے رویے کا احساس ہوا، تو منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ امی کو کیا ہوا؟ اسے وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی، اس نے آگے بڑھ کر اپنا بازو ماں کے کندھے پر رکھ کر انھیں اپنے قریب کر لیا اور بولی ”میرا یہ مطلب نہیں تھا امی! دانیال میرا کلوتا بھائی ہے۔ وہ مجھے بھی بہت پیارا ہے۔ اگر آپ اس کا کام کریں گی، تو مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔ میں تو آپ کے آرام کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔“ اس نے وضاحت دی۔

زبیدہ خاتون کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جسے انھوں نے فوراً ہاتھ سے صاف کیا اور تواچو لھے پر رکھتے ہوئے بولیں۔
”میرا دل کرتا ہے اپنے بیٹے کے لیے روٹی بنانے کو۔“

ثانیہ ماں کی سادگی پر بے ساختہ مسکرا کر بولی ”تو بنائیں نا، وہ آپ کا بیٹا ہے، آپ کو کون روک سکتا ہے؟ کسی بھی وقت بنائیں، لائیں میں بھی آپ کی مدد کرتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ آنے کا پیڑا بنانے لگی۔

”نہیں بیٹی! میں کسی بھی وقت اس کے لیے روٹی نہیں بنا سکتی۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ الگ ہو گئے ہیں، اس لیے میں اپنا کھانا الگ بناتی ہوں۔“ انھوں نے ثانیہ کے سر پر بم پھوڑا۔

”کیا؟ الگ ہو گئے؟ کس سے؟ آپ سے؟“ آٹے کا پیڑا ثانیہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ اسے اپنی سماعتوں

پر شک ہوا۔

”انھیں الگ ہوئے چار ماہ ہو گئے ہیں۔ عینی نے کہہ دیا ہے کہ وہ میرے لیے روٹی نہیں بنا سکتی۔ اسی لیے میں اپنا ہر کام خود کرتی ہوں۔ گھر میں سبزی سے لے کر سرف تک ہر چیز دو کی تعداد میں آتی ہے۔ عینی نے مجھے دانیال کا کوئی بھی کام کرنے سے منع کیا ہوا ہے۔ اگر میں زبردستی کر لوں، تو ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے۔ وہ اس کے سامنے مجھ سے بات بھی نہیں کرتا۔ صبح دفتر جاتے ہوئے سلام کر جاتا ہے۔ پھر سارا دن پلٹ کر خبر نہیں لیتا۔ اگر عینی میکے گئی ہو، تو کھانا ہوٹل سے کھاتا ہے۔“

”ابھی میں پانی پینے کے لیے اٹھی تھی۔“ انھوں نے بات جاری رکھی ”دیکھا کہ لاؤنج میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ تمھیں تو اس کی عادت کا پتا ہے نا، جب بھی اسے رات کو بھوک لگے، تو کسی کو نہیں جگاتا، بس کتاب پڑھنے بیٹھ جاتا ہے۔ پگلا نہ ہو تو۔“ وہ پھٹکی سی ہنسی بنیں۔ ”اب میں نے اسے دیکھا تو سمجھ گئی، اسے بھوک لگی ہوئی ہے۔ اس لیے باورچی خانے میں آگنی۔ تم پریشان مت ہو بیٹی، شادی کے بعد سب لوگ الگ ہو جاتے ہیں۔ زمانہ ہی ایسا آگیا ہے، کیا کریں۔“ ماں نے بیٹے کا دفاع کرتے ہوئے سارا الزام زمانے کو دے دیا۔ ثانیہ کو لگا، جیسے کسی نے پگھلا سیسہ اس کے کانوں میں ڈال دیا۔

”آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ اسے اپنی آواز گہری کھائی میں سے آتی محسوس ہوئی۔

”تم سسرال میں تھی، پریشان ہو جاتی۔ اس لیے نہیں بتایا۔“

”دانیال نے کچھ نہیں کہا اس سارے معاملے میں؟“ ثانیہ کے دل میں موہومی امید جاگی۔

”وہ مجھے آکر کہنے لگا، امی اگر آپ گھر میں سکون دیکھنا چاہتی ہیں، تو اپنا کھانا خود بنالیا کریں۔ اپنے کپڑے، برتن خود دھولیں۔ عینی کی طبیعت غصے والی ہے۔“

ثانیہ کو زمین گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”لھر میں سکون رکھنے کے لیے اگر مجھے اتنی سی قربانی دینی پڑ گئی، تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھی اگر غصہ یا ناراضی دکھاؤں تو ڈر ہے، کہیں گھر سے ہی نہ نکال دیں۔ اس عمر میں کہاں دھکے کھاتی پھروں گی۔ پریشان مت ہو، جا کر سو جاؤ۔“ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، تو ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”ہائے! میری ماں کا صبر“ ثانیہ کی آنکھیں سلگنے لگیں۔ وہ بمشکل اپنا وجود گھسیٹتی ہوئی صحن تک لائی اور ستون کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ”ہمارے اعمال کی طرح سیاہ رات.....“ اس نے سوچا ”میں ماں نہیں بن سکی تو بہت دکھی ہوں، مگر جسے جنت سے اونچے اس عہدے سے نوازا گیا، وہ تو اولاد کے پائیدار پر پڑی ہے۔“

”میرا دل لرتا ہے اپنے بیٹے کے لیے رونی بنائے لو! ماں کی آواز کانوں میں گونجی، تو وہ سک پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیے اور بولنے لگی ”میں تجھ سے کیا مانگوں؟ اپنے لیے بیٹا یا اپنی ماں کے واسطے اس کا بیٹا؟ اے دلوں کو پھیر دینے والے اللہ! میرے بھائی کا دل ماں کی طرف پھیر دے۔“

آنسو اس کا چہرہ بھگور رہے تھے۔ ایک دم بادل زور زور سے گرج کر زمین والوں کی بے حسی کا اعلان کرنے لگے اور آسمان ماں کے دکھ میں شامل ہونے کے لیے برس پڑا۔

دنیا تر سے جنت نوں
میں ”گھر وچ“ کے دی جنت زلدی دیکھی

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام حضرت عمرؓ کا مکتوب

لوگوں کو عام طور پر اپنے حکمرانوں سے نفرت ہوتی ہے۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں اور تم کسی برائی، کینہ، خواہش اور دنیا کے لالچ میں نہ پڑ جائیں۔ اس لیے تم حدود اللہ کو قائم کرتے رہو، چاہے اس کا موقع تھوڑے وقت ہی کے لیے مل سکے۔ اگر تمہارے سامنے انتخاب کے لیے دو چیزیں ہوں، ایک وہ جس سے آخرت کمائی جاسکتی ہو اور دوسری وہ جس سے دنیا حاصل ہوتی ہو تو اول الذکر کو ترجیح دو۔ اس لیے کہ دنیا اور اس کا فائدہ تو جلدی ختم ہو جائے گا، لیکن آخرت کا فائدہ ہمیشہ باقی رہے گا۔

اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتے رہو اور ایسا طریقہ اختیار کرو کہ فاسق و فاجر لوگ تم سے خوف کھاتے رہیں اور ان فاسقوں کو قید و بند میں رکھو۔ دو قبیلوں یا خاندانوں میں عداوت چلی آرہی ہو اور وہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہو رہے ہوں، تو یہ یقیناً شیطان کی کانا پھوسی کا نتیجہ ہے۔ تم انہیں بزور شمشیر سیدھا کرو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئیں اور وہ قبائلی اور خاندانی تعصب چھوڑ کر خدائے ذوالجلال اور اسلام کی طرف دعوت دیں لگیں۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ہمیشہ شکر بجالاتے رہو، اس سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے اور اسے دوام بھی ملتا ہے۔ اپنے ساتھ لوگوں کی اطاعت اور فرمانبرداری کو الفت و محبت، مدد و نصرت، تواضع اور شفقت کے ذریعے سے قائم اور وابستہ رکھو۔ اور اچھی طرح جان لو کہ ایک حاکم کو بھی خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ جب حاکم ٹیڑھا ہو جائے، تو رعایا بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور وہ حاکم بڑا ہی بدنصیب ہے جس کی وجہ سے رعایا بدنحقی اور نحوست کا شکار ہو۔

والسلام

(ان دنوں جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی) صبح ہمارے ساتھ جاتے۔ اس گروہ میں شوکت بیگ بھی شامل تھیں۔ شوکت کو اس کے والد، بیگ صاحب چھوڑنے آتے۔ وہ معزز شخصیت کے مالک تھے۔ سفید کرتا پا جامہ پہنا ہوتا۔ جب تک ریل چل نہ پڑتی، کھڑے رہتے۔ ہماری ایک ساتھی انجم، شوکت سے کہتی ”تم اپنے ابا جان سے کہو کہ میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔“ کیونکہ اکثریت ویگن یا رکشے میں خود ہی آتی تھی۔ شوکت مسکرا دیتی۔ اس کی طبیعت میں بڑی متانت تھی اور وہ لیے دیے رہتی۔ تمام راستے اس کے سامنے کتاب کھلی رہتی۔ کوئی اس سے بات کرتا، تو خوشدلی سے جواب دیتی۔ خود کوئی بات نہ کرتی۔ رفتہ رفتہ شوکت سے میری دوستی ہو گئی۔ دوستی کی وجہ ہمارا مطالعے کا شوق تھا۔ اکثر ہم ایک دوسرے سے کتابیں لیتے دیتے۔

میری زندگی کے یادگار کردار

بیگ صاحب

مشکلات میں بھی مثبت رویہ اپنانے والے ایک رحم دل شخصیت کے سدا بہار اوراقِ زیست

ڈاکٹر نجمہ سہیل



شخصیتیں ذہن کے گوشوں میں ایسے محفوظ ہو جاتی ہیں کہ سڑک پر چلتے، کتاب پڑھتے یا جماعت میں شاعری پڑھاتے ہوئے کسی نہ کسی حوالے سے یاد رہتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ زندہ ہیں اور دنیا سے کبھی گئے ہی نہیں۔ بیگ صاحب بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۷ پر ہوئی جہاں سے سیالکوٹ ایکسپریس صبح چلتی تھی۔ ان دنوں میری تعیناتی سیٹلائٹ ٹاؤن کالج، گوجرانوالہ میں بطور لیکچرار ہوئی تھی۔ میرے بچے چھوٹے تھے، لہذا گوجرانوالہ میں قیام ناممکن تھا۔ میری طرح دو اور خواتین بھی ایسے ہی گھریلو مسائل کا شکار تھیں، سو ہم روزانہ صبح گوجرانوالہ جاتے اور دوپہر واپس لاہور آ جاتے۔ ویسے تو تھکا دینے والا کام تھا، لیکن کچھ تو پڑھانے کا شوق اور کچھ دوستوں کی رفاقت، روزانہ کا سفر برانہ لگتا۔ بعض لوگ ویک اینڈ گزار کر ہفتے کے دن



ایک صبح اسیتس پیچی، تو سب لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ قلی نے بتایا، گاڑی ابھی نہیں لگی۔ میں شوکت کے پاس چلی گئی۔ اس نے بیگ صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے جھک کر آداب کیا پھر مجھ سے میرے مضمون کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ اچانک انھوں نے پوچھا کہ غالب کے اس شعر کا پہلا مصرع کیا ہے بھلا ع

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا میں نے شعر مکمل کیا۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا انھوں نے جھک کر آداب کیا۔ قریب کھڑی شوکت مسکرانے لگی۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بروقت مصرع یاد آ گیا ورنہ بڑی بے عزتی ہوتی۔ اتنے میں ریل آن لگی، تو سب لوگ لپکے۔ بیگ صاحب کہنے لگے ”اچھا کسی روز آپ سے غالب کے بارے میں بات کریں گے“

ریل میں شوکت کے قریب بیٹھتے ہوئے میں نے کہا ”میں تو تمہارے اباجی سے ڈر گئی تھی۔ انھوں نے اچانک ہی پوچھ لیا۔ اگر مجھے یاد نہ آتا، تو بڑی سبکی ہوتی۔“

”اباجی کو غالب کا خط ہے“ اُس نے مختصر جواب دیا اور کتاب میں کھو گئی۔ میں باقی لوگوں کے ساتھ بادامی باغ اور شاہدرے کی بھیڑ بھار کا مشاہدہ کرنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھتوں پر سوتے لوگ، منہ بسورتے بچے اور چولھے جلاتی عورتیں ہمارے لیے دلچسپ مرقع تھے۔

اب ہر ہفتے بیگ صاحب سے ملاقات ہونے لگی۔ کبھی سرسری سی کبھی ایک دو باتیں ہو جاتیں۔ کبھی وہ ذوق کا کوئی شعر سنا کر داد چاہتے۔ کبھی میری کسی غزل کا ایک شعر مجھ سے سننا چاہتے، مجھے یاد آتا، تو سنا دیتی ورنہ شرمندہ سر کو جھکا لیتی۔ اس زمانے میں ان سے سب کا یہی تعارف تھا کہ شوکت کے اباجی ہیں۔ سو ہم انھیں اباجی ہی کہتے۔

کہتے ہیں، زمانے کے اتفاقات انقلاب لے آئے ہیں۔ شوکت کے بھائی، انور پی آئی اے میں ملازم تھے۔ گھر والے ان کے لیے موزوں رشتے کی تلاش میں تھے۔ میری چھوٹی بہن نورین ایک مرتبہ میرے ساتھ کالج گئی۔ شوکت کو وہ اچھی لگی۔ وہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ ہمارے ہاں آئی۔ امی سے ملی۔ پھر اپنی ایک دوست کے ذریعے نورین کے لیے بھائی کا پیغام دیا۔ ان کی شرافت کے کبھی مداح تھے، سو شادی ہو گئی۔ یوں اس گھرانے سے رشتہ قائم ہوا۔ نورین میاں کے ساتھ کراچی چلی گئی۔ اسی دوران شوکت کی بھی شادی ہوئی اور وہ فیصل آباد سدھاری۔

شوکت کی والدہ فوت ہو چکی تھیں۔ مسلم ناؤن میں بیگ صاحب شوکت کی بڑی بہن، فرخ کے ساتھ رہتے تھے جو غیر شادی شدہ تھیں۔ ان کا پورا نام عبداللہ انور بیگ تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل اور تحریک پاکستان کے زبردست کارکن رہے تھے۔ بڑے بکے مسلم لیگی تھے۔ قائد اعظم کے ساتھ ان کی کئی تصاویر انھوں نے سنبھال رکھی تھیں۔ جب موڈ میں ہوتے، تو نکال کر دکھاتے۔ جس وقت میں ان سے ملی وہ تقریباً ۵۷ کے پیٹے میں تھے۔ جسمانی طور پر بہت چاق و بوند تھے۔ ان کی صحت کاراز متوازن و کم خوراک اور صبح کی سیر میں تھا۔ روشن خیالی اور ادب کے مطالعے نے ان پر وہ یاس انگیز کیفیت طاری نہ ہونے دی جو اس عمر میں ہو جاتی ہے۔ ان کی سوچ بہت مثبت اور طبیعت میں درویشی تھی، لیکن وہ ایسے مزے کے درویش تھے کہ ہمیشہ پتلون کوٹ پہن کر باہر جاتے۔

اگر قمیص و پاجامہ پہنتے، تو بہت صاف ستھرا اور استری شدہ۔ سیاہ جوتے بھی چمک رہے ہوتے۔ ذاتی سواری کبھی نہ رکھی۔ عدالت سے فارغ ہوئے، تو باہر نکلتے۔ رکشاملا، تو وہ لے لیا وگین ملی، تو اس میں بیٹھ گئے۔ انور بھائی نے بہت مرتبہ کوشش کی کہ وہ گاڑی اور ڈرائیور رکھ لیں۔ وہ نہ مانے، ان کا کہنا تھا کہ میں آزاد انسان ہوں۔ کئی لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ جب تک جا باگپ شپ کی اور پھر گھر چلے آئے۔ دوسرے انھیں یہ

بات گوارہ نہ تھی کہ ایک بندہ خدا سارا دن ان کا انتظار کرے۔
فرخ ان کی عادت کو جانتی تھی۔ اس نے بھی انور بھائی کو منع کیا
کہ ابوسارا دن عدالت سے نکل نکل کر ڈرائیور کی مزاج پر سی
کریں گے۔ دیر سے آنے پر سخت شرمندہ اور بار بار معذرت
کریں گے۔ یہ گاڑی بجائے راحت کے عذاب بن جائے گی۔
وہ ویگن میں سوار ہوتے، تو اپنے ساتھ سوار ہونے والوں کا کرایہ
ادا کر دیتے۔ بچوں تک کو جگہ دینے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

اگر رکشے میں آتے، تو اسے باہر روک دیتے۔ خاص طور پر
گرمیوں میں تو اپنا فرض سمجھتے کہ رکشا ڈرائیور کو شربت ضرور پلایا
جائے۔ فرخ بھی شربت تیار رکھتی۔ دیکھنے والا منظر ہوتا کہ یہ
رکشے والے کو شربت پیش کر رہے ہیں۔ وہ بے چارہ ششدر
..... کہ ایسا سلوک کہاں پایا ہوگا! سواریاں تو عام طور پر کرائے کے
حوالے سے لڑتی جھگڑتی اترتی ہیں۔ ان کا یہ حال کے تیس
روپے کرایہ بنا ہے اور پچاس روپے دے رہے ہیں کہ بچوں کے
لیے کچھ لے جانا۔ وہ گھبرا کر واپس کر رہا ہے۔ اگر کوئی کچھ کہتا، تو
جواب دیتے ”یہ تو اس کا حق ہے۔ مجھے گھر کے آگے اتارا، اتنی
مہربانی کی۔“ گھر میں خوب پھل لاتے۔ پھل والا اکثر ایک دو
دانے خراب ڈال دیتا۔ فرخ ناراض ہوتی ”اباجی دیکھ بھال کے
لایا کریں۔ پھل والے، تو آپ کا انتظار کرتے ہیں کہ آپ
آئیں، تو خراب مال نکلتے۔“

وہ کہتے ”میرے سامنے ہی خراب مال ڈالتا ہے۔“

”تو آپ منع کیوں نہیں کرتے؟“

جواب دیتے ”ایک دو دانوں سے میرا کیا جاتا ہے؟ اس
غریب آدمی کا نقصان کم ہوتا ہے۔“ ان کی خدا ترسی کے
واقعات لکھنے کے لیے الگ کتاب چاہیے۔

کام والیوں نے اگر پیسے مانگنے ہوتے، تو ان کے
سامنے فرخ سے مانگتیں کیونکہ وہ فوراً پرس نکال کر مطلوبہ رقم
سے زیادہ دے دیتے۔ فرخ کہتی ”اباجی آپ کو معلوم ہے، یہ
لوگ کتنا پیشگی لے چکی ہیں۔“

وہ اسے خاموش کروا دیتے اور کہتے ”تمہیں معلوم ہے
مانگنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ لوگ ہمیں آرام پہنچاتے ہیں،
ارے ان کا تو ہم حق ادا کر ہی نہیں سکتے۔“

جون کی ایک گرم دوپہر واپس آتے ہوئے ابھی رکشے سے
اتر ہی رہے تھے کہ ردی والے کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے
اسے روک لیا اور پوچھا ”بھئی روز کے کتنے کمالیتے ہو؟“
اُس نے کہا ”یہی دس بیس روپے۔“

بولے ”گرمی میں اس طرح پھرتے ہو۔ لوگ جائے گی۔
تم شام کو روزانہ بیس روپے لے جایا کرو۔ گرمی کم ہو جائے گی، تو
یہ کاروبار کرنا۔“

وہ آنکھیں پھاڑ کر انھیں دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وضع داری ان میں بہت تھی، بیگ صاحب کے ساتھ
کام کرنے والے منشی، قاصد اور دوسرے کم آمدنی والے لوگ
مشکل وقت میں ان سے امداد مانگتے، اور وہ کبھی انکار نہ
کرتے۔ انکار کا تو کیا ذکر، ہمیشہ اس معذرت کے ساتھ رقم
دیتے ”کاش میں اس سے زیادہ دے پاتا۔“ ان کا عقیدہ تھا
کہ مدد سے کبھی روپیہ نہیں گھٹتا۔ لاہور میں چونکہ فرخ اور وہ
اکیلے تھے، اس لیے ہم لوگ اکثر چکر لگالیتے۔ اگر وہ کبھی گھر
نہ ہوتے، تو انتظار کر لیتے۔ ہمیں معلوم تھا کہ اگر ہم ملے بغیر
چلے گئے، تو انھیں بہت کوفت ہوگی۔ وہ پھر ٹھیک طرح سے سو
بھی نہ پاتے۔ کچھ دیر سے آتے، تو سومرتبہ معذرت کرتے۔
فرخ سے کہتے ”بھئی چائے وغیرہ پلوائی؟“

میرا بھائی مذاق میں کہتا ”کہاں اباجی۔“

ناراض ہوتے ”کمال ہے میرا انتظار کیوں کیا؟“ فرخ بھی
مسکراتی رہتی اور دوبارہ چائے بنانے چلی جاتی۔

ان کا معمول تھا کہ مہینے میں ایک مرتبہ امی سے ملنے ضرور
آتے اور خالی ہاتھ نہیں چیزوں سے لدے پھندے! امی نے
بہت مرتبہ کہا کہ آپ کا اپنا گھر ہے، جب چاہیں آئیں، لیکن اس
قدر تکلف نہ کیا کریں۔ ان کا تکیہ کلام تھا: آپ نہیں سمجھتے، میں

والٹیر نے کہا

☆..... نیکی کرنا میری عبادت ہے اور خدا کے سامنے جھکنا میرا مذہب۔

☆..... کسی کو اپنی تعریف و تحسین پر مجبور کر دینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ اچھے کام کریں۔

☆..... آپ کی رائے سے متفق نہیں مگر آپ کے حق اظہار رائے کی میں تازیت حفاظت کروں گا۔

☆..... مجھے دنیا کی دو چیزوں سے سخت نفرت ہے: ایک کسی جاہل سے دشمنی کرنا اور دوسرے کسی ان پڑھ سے بحث کرنا۔

☆..... مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ، دشمنوں سے بچنے کا انتظام میں خود کرنا پڑے گا۔

☆..... بدی کے مواقع دن میں سو بار ملتے ہیں، لیکن نیکی کرنے کا موقع سال میں صرف ایک بار آتا ہے۔

☆..... زندگی بھر ایک دوسرے کا دوست بنے رہنا چند روزہ عاشق ہونے سے بہتر ہے۔

(اقوال زریں، انتخاب: آمنہ رمضان، ضلع پاکپتن)

فکر نہ تھی کیونکہ بقول ان کے ”جیب کتر نے والا بہت مجبور ہوگا جو اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہ کام کیا۔“ البتہ شناختی کارڈ اور دوسرے کاغذات بھی ساتھ چلے گئے۔ چند روز بعد شناختی کارڈ بذریعہ ڈاک آگیا۔ اس قدر خوش ہوئے کہ جیب کتر کی اخلاقی بلندی کے گن گاتے رہے۔ جو بھی گھر میں آتا اس کی تعریف کرتے۔ میں نے جل کر کہا ”ابا جی اب آپ اس چور کو اچھا نہ کہیں۔“

لیکن وہ مصر تھے ”اگر وہ نہ بھجواتا، تو میں اس کا کیا بگاڑ لیتا اور پھر مجھے نیا کارڈ بنوانے میں کتنی تکلیف ہوتی۔“ بس یہ ان کی عادت تھی کہ ہر کام اور بات میں مثبت پہلو دیکھتے۔ اس حادثے

سمجھتا ہوں۔“ وہ کہتے ”آپ نہیں سمجھتیں میں سمجھتا ہوں۔ بچوں والا گھر ہے، خالی ہاتھ کیسے آیا جاسکتا ہے؟“ شروع میں تو امی چائے کے ساتھ کافی اہتمام کرتیں، لیکن وہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے۔ رفتہ رفتہ وہ سمجھ گئیں کہ یہ تو چائے کی ایک پیالی سے ہی خوش ہو جانے والے ہیں۔ چائے کی خوب تعریف کرتے۔ ہر گھونٹ پر کہتے ”ماشا اللہ کیا خوش ذائقہ ہے۔“

بھائی نے ایک دن مذاق کیا ”ابا جی کل آپ کھوکھے کے مالک کو بھی یہی کہہ رہے تھے۔“

چونک پڑے ”اچھا آپ وہاں تھے، میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔“

سب ہنسنے لگے۔ بھائی کہنے لگی ”کیا آپ واقعی چائے کی تعریف کر رہے تھے؟“

بولے ”دیکھو اس نے تو سخت سے چائے بنائی۔ میں تعریف کر دیتا ہوں کہ اس کا دل بڑھ ہے، بھلا میرا کیا جاتا ہے۔“ وہ تو اس کے احسان مند تھے کہ طلب پر اس نے گرم چائے دی، دو روپوں کی حیثیت ہی کیا ہے۔

وہ ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے۔ پرانے مسلم ٹاؤن میں ان کی رہائش تھی۔ فرخ بڑی حسرت سے کہتی ”جب ہم یہاں رہنے آئے، تو نیا مسلم ٹاؤن ابھی آباد نہیں ہوا تھا۔ ہر طرف کھیت ہی کھیت تھی۔ ابا جی سے کتنا کہا کہ ایک پلاٹ ہم بھی لے کر اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں مانے۔“

وہ دنیا کو عارضی پڑاؤ سمجھتے تھے۔ کہتے ”دیکھو دنیا رہنے کی جگہ ہے بسنے کی نہیں۔ اس میں مستقل ٹھکانا کرنا حماقت ہے۔ تم لوگوں کو اچھی تعلیم دینا میرے مد نظر رہا۔ سو یہ فرض میں نے پورا کیا۔ اس بات کا بھی یقین ہے کبھی زمین کا بوجھ نہ بنو گے اور کیا چاہیے۔“

اور یہ حقیقت ہے کہ بیگ صاحب کی ساری اولاد بہت مفلس اور کشادہ دل ہے۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتی۔

ایک مرتبہ وگین میں کسی نے بیگ صاحب کی جیب کاٹ لی۔ تقریباً دس ہزار روپے مع پرس اڑا لیے۔ روپوں کی تو ان کو

کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ روپے زیادہ ہوتے، تو کپڑے میں لپیٹ کر پنڈلی پر باندھتے اور اوپر جراب چڑھا لیتے اور جیب میں چالیس یا پچاس روپے اور کچھ ریزگاری رکھتے۔ یہ مشورہ فرخ نے دیا تھا جو ویسے، تو ان کو پسند نہ آیا۔ لیکن جب اُس نے سمجھایا کہ آپ ویگن میں پرس نکالتے ہیں، تو لوگوں کی نظریں نوٹوں پر پڑتی ہیں اور ان کی نیت خراب ہو جاتی ہے۔ پیسے آپ کے پاس ہی ہوں گے۔ جب ضرورت ہوگی نکال لیا کیجیے۔ جب بھی وہ امی کے ہاں آتے بچوں کو پیسے ضرور دیتے۔ بچے بھی اتنے عادی ہو گئے تھے کہ جوں ہی وہ چائے ختم کرتے، وہ ان کے قریب بیٹھ جاتے کہ اب جراب میں سے نوٹ نکلیں گے۔

ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اردو اور فارسی کے تقریباً سبھی شعرا کو پڑھا تھا۔ غالب، اقبال اور حافظ کا کلام ازبر تھا۔ فارسی خوب جانتے تھے۔ اکثر گفتگو میں فارسی جملے بول جاتے پھر کہتے ”آپ نے میری بات سمجھی؟“ ظاہر ہے سننے والوں کو فارسی کہاں آتی ہوگی پھر جملے کا ترجمہ کرتے اور زبان سیکھنے کی تلقین کرتے۔

اکثر شعر گنگناتے رہتے۔ کبھی کوئی مصرع یاد نہ آتا، تو بے چین ہو جاتے۔ جب تک دوسرا یاد نہ آتا، بے قرار ہی رہتے۔ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتے۔ پھر لیٹ جاتے، پھر ٹہلنے لگتے۔ فرخ کہتی ”اباجی آپ کتاب میں دیکھ لیں۔“

مگر وہ نہ مانتے، کہتے ”مجھے بھول کیوں گیا، میں ایسے ہی یاد کروں گا۔“

ایک روز ہم ان کے ہاں مسلم ناؤں گئے، تو صحن میں ٹہل رہے تھے اور اپنے آپ میں اس قدر گم تھے کہ ہمیں بھی نہ دیکھانہ سلام کا جواب دیا۔ فرخ سے میں نے اس خود فراموشی کی وجہ پوچھی۔ بولیں ”ایک شعر کا دوسرا مصرع یاد نہیں آ رہا بہت پریشان ہیں۔“ میں جانتی تھی ایسے موقع پر ان کو ٹوکنا ناراضگی مول لینا تھا۔ پھر اندر آئے۔ چہرہ تہمتار ہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر حیران ہوئے کہ آپ لوگ کب آئے۔ فرخ سے کہنے لگے ”دیکھنا یاد آ گیا، میں پریشان اس لیے تھا کہ یہ مجھے بھول کیسے گیا۔ پھر انھوں نے

شعر سنایا جو آج بھی مجھے انہی کے حوالے سے یاد ہے۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا اس روز انھوں نے چائے کا بھی نہیں پوچھا، معذرت کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ فرخ بولی ”اب یہ لیٹ کر گھنٹا بھر یہی شعر گنگناتے رہیں گے۔“ میں سوچتی ہوں ان کی یہ دنیا کتنی پرسکون تھی۔ جب وہ الحان سے شعر پڑھتے، تو بہت لطف آتا۔ لفظوں کی ادائیگی یوں کرتے کہ ان میں جان پڑ جاتی۔ میں اکثر ان سے غالب کی کسی غزل کی فرمائش کرتی مجھے معلوم تھا غالب ان کو بہت پسند ہے موڈ ہوتا، تو کتنی غزلیں سنا دیتے۔

میری بہن اور بہنوئی جب کراچی سے لاہور منتقل ہوئے، تو ان کے ہاں آنا جانا اور بڑھ گیا۔ وہ اگر فارغ ہوتے، تو ماضی کے بہت سے قصے سناتے۔ ان کی جوانی کا زمانہ تشکیل پاکستان کا زمانہ تھا، اور یہ ایک پر جوش کارکن تھے۔ ان سے کئی ایسے واقعات سنے جو شاید کسی کتاب میں درج نہ ہوں۔ وہ شہر لاہور کے پرانے بھیدی تھے۔ جب تقسیم سے پہلے لاہور کی ہریالی، سڑکوں اور عمارتوں کے نقشے بیان کرتے، تو یوں لگتا کہ آج لاہور وہ لاہور نہیں جو خوبصورت تھا اور جس میں وضع دار لوگ آباد تھے۔ اب تو جیسی سفلی آبادی ہے ویسا ہی سفلا شہر ہو چکا۔

اباجی تحریک آزادی کے پر جوش کارکن تھے، مسلم لیگی اور قائد اعظم کے مداح۔ لیکن انگریزوں کی بھی خوب تعریفیں کرتے ”بھئی واہ کیا کہنا مسٹر جان کا“ اس وقت تو ہمیں اچھا نہ لگتا۔ لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ وہ انگریز قوم کے مجموعی کردار کے مداح تھے۔ اُن کے ڈسپلن، ایمانداری اور دوسری اخلاقی خوبیوں نے انھیں متاثر کیا کیونکہ ان کا اپنا مزاج بھی ویسا ہی تھا۔

بیوی کی موت کے بعد ان کی زندگی میں جو آخری المیہ وقوع پذیر ہوا اور وہ بھی آخری عمر میں..... وہ فرخ کی موت تھی۔ ان کی عادت تھی کہ وہ بیٹیوں کو بھی مذکر کے صیغے میں پکارتے اور اکثر



بھائی کا لفظ ساتھ لگا کر! فرخ ان کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ ماں کی موت کے بعد اُس نے غیر محسوس طریقے سے سب کی ذمہ داری اٹھالی اور گھر بھر کو سنبھالا۔ خود وہ اس وقت ایم اے کی طالبہ تھی۔ باقی بہن بھائی نچلے درجوں میں تھے۔ انھوں نے ہر ایک کو اس کی منزل تک پہنچنے میں مدد کی۔ یہ سارے فرائض ادا کرتے ہوئے ان کی اپنی شادی کی عمر نکل گئی، لیکن میں نے انھیں کبھی شاکی نہ پایا۔ وہ اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ سب بہن بھائی ادھر ادھر ہو گئے، اب یہ اباجی کے ساتھ تھیں اور ان کی دیکھ بھال کرتیں۔ اباجی ان کو بیٹا ہی سمجھتے ”بھئی فرخ بھائی، میری فلاں کتاب کہاں ہے۔“

”چلیے فرخ بھائی، فیصل آباد شوکت بھائی سے مل آئیں۔“
 ”فرخ بھائی! ہم جارہے ہیں، دروازہ بند کر لیں۔“
 کبھی ہم ان کے ہاں گئے اور وہ نہ ہوتیں، تو کہتے ”فرخ بھائی بازار گئے ہیں، ابھی آجائیں گے۔“

فرخ کے اچانک سر میں درد ہوا اور بے ہوش ہو گئیں۔ اسپتال لے کر گئے معلوم ہوا برین ہیمرج ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر تو یہی کہتے رہے کہ آپریشن سے ٹھیک ہو جائیں گی، لیکن وہ زندہ نہ رہیں۔ اباجی تو سناٹے میں رہ گئے۔ خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ میراجی چاہتا کہ ان سے بات کروں۔ نورین نے ان سے کہا کہ باجی آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں، تو بلا لیا۔ میں چپ چاپ قالین پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت نڈھال ہو رہے تھے۔ کرسی کی پشت پر سر ٹکا تھا اور آنکھیں بند۔ پھر بولے ”فرخ ہمیں چھوڑ گئے اچھا نہیں کیا“ ان کی آواز میں اس قدر درد تھا کہ بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے۔

”جانا تو مجھے تھا۔ باری سے جانا چاہیے، یہ کیا کہ آگے نکل جاؤ۔ اس نے کبھی میری بات نہ ٹالی۔ لیکن رکنے کی بات پر کان ہی نہیں دھرے۔“ پھر اوپر کی طرف انگلی اٹھا کر بولے ”اس کے سامنے دم مارنے کا یا را نہیں جیسی اس کی مرضی۔“ رفتہ رفتہ انھیں

صبر سا آ گیا۔ ایک روز میں نے نورین کو فون کیا، تو انھوں نے اٹھایا۔ میں نے حال پوچھا، تو بولے:

تاب لائے ہی بنے گی غالب

معاملہ سخت ہے اور جان عزیز

اب شعر و شاعری کی طرف توجہ کچھ زیادہ ہو گئی۔ یہ ان کی صحبت تھی کہ نورین جیسی کور ذوق کو بہت سے اشعار یاد ہو گئے۔ وہ اب بھی انھیں موقع بے موقع گفتگو میں استعمال کرتی رہتی ہے۔

فرخ کی موت کے بعد بیگ صاحب تین سال زندہ رہے۔ ان کے معمولات میں فرق نہیں آیا، لیکن پہلے والی بات نہ رہی۔ فرخ کو تو بعض اوقات وہ زچ کر دیتے تھے اور اس کا کہنا نہ مانتے۔ لیکن نورین کے ساتھ وہ رویہ نہ تھا۔ جو وہ کہتی فوراً مان جاتے۔ جس روز وہ کہیں ”اباجی آج جلد گھر آجائے گا۔ تو وقت مقررہ سے پہلے ہی لوٹ آتے۔ فرخ کی اتنی جرأت کہاں کہ ان پر کوئی حکم صادر کرتی۔

انھوں نے ساری زندگی مثبت رویے اپنائے۔ نورین کے شکر گزار رہتے کہ میرا خیال رکھتی اور خدمت کرتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے کہا ”اباجی کیا خدمت کرتی ہے؟ سارا کام نوکر کرتے ہیں۔“

بولے ”دیکھو سب سے بڑی بات یہ کہ میری عزت کرتی ہے۔ کہیں بھی جائے مجھے بتا کر جاتی ہے۔ میں گھر سے باہر جاؤں، تو میرا انتظار کرتی ہے۔ انور کو میرے کام کرنے سے نہیں روکتی۔ بچوں کے دل میں میری محبت ڈالی ہے۔ یہی خدمت ہوتی ہے..... اور خدمت کیا ہوگی۔“

ایک بار انور بھائی امریکا گئے ہوئے تھے۔ نورین کا فون آیا کہ اباجی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے، قے نہیں رک رہی۔ میں نے کہا ”بچوں کو میرے پاس چھوڑ کر انھیں اتفاق اسپتال لے جاؤ۔“

نورین بچوں کو چھوڑنے آئی۔ وہ ساتھ تھے۔ نڈھال سے

دلچسپ معلومات

جدید تجربات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ایٹم کا قطر 10^{-10} میٹر جبکہ مرکزے کا قطر 10^{-15} میٹر ہوتا ہے۔ مرکزے کے کس قدر چھوٹا ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ مثال یاد رکھیں کہ اگر ایٹم ایک بڑا چھت دار گنبد نما اسٹڈیم تصور کیا جائے، تو مرکزہ اس کے درمیان میں موجود مٹر والے دانے کے سائز کے برابر ہوگا۔

(امیر حمزہ بن مشتاق احمد، وار برٹن)

نورین نے گھبرا کر انور بھائی کو اطلاع دی۔ فیصل آباد شوکت اور خورشید کو بھی فون کر دیے۔ وہ آئے، تو ناراض ہونے لگے۔ ”یہ کیا سب اکٹھے ہونے لگے ہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔“ لیکن وہ ٹھیک نہیں تھے۔ بلڈ پریشر کم ہو رہا تھا۔ پھر ای سی جی خراب آنے لگی۔ آہستہ آہستہ جسم کے باقی حصوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ بس دماغ تھا جو ہر ابھرا رہا۔ آخری وقت تک باتیں کرتے رہے۔ ایک شام آنکھیں بند کیے لیٹے تھے جیسے کوئی طویل سفر کے بعد تھک کر لیٹا ہو۔

شوکت نے ان پر جھک کر آوازیں دیں ”ابا جی ابا جی!“ انھوں نے آنکھیں کھولیں، بولے ”شوکت بھائی! آپ کی والدہ آئی ہیں۔ کہتی ہیں چلو۔ ساری زندگی میں نے ان کی نہیں سنی، میرا خیال ہے اب مان ہی لی جائے۔“

یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے ہونٹ یوں مل رہے تھے جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں۔ پھر ہونٹ ساکت ہو گئے۔ وہ جا چکے تھے۔ دنیا کو اگر اچھی یادیں دے کر وداع ہوا جائے، تو اس سے اچھا اور کیا ہوگا؟

(ڈاکٹر نجمہ سہیل مشہور نقاد ڈاکٹر سہیل احمد خان کی اہلیہ تھیں۔ ۲۰۱۲ء میں ڈیٹنگی مرض کا نشانہ بن کر اچانک وفات پائی اور اپنے طلبہ و طالبات کو سوگوار چھوڑ گئیں)

ہو رہے تھے۔ بولے ”نورین خواہ مخواہ فکر مند ہو رہی ہے۔ میں نے دوائی لے لی ہے، ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”نورین نے مجھے اشارہ کیا کہ میں انھیں سمجھاؤں۔ میں نے کہا ”ابا جی ایک رات کی تو بات ہے۔ آپ اسپتال میں گزار لیں۔ بچے تو یہاں سو ہی جائیں گے۔ نورین تنہا ہے، اسپتال میں ڈاکٹر اور نرسیں ہوں گی، اس کی مدد ہو جائے گی۔“

بات فوراً ان کی سمجھ میں آگئی اور چلے گئے۔ صبح نورین کا فون آیا کہ کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ اب الٹراساؤنڈ وغیرہ ہوگا۔ وہ کافی پریشان تھی۔ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ آئی، تو معلوم ہوا کہ آنتوں میں بل پڑ گئے ہیں اسی وجہ سے غذا کو آگے جانے کا راستہ نہیں مل رہا اور تپ ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹروں نے انھیں ڈرپ لگا دی۔ دوسرے روز میں صبح اسپتال گئی کیونکہ نورین ساری رات جاگتی رہی تھی۔ اب ان کی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی۔ کہنے لگے ”دیکھو یہ ڈرپ لگا دی ہے، الٹیاں رک گئی ہیں، میں کہتا ہوں گھر چلیں۔“ میں نے مذاق کیا ”ابا جی گھر میں کون سے آپ کے

چھوٹے چھوٹے بچے رو رہے ہیں۔ یہاں آپ لیٹ کر آرام کریں۔“ مسکراتے ہوئے لگے۔ پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے اور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولے ”فرخ کی والدہ بڑی بھلی عورت تھی، فرشتہ صفت، اطاعت گزار۔“

نورین نے پوچھا ”وہ آج کیسے یاد آ گئیں؟“ لیکن وہ تو اپنے آپ میں گم تھے ”بھی شکوہ کیا نہ شکایت، نہ کوئی فرمائش نہ کوئی توقع۔“

میں نے کہا ”ابا جی پہلے زمانے کی عورتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔“ وہ چپ ہو گئے۔ چند لمحوں بعد نورین سے بولے ”گھر جائیں گی، تو میری کتاب، پرس اور عینک لیتی آئیں۔“

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس عمر میں آپریشن نہیں ہو سکتا۔ ان کی آنتوں کا مڑنا قدرتی امر ہے۔

چمچ کا راج

شگفتہ انداز میں ایک بظاہر معمولی شے
کے کمالات پڑھیں اور دنگ رہ جائیں

عائشہ ظاہر

بریانی پکا کر اور گھر والوں کی تنقید سمیٹ کر
ہم پرچم کی اہمیت روز روشن کی
طرح عیاں ہو گئی۔ ٹیلی

بد ذائقہ

ویژن پروگرام میں سکھائی گئی سندھی بریانی
کی ترکیب ہم نے اچھی طرح کاپی پر نقل کی
تھی۔ مگر آخر میں میزبان نے اجزائے
ترکیبی بناتے ہوئے اتنی تیز رفتاری سے
”کھانے کے چمچ“ اور ”چائے کے چمچ“ کی گردان کی کہ سب
کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ سمجھ ہی نہ آیا کہ مرچ چار کھانے کے چمچ ڈالنی

ہے یا گھی۔ ہلدی دو چائے کے چمچ ڈالنی ہے یا دھنیا۔
بس اسی کنفیوژن نے ہماری بریانی کا بیڑا غرق اور
ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہماری زندگی
میں چمچ کی کتنی اہمیت ہے۔

کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ
ہماری زندگی میں چمچ کتنا
ضروری ہے؟ ہمارا کوئی
جب ہم چمچ

دن ایسا نہیں گزرتا
استعمال نہ کریں۔ خواہ وہ

چائے کا چمچ ہو یا کھانا کھانے یا
کھانا پکانے کا۔ گویا کہا جاسکتا ہے
کہ اہمیت کے لحاظ سے ہوا اور پانی
کے بعد تیسرا نمبر چمچ ہی کا ہے۔ (محکمہ
تعلیم والے نصاب میں زندگی کی بنیادی
ضرورت میں چمچ کا بھی اضافہ کر لیں۔)

”چمچ کی تاریخ اتنی پرانی ہے جتنا کہ خود انسان۔“

یہ ہم نے گھسا پٹا ”ڈائلاگ“ لکھا ہے جو ہم ہمیشہ اپنے
ابلاغیات کے پرچے میں لکھتے تھے ”ابلاغ کی تاریخ اتنی پرانی
ہے جتنا کہ خود انسان۔“ ورنہ ہمارے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں
کہ چمچ کی تاریخ کتنی پرانی ہے۔ ہم اتنے پرانے نہیں بلکہ
دور جدید کی پیداوار ہیں۔ (تاریخ بیان کرنے کے چکر
میں کہیں لوگ ہماری اصل عمر کا اندازہ نہ کر لیں۔)

چمچ کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً اسٹیل، پلاسٹک، لکڑی
اور شیشے کا چمچ۔ پھر کھانا پکانے کا چمچ، چائے اور یخنی پینے کا
چمچ..... غرض اتنی اقسام ہیں کہ اگر ہم تفصیل سے بیان کرنے
لگیں تو مدیر صاحب کو آزادی نمبر، طب و صحت نمبر اور غذا ایات
نمبر کی طرح چمچ نمبر بھی شائع کرنا پڑ جائے۔ جتنی چمچ کی اقسام
ہیں اتنے ہی استعمال بھی!

چمچ ازدواجی جھگڑوں کا بھی باعث بنتا ہے۔ یقین نہیں



ہنجن فرینکلن کی راہنمابا تیں

☆..... ان لوگوں سے کبھی نہ بگاڑو جن کے ساتھ اکٹھا رہنا ہو۔

☆..... آگ کو پانی سے بجھایا جاسکتا ہے، چھتری سے دھوپ روکی جاسکتی ہے، مست ہاتھی کو آنکس سے قابو میں رکھا اور لکڑی سے دوسرے جانوروں پر اختیار حاصل کیا جاسکتا ہے، ہر بیماری کا علاج دواسے کیا جاسکتا ہے اور ہر گناہ کی تلافی کے لیے بھی کوئی نہ کوئی سبیل ہے مگر احمق کی حماقت کسی طرح دور نہیں کی جاسکتی۔

☆..... منہ سے غلط بات نکل جائے یا غلط رائے بیان کر دی جائے، تو تشریح کرتے وقت اس کی درستی کی جاسکتی ہے۔ مگر جو بات تحریر میں آجائے، اس کی درستی یا اس نے انکار ممکن نہیں رہتا۔

☆..... برے افعال مضر ہیں اس لیے منع ہیں نہ یہ کہ وہ ممنوع ہیں اس لیے مضر ہیں۔ لہذا خوشحال زندگی بسر کرنے کے لیے نیکی اور نیک نیتی سے کام لینا چاہیے۔ ☆..... مفلس کے لیے دولت مند بننے کا راز سچائی اور دیانت داری میں پوشیدہ ہے۔

پکارتی ہیں۔ مثلاً باپ کے گھر میں گھستے ہی جب بچے سارا دن کی روداد والد کو بیان کریں کہ آج امی خالہ سے فون پر غیبتیں کرنے میں ایسا مصروف ہوئیں کہ سارا دودھ ابل گیا، تو مائیں بچوں کو ”باپ کا چچہ“ کے لقب سے پکارتی ہیں۔ یا پھر دادی سے باتیں کرتی بچی نیکی کی گھریلو سیاست کے اہم راز فاش کر دے جن پر آپ برسوں سے جھوٹ بول بول کر پردہ ڈالتی آئی ہیں۔ مثلاً نانی اور ممانی کے تعلقات کس حد تک کشیدہ ہیں۔ نانی ممانی کو ”میسنی“ کہہ رہی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسے مواقع پر بھی خواتین بے بسی سے دل ہی دل میں کہتی ہیں ”بڑی آئی دادی کی چچی،

آتا، تو آج ہی سالن میں دو کے بجائے چار چچ نمک ڈال کر دیکھ لیجیے۔ چچ ہتھیار کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض جابر اور شکی قسم کی خواتین بے چارے شوہروں پر وار کرنے کے لیے چچ کا بے محابا استعمال کرتی ہیں۔

اکثر خواتین کو شکایت ہے، بعض گھریلو ملازمائیں موقع ملتے ہی چچ غائب کر دیتی ہیں جبکہ کانٹے جوں کے توں پڑے رہتے ہیں۔ دراصل ملازمائیں بخوبی جانتی ہیں، کانٹے کے بغیر تو گزارا ہو سکتا ہے، لیکن چچ کے بغیر نہیں۔

محاوروں میں بھی اکثر چچ کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً کسی بچے کی ولادت امیر کبیر گھرانے میں ہو، تو کہا جاتا ہے کہ فلاں منہ میں سونے کا چچ لے کر پیدا ہوا ہے۔

یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ آیا ہم بھی منہ میں سونے کا چچ لے کر پیدا ہوئے یا نہیں، مگر جب ہوش سنبھالا، تو منہ میں چچ ہی تھا۔ دیکھنے میں تو چاندی کا لگتا تھا، ہو سکتا ہے اسٹیل کا ہو۔ دراصل ہماری والدہ ماجدہ دلہا، کچھڑی یا اسی قسم کی کوئی چیز چچ بھر بھر کر زبردستی ہمارے منہ میں ٹھوستی رہیں اور ہم دونوں ہونٹ سخت سے بند کیے چمچوں کے وار سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتے۔ اس جدوجہد میں جو بقایا جات بچتے ہوئے ہماری ٹھوڑی پر آتے، اسی چچ سے واپس کا کام لیتے ہوئے انھیں واپس منہ میں ڈھکیل دیا جاتا۔ گویا ہوش سنبھالتے ہی چچ سے پالا پڑ گیا۔

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ یہ بات سچ ثابت کرنے کے لیے یہی عمل ہم اپنی اولاد کے ساتھ دہرا رہے ہیں۔ چچ دوائی پینے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ بیماری کے دنوں میں ہمارے بچے چچ سے سخت خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ جو نبی ہمارے ہاتھ میں چچ نظر آئے، چیخیں مارا زن چھو ہو جاتے ہیں مبادا کڑوی دوائیاں پینی پڑ جائیں، لیکن ہم بھی پاکستانی فلم کے ولن کی طرح چہرے پر جارحانہ تاثرات لیے ان کا پیچھا شروع کرتے ہیں۔ جیت آخر کار..... چچ کی ہوتی ہے۔ بعض ناخوشگوار مواقع پر خواتین اپنے بچوں کو بھی چچہ کہہ کر



فیثا غورث نے کہا

☆..... وہی کام کرو جو کرنا چاہیے نہ وہ کام جو تم کرنا چاہو۔

☆..... تیری غلط تعریف کرنے والے سے وہ شخص اچھا ہے جو تجھے تیرے عیبوں سے آگاہ کرے۔

☆..... تدبیر کے ساتھ تقدیر کا ساتھ کم ہوتا ہے۔

☆..... عمدہ چیزوں میں سب سے بہترین خن ہے۔ اگر خود میں اس کی قدرت نہ ہو، تو دوسروں سے سننا چاہیے۔

☆..... انسان برسوں میں جوان ہوتا ہے، لیکن اگر وہ اپنے وقت کو بہترین طریقے پر صرف کرے، تو دنوں میں بوڑھا یعنی تجربہ کار ہو جاتا ہے۔

☆..... اللہ تعالیٰ رزاق جبکہ بندہ قزاق ہے۔

☆..... اللہ تعالیٰ کے نزدیک افعال معتبر ہیں نہ کہ اقوال۔

☆..... دوسروں کی کوتاہیوں کو بھلا دو، مگر اپنی کوتاہیوں کو کبھی فراموش نہ کرو۔

کسی سیاسی جماعت سے اگر یہ چیچ نکال دیے جائیں، تو اس کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ گویا چیچ کی اہمیت گھریلو نہیں بلکہ قومی سطح پر بھی ہے۔

ہمارا مشورہ ہے کہ سیاسی ٹاک شوز میں بھی میز پر چیچ رکھنے چاہئیں تاکہ سیاست دان اشتعال میں آ کر ایک دوسرے پر گلاس پھینکنے کے بجائے چیچوں سے تلوار بازی کے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی مغلیہ فلم کا منظر پیش کریں۔

گویا جس طرح چیچ کے بغیر گھریلو امور کی انجام دہی بے حد مشکل ہے۔ اسی طرح سیاسی چیچوں کے بغیر ملکی امور چلانے ناممکن ہیں۔ سیاست چاہے گھریلو ہو یا ملکی، چیچے کے بغیر اس میں سنسنی ہی نہیں آتی۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

مجال ہے جو اندہ اسے اپنے ساتھ میسلے لے کر جاؤں۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں چیچ کی اہمیت بے پناہ بڑھ جاتی ہے۔ جو نہی کھانا لگنے کا اعلان ہو، لوگ پلیٹوں اور چمچوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ہم جیسے شرمیلے لوگ ہاتھ میں پلیٹ اور چیچ پکڑے اس خوش نصیب کو مسرت سے دیکھتے ہیں جس کے ہاتھ میں قورمہ یا بریانی کی ڈش کا چیچ ہو۔ وہ اپنی من پسند بوٹیاں چیچ سے چھانٹ چھانٹ کر پلیٹ میں منتقل کرتا ہے۔ ارد گرد کھڑے چیچ کے منتظر لوگوں کی نگاہیں ڈش سے اس خوش نصیب کی پلیٹ تک طواف کرتی رہتی ہیں۔ جو نہی وہ چیچ رکھے، کئی ہاتھ اس کی جانب لپکتے ہیں۔ پھر جس خوش نصیب کے ہاتھ چیچ آئے، وہ وہی عمل دہراتا ہے اور باقی لوگ حسرت سے اسے تکتے ہیں۔

چیچ کی اہمیت کے پیش نظر سیاست دان بھی اپنے ساتھ چیچے ضرور رکھتے ہیں..... ارے باورچی خانے والے نہیں بلکہ وہ لوگ جو اکثر ٹیلی ویژن اسکرین پر سیاست دانوں کے دائیں بائیں کھڑے نظر آتے ہیں۔ انھیں سیاست دانوں کے چیچے ہی سمجھیے۔ جس طرح گھر میں چیچ کی اہمیت مسلمہ ہے، اسی طرح یہ سیاسی چیچے بھی بہت اہم اور ضروری ہیں۔ ان کے بغیر سیاست دان بالکل ادھورے ہوتے ہیں۔ انہی کے دم سے سیاست کے کاروبار میں رونق ہے۔ ٹیلی ویژن پر آدھی سے زیادہ خبریں ان چیچوں کی ایک دوسرے کے خلاف گرم گرم بیان بازیوں پر ہوتی ہیں۔ اگر ان چیچوں کی بیان بازیاں نکال دی جائیں، تو خبرنامے میں صرف موسم کی خبریں اور اشتہارات ہی باقی بچیں۔ کسی ایک سیاست دان نے غیر ملکی دورے پر جانا ہو، تو کئی سو چیچے اس کے ساتھ جاتے ہیں بلکہ یوں کہنا بہتر ہے کہ پورا کٹلری سیٹ ساتھ جاتا ہے۔

گزشتہ سال دھرنے کے دوران انہی چیچوں نے اپنے بیانات سے سنسنی پھیلا کر عوام کو ٹیلی ویژن اسکرین سے چپکائے رکھا بلکہ رقص کے ذریعے عوام کو خاصا محفوظ بھی کیا۔

زندگی کی سب سے قیمتی بات
اچھی کتاب
زیادہ کچھ اور نہیں

آئیے.....! کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریے

کتابوں کی کہکشاں

سید عاصم محمود

نوجوان لڑکے لڑکیوں کی صحیح راہنمائی نہ کی جائے، تو وہ بھٹک کر آسانی سے شیطانوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ بلوغت جسے بچپن اور جوانی کا دورا کہا جاتا ہے، انسانی زندگی کا ایک اہم موڑ ہے۔ یہ دور شروع ہوتے ہی انسانی بدن میں اچانک تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جسمانی خدو خال اور آواز کا بدلنا۔ ساتھ ساتھ نوجوان نفسیاتی، جذباتی اور تصوراتی پہلو کے ذریعے اپنی شخصیت میں پرزور اثر آفرینی حاصل کرتا ہے۔ اس جذباتی باپل کے دور میں نئے دروازے کھلتے اور انسانی نفسیات کو وسعت دیتے ہیں۔ اسی لیے بلوغت کا دور انسانی زندگی کا ایک خوبصورت مگر خطرناک موڑ بھی ہے۔ اگر بے قابو جذبات اور امنگوں کو لگام نہ دی جائے، تو نوجوان بھٹک جاتے ہیں۔ عقلی انداز میں تعلیم و تربیت نہ دی جائے تو صحیح راستہ بھول جاتے ہیں۔ یوں انسانی روح تباہ ہو جاتی ہے۔ کتاب میں ”بچپن، لڑکپن اور بھولپن“ میں بلوغت کے دوران ہونے والی مختلف تبدیلیوں کے بارے میں تمام ضروری

نام کتاب: بچپن، لڑکپن اور بھولپن، مصنف: ڈاکٹر آصف محمود جاہ، ناشر: علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار، لاہور۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

تصور میں بچے بچوں کے ساتھ زندگی کا جو کھیل کھیلا گیا اس کے تناظر میں ڈاکٹر آصف محمود جاہ کی نئی کتاب ”بچپن، لڑکپن اور بھولپن“ کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ اس میں نوجوانی کے مسائل، الجھنیں اور ان کے حل پر بحث کی گئی ہے۔ بلوغت کے آغاز میں



شہلی کالج کی مدرسے کے دوران ہی بذریعہ خط کتابت قرآنی تعلیمات سکھانے والے مشہور ”تعلیم القرآن کورس“ شروع کیے۔ ان کورسوں کی تعداد پانچ ہے۔ ہر کورس دس اسباق پر مشتمل ہے۔ ان کورسوں کو عوام و خواص میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ نیز ان کے باعث ہزار راہ گم کردہ جادہ حق پر گامزن ہو گئے۔

۲۰۱۱ء میں حافظ صاحب بھری پری زندگی گزار کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب مرحوم کے قائم کردہ ادارے نے ان کی مثالی سوانح حیات شائع کی ہے۔ اس میں ان کی آپ بیتی شامل ہے اور مرحوم کی شخصیت و کارناموں پر لکھی تحریریں بھی! یہ ایسی ہستی کی شخصیت و کارنامے واضح کرتی ہیں جو ہماری زندگی نیکی و فلاح کے کاموں میں مشغول رہے۔ آپ بیتیاں پڑھنے والے اسے پسندیدہ کتاب پائیں گے۔ طباعت و پیش کش معیاری ہے۔

نام کتاب:

Reflections on the Socio-Political Economy

مصنفین: ارشد احمد بیگ، خرم خان۔ ناشر: رفاه سینٹر آف اسلامک بزنس، رفاه انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد۔ قیمت: درج نہیں۔

دو سو سال پہلے دنیا میں سرمایہ داری نے جنم لیا۔ اس کے



معلومات دی گئی ہیں۔ ہر م کے مسائل پر قابو پانے کے لیے قابل عمل اور آسان تجاویز بھی درج ہیں۔ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں نو بالغ لڑکیوں میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے ساتھ پیدا ہونے والے مسائل اور ان کے حل کی آسان تدابیر بیان کی گئی ہیں۔ دوسرا حصہ نو بالغ لڑکوں کے بارے میں ہے۔ تیسرے حصے میں ٹین ایج بچوں کو کامیاب زندگی گزارنے کے گر بتائے گئے ہیں۔ چوتھے حصے میں بیماریوں کے متعلق ضروری معلومات دی گئی ہیں۔ پانچواں حصہ ہیلتھ گائیڈ ہے جس میں نو جوان ہوتے بچے بچیوں کو صحت بہتر بنانے کے لیے قابل عمل تجاویز بتائی گئی ہیں۔

نام کتاب: سرگزشت ایام، حافظ نذر احمد۔ ترتیب و تدوین: سنیر اختر۔ ناشر: مسلم اکادمی، ۱۸/۲۹، محمد نگر، لاہور۔ فون نمبر: ۳۶۲۹۳۲۲۳۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔



حافظ نذر احمد کا شمار ان علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی قرآن پاک کی تعلیمات بھیلانے کے لیے وقف کیے رکھی۔ آپ ۱۹۱۹ء میں ہندوستان کے قصبے، نگینہ (بجنور) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں نقل مکانی کر کے لاہور آ گئے اور بقیہ زندگی وہیں گزاری۔ ۲۰۱۱ء میں وفات پائی۔

حافظ صاحب خطیب رہے۔ درس قرآن بھی دیا۔ ۱۹۳۸ء میں شہلی کالج کی بنیاد رکھی جو ۱۹۹۵ء تک کام کرتا رہا۔ اس تعلیمی ادارے سے ہزار باطلہ نے استفادہ کیا۔ حافظ صاحب بھی کالج

اردو ڈائجسٹ 211

اکتوبر 2015ء

جواب میں سو سرم اور میوزم کے معاشی نظام سامنے آئے۔
فی الوقت دنیا کے بیشتر ممالک نے بطور معاشی نظام سرمایہ داری
کو اپنا رکھا ہے۔ مگر سرمایہ داری کئی خامیاں رکھتی ہے جنہیں اسے
اپنانے والے نے بھی تسلیم کر چکے۔

دین اسلام نے بھی ایک جامع و معتدل معاشی نظام پیش
کیا ہے جسے بعض اسلامی ممالک کامیابی سے اپنائے ہوئے ہیں
جن میں ایران، سعودی عرب، پاکستان، متحدہ عرب امارات
وغیرہ شامل ہیں۔ اسلامی معاشی نظام کی سب سے بڑی
خصوصیت یہ ہے کہ یہ ارتکاز دولت روکتا ہے اور امیر و غریب
کے مابین خلیج وسیع نہیں ہونے دیتا۔

اب رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی سے وابستہ دو محققوں نے اپنی
انگریزی کتاب میں اسلامی معاشی نظام کو نہایت شرح و بسط سے
بیان کیا ہے۔ یہ کتاب غیر ملکوں کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ وہ
اسلامی معاشی نظام کی خصوصیات بخوبی سمجھ سکیں۔ مگر اس نہایت
مفید کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہونا چاہیے تاکہ عام پاکستانی بھی
اسلامی معاشی نظام کی افادیت جان سکیں۔ کتاب بڑے
خوبصورت انداز میں شائع ہوئی ہے۔ اسلامی معیشت کی
باریکیاں سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ضرور کیجیے۔

نام کتاب: المدینہ۔ مصنف: فقیر اللہ
خان۔ ناشر: مکتبہ اسلامیہ، بادیہ حلیمہ
سینٹر، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون ۰۳۲۳۷۲۳۹۷۳۔ قیمت درج نہیں۔



مدینہ منورہ وہ عظیم شہر ہے جہاں ہی کریم سلی اللہ علیہ وسلم
نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور وہیں آپ کا روضہ مبارک ہے۔ اسی
شہر کو دنیا کی پہلی اسلامی ریاست بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس
شہر نبی میں چپے چپے پر اسلامی آثار بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں
اکثر کا تعارف زیر تبصرہ کتاب میں شامل ہے۔

فقیر اللہ خان طویل عرصہ بہ حیثیت اکاؤنٹس افسر پی آئی
سے وابستہ رہے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتے تھے۔ چنانچہ
۲۰۰۹ء میں ریٹائرڈ ہوئے، تو معلوماتی مضامین لکھنے لگے۔ آپ
کی پہلی تحریر اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوئی۔ اب تک دو سفر نامے
”امریکا جیسے میں نے دیکھا“ اور ”سیر جہاں“ شائع ہو چکے۔ یہ
آپ کی تیسری کتاب ہے۔

شہر مدینہ کی معلومات دینے کے علاوہ کتاب میں اصحاب
رسول کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ مصنف ایک تجربے کار گائیڈ کی
طرح مدینہ منورہ کی سیر کراتے نظر آتے ہیں۔ کتاب کی پیش کش
عمدہ ہے اور کاغذ بھی معیاری۔ اسے اپنی لائبریری کی زینت
ضرور بنائیے۔ (تبصرہ نگار: محمد اسلم لودھی)

نام کتاب: مکاتیب زنداں۔ مصنف:
حکیم محمد شریف امرتسری۔ ناشر: الحمد
پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور،
چوک پرانی انارکلی، لاہور۔ فون: ۳۷۲۳۱۲۹۰



تقسیم ہند کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ لاہور چلے آئے
تھے۔ آپ نے پھر حکومت سے مطالبہ کیا کہ اسلامی قوانین کی

روشنی میں آئین تیار کیا جائے۔ جب یہ مطالبہ زور پکڑ گیا، تو حکومت وقت نے آپ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ یہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ جلد ہی ان کے رفقاء، مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد بھی گرفتار کر لیے گئے۔

تینوں اصحاب پھر انیس ماہ تک اسیر رہے۔ اس عرصے میں وہ اہل و عیال اور دوست احباب سے خط کتابت کرتے رہے۔ یہ مرکاتب بعد ازاں حافظ آباد کے حکیم محمد شریف امرتسری نے کتابی صورت میں شائع کر دیے۔ یہ خطوط اپنے وقت کے تین بڑے علما کے خیالات، احساسات اور واقعاتِ عمرگی سے سامنے لاتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں کراچی سے طبع ہوئی تھی۔ پھر ۱۹۸۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اب اس کا تیسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کتاب کی پیش کش معیاری ہے، قائدینِ اسلامی تحریک کے افکار سے شناسائی کی خاطر اس کا مطالعہ مفید ہے۔

نام کتاب: کلام میر انیس۔ ترتیب: سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ ناشر: بک کارنر، بک، سٹریٹ، جہلم۔ فون: ۲۱۲۹۷۷۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔



خدائے سخن، میر بر علی انیس ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۴ء میں وفات پائی۔ آپ کے اجداد ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ ساری عمر لکھنؤ میں گزری۔ مرثیے اور رباعی کے شاعر تھے۔ آپ کے کلام میں اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کے

اردو ڈائجسٹ 213

الفاظ ملتے ہیں، اسی لیے شاعری کو قدرت عطا ہوئی۔ سلاست، روانی، شگفتگی اور فصاحت میر انیس کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں انیس کے سات مرثیے، پندرہ سلام اور رباعیاں شامل ہیں۔ مشہور اردو نقاد، ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب نے بڑی محنت سے ان کا انتخاب کیا اور کلام میں سے نقائص بھی دور کیے۔

کتاب میں شامل مرثی اور سلام انیس کے فن کی بہترین اور عمدہ مثالیں ہیں۔ مرثیے کا مطالعہ کرنے والے شائقین اسے پسند کریں گے۔ اس کی پیش کش معیاری ہے۔

نام کتاب: پہل اس نے کی تھی۔ مصنف: جبار مرزا۔ ناشر: شہریار پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۱۶۹۳، جی پی او، اسلام آباد۔ قیمت ۹۰۰ روپے۔



یہ ناکام محبت پر مبنی ایک سوانحی داستان ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ مصنفین عموماً اپنی محبتوں کے بارے میں بہت کم لکھتے ہیں۔ مگر مصنف نے اپنے ناکام عشق پر تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل کتاب لکھ ڈالی ہے۔ یہ ایسے دودلوں کی کہانی ہے جو ظالم سماج کے باعث ایک نہ ہو سکے۔ داستان میں محبوبہ کے والد ظالم سماج کے نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جبار مرزا معروف قلم کار ہیں۔ اخبار میں کالم لکھتے اور شاعری بھی کرتے ہیں۔ اس سوانحی رومانی ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی داستان محبت بہت

اکتوبر 2015ء

کالج میں ریاضی کے اسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ پوٹھوہاری ہونے کے باعث انھوں نے اپنی کتاب میں ٹھوس معلومات دی ہیں۔ کتاب کی پیش کش عمدہ ہے اور ناشر نے اسے خوبصورتی سے شائع کیا ہے۔ خطہ پوٹھوہار کی تاریخ و تہذیب سے شناسائی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

نام کتاب: گدگدی۔ مصنف: مرزا عاصی اختر۔ ناشر: بزم مزاح، پوسٹ بکس نمبر ۴۹۲، کراچی جی پی او۔ ۷۴۲۰۰۔ فون نمبر: ۰۳۰۰۔ ۷۰۲۹۵۱۵۔ قیمت: ۱۶۰ روپے۔



معاشرے کی خرابیاں اور برائیاں نمایاں کرنے کا ایک خصوصی ہتھیار مزاحیہ شاعری بھی ہے۔ اس ہتھیار سے لیس شاعر طنز و مزاح کے روپ میں معاشرتی برائیاں ایسے انوکھے انداز میں اجاگر کرتا ہے کہ ہنسی آتی ہے اور (خصوصاً حساس شخص کو) رونا بھی۔ مرزا عاصی اختر بھی یہی ہتھیار رکھتے اور اس کا خوب استعمال کرتے ہیں۔

میرپور خاص جیسے دور دراز شہر کا مکیں ہونے کے باوجود مرزا صاحب بہت وسعت نظر رکھتے اور مزاحیہ شاعری میں نئے مضامین سامنے لاتے ہیں۔ ان کی شاعری پچھلے کئی سال سے اردو ڈائجسٹ سمیت معروف پاکستانی رسائل کی زینت بن رہی ہے۔ ایک مجموعہ کلام ”شرارت“ چھپ چکا، اب یہ دوسرا طبع ہوا ہے۔ مرزا صاحب کے کلام کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں:

تفصیل سے لکھی ہے، مگر یہ پتا نہیں چلتا کہ چودھرائی (محبوبہ) کون ہے، کہاں رہتی ہے اور اب کس حال میں ہے۔ غرض ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے الفاظ میں ”مرزا صاحب کے ایثار کا یہ خوبصورت انداز ہے کہ خود کو تو توپ کے دبائے پر باندھ لیا، محبوب کو چھپا گئے۔“

کتاب سفید کاغذ پر عمدہ انداز میں شائع ہوئی ہے۔ بچے اور ”شدھ دیسی“ رومان پڑھنے والے قارئین اسے دلچسپ تخلیق پائیں گے۔

نام کتاب: پوٹھوہار نامہ۔ مصنف: پروفیسر راجا حافظ امجد منہاس۔ ناشر: رمیل سانوس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، راولپنڈی۔ فون نمبر: ۰۵۱۔ ۵۵۵۱۵۱۹۔



شمالی پاکستان میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار مربع میل پر پھیلا علاقہ ”خطہ پوٹھوہار“ کہلاتا ہے۔ مشرق میں اس کی سرحدیں دریائے جہلم، مغرب میں دریائے سندھ، شمال میں سلسلہ ہائے کوہ کالا چٹا اور جنوب میں کوہ نمک کے سلسلے سے ملتی ہیں۔ اس خطے میں تقریباً ساڑھے سات لاکھ افراد بستے ہیں۔

یہ وسیع علاقہ اپنی تاریخ، تہذیب و ثقافت، لوک روایات، سیاحتی مقامات، مشہور شخصیات، ادب اور قبائل رکھتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں انہی موضوعات کو معلومات افروز اور دلچسپ انداز میں شامل کیا گیا ہے۔ صاحب کتاب اسلام آباد کے ایک سرکاری

ہر کام میں ہوں طاق ، مجھے کیا نہیں آتا
بیلن سے مگر بچنے کا حربہ نہیں آتا
☆☆

وہ تو تار کو دکھا تیلی ، رفو چکر ہوا
اور پولیس والا ہمیں عاصی پکڑ کر لے چلا
☆☆

بھوت جیسی تھی وہ صورت عاصی
دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
کتاب کی طباعت عمدہ ہے۔ اپنے وقت کو خوشگوار بنانے
کے لیے ”گدگدی“ کا مطالعہ کیجیے، آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ
ضرور پھیل جائے گی۔

نام کتاب: گلزار، آواز میں لپٹی خاموشی۔
مصنف: گل شیربٹ۔ ناشر: بک کارنر،
بک، سٹریٹ، جہلم۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔



بھارت کے اردو لکھاری سپورن گلزار ایک
منفرد تخلیق کار ہیں اور اپنی تہذیب و روایات سے جڑی ایک
منفرد ہستی بھی! ۲۰۰۸ء میں انھیں فلم ”سلم ڈاگ ملیئیر“ کے
ایک گیت پر فلمی دنیا کا معزز ترین اکیڈمی ایوارڈ ملا۔ مگر وہ
اسے لینے نیویارک نہیں گئے۔ وجہ یہ کہ تقریب میں سوٹ پہننا
شرط تھا۔ جبکہ گلزار کرتے قمیص ہی میں یہ ایوارڈ لینا چاہتے
تھے۔ انھوں نے تقریب میں شرکت نہ کرنا قبول کر لیا، مگر اپنے
روایتی لباس کو ترک نہیں کیا۔ یہ واقعہ خاص طور پر ہمارے

حیات مبارکہ اور سنہرے اصول زندگی

۱۔ رسول اللہ (ایک دن) کھجور کی چٹائی پر سوئے۔ جب
سو کے اٹھے، تو جسم مبارک میں چٹائی کی بناوٹ کے نشان
پڑے ہوئے تھے (یہ حالت دیکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر)
خادم ابن مسعود نے عرض کیا (حدیث کے راوی) کہ اگر
حضور ﷺ فرمائیں، تو ہم حضرت محمدؐ کے لیے بستر کا انتظام
کریں اور کچھ بتائیں (یعنی آپ سے اس کی اجازت
چاہی)۔ آپ نے ارشاد فرمایا، مجھے دنیا سے (یعنی دنیا کے
ساز و سامان اور اس کی راحتوں اور لذتوں سے) کیا تعلق اور کیا
لینا؟ میرا تعلق دنیا کے ساتھ بس ایسا ہے جیسے کوئی مسافر کچھ دیر
سایہ لینے کے لیے کسی درخت کے نیچے ٹھہرا اور پھر اسے اپنی
جگہ چھوڑ کر منزل کی طرف چل دیا۔

(مسند احمد، ترمذی)

۲۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اس متقی
دولت مند بندے سے جو (تقویٰ اور دولت مندی کے
باوجود) نامعروف اور چھپا ہوا ہو۔ (دولت مند اور صاحب
ثروت ہونے کے ساتھ تقویٰ میں بھی اس بندہ خدا کا خاص
مقام ہے۔ جس بندے میں یہ تین چیزیں جمع ہوں اس پر اللہ
تعالیٰ کا خاص فضل ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام
حاصل ہے۔) (انتخاب: ذیشان زمان، لاہور)

حکمرانوں کے لیے ایک سبق ہے جو سوٹ بوٹ پہننے اور
انگریزی بولنے کو عار نہیں سمجھتے۔

زیر تبصرہ کتاب گلزار صاحب کی شخصیت و فن کے پوشیدہ و
عمیاں گوشے سامنے لاتی ہے۔ صاحب کتاب زمانہ طالب علمی
میں گلزار صاحب سے متاثر ہوئے اور اب تک اپنے ممدوح کی
شخصیت میں تین کتابیں لکھ چکے۔ یہ کتاب گلزار صاحب سے
عقیدت رکھنے والوں کے لیے گواہ بنایاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

بک کارنر والوں نے اپنی روایات کے مطابق بڑے دیدہ
زیب اور پُرکشش انداز میں اسے شائع کیا ہے۔ اس کا مطالعہ
آپ کو گلزار صاحب کی شخصیت و کارناموں کی نئی جہتوں سے
آشنا کرائے گا۔

چنیوٹ کی گلزار منزل

زمین بوس ہوتی یہ عمارت اب سرکاری افسروں کی مساعی جمیلہ سے علم و ادب کا مرکز بن چکی ہے

مشتاق احمد ورک

کو اندر سے دکھایا۔ وہاں پر موجود ایک بزرگ نے گلزار محل یا منزل کی تاریخ بتائی جو یوں ہے:

گلزار منزل کو چنیوٹ کے ایک تاجر، عمر حیات نے چار لاکھ روپے کی لاگت سے بنوایا۔ یہ عمارت اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے تعمیر کرائی تھی۔ یہ پانچ منزلہ عمارت ۱۹۳۰ء میں مکمل ہوئی۔ روپے کی قدر کا اندازہ لگایا جائے، تو اس زمانے کے چار لاکھ آج کے چالیس کروڑ روپے جتنے ہو سکتے ہیں۔

جب عمارت مکمل ہوئی، تو اسے بنوانے والا عمر حیات اسی سال جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ مرحوم تاجر کے اکلوتے بیٹے، گلزار نے کلکتہ میں اپنا

کاروبار سمیٹا اور چنیوٹ میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا۔ گلزار نے ۱۹۳۷ء میں اسی محل میں اپنی شادی نہایت دھوم دھام سے رچائی، لیکن شادی سے اگلے روز ہی گلزار منزل میں اس کی پراسرار حالت میں موت واقع ہو گئی۔ موت کی وجہ تاحال معلوم نہیں ہو سکی۔ برصغیر پاک و ہند میں لوگ کسی عمارت یا گھر کو منحوس تصور کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ عمر حیات اور

چنیوٹ کی سیر کے دوران باقی چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک عجوبہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا پرانا نام گلزار منزل جبکہ موجودہ نام عمر حیات لائبریری ہے۔ گلزار منزل کو اندر سے دیکھ لو اس کی تاریخ جان کر اللہ کی کبریائی یاد آتی ہے۔ باہر سے ایسے لگا کہ اندر جانا ممنوع ہے۔ لیکن جب ہم نے ہمت کی تو

لائبریری کے انچارج نے خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ اس نے پھر خوبصورت عمارت

گلزار محمد کی وفات کے بعد ان کے اعزاء و اقربا نے بھی گلزار محل کو منحوس سمجھا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے کنارہ کش ہو گئے۔

مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے مقامی رہائشی طرز تعمیر کا یہ شاہکار شکست و ریخت کی نذر ہو گیا۔ پھر یہ نایاب ورثہ رفتہ رفتہ قبضہ مافیا کے ہتھے چڑھ گیا۔ ایک وقت آیا کہ اس کا سارا حسن ماند پڑ گیا۔ جب اس کی بلند ترین منزل منہدم ہوئی، تو خدشہ پیدا ہوا کہ بہت جلد یہ خوبصورت عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ یوں اہل چنیوٹ اس عظیم تاریخی ورثے سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس عمارت کی حفاظت کا خیال رکھنے کی خاطر قدرت نے ایک ذمے دار انتظامی افسر کی تقرری ضلع جھنگ میں کروادی۔

اس زمانے میں اطہر طاہر ڈپٹی کمشنر جھنگ تھے۔ انھوں نے گلزار منزل کو سرکاری تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس

تاریخی عمارت کو لائبریری اور علمی و تحقیقی مرکز میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جامع منصوبہ بندی کی گئی۔ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اسے تب کے اسسٹنٹ کمشنر چنیوٹ، جناب امجد ثاقب کے سپرد کر دیا گیا۔ امجد ثاقب بھی علم سے محبت کرنے والے مثبت سوچ کے افسر تھے۔ انھوں نے جون ۱۹۹۰ء میں اس منصوبہ پر عمل کا آغاز کر دیا۔ اگست کی چودہ تاریخ یعنی قیام پاکستان کی سالگرہ کے دن ڈی سی جھنگ، اطہر طاہر نے اس عظیم منصوبے کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ یہ عمارت اب عمر حیات لائبریری کے نام سے موسوم ہے۔

اس عمارت کی تاریخ میں ہم سب کے لیے یہ درس عبرت پوشیدہ ہے کہ امیر فقیر، سب نے بھی کچھ چھوڑ چھاڑ رب ذوالجلال کے پاس چلے جانا ہے۔ یہ بنگلے اور کوٹھیاں یہیں رہ جائیں گے۔ اگلے جہان صرف نیک اعمال ہی کام آئیں گے۔

”مخیر“ ٹھگ

دنیا میں دھوکا دینے والوں کی کمی نہیں۔ کس خوبصورتی سے دھوکا دیا جاتا ہے، اس کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایسے بیسیوں واقعات ہوئے جن میں ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی گئی اور ہم اس کے شکار بھی ہوئے۔ یہ ۱۹۹۱ء کی بات ہے۔ میں ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ ہوٹل کے رسپشنسٹ نے مجھے نئی فون کیا کہ ایک مخیر آپ کی تنظیم کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ میں اور میرے احباب ان سے ملنے گئے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ایک ادارہ لاہور میں کچھ سامان بیرون ملک سے منگوا رہا ہے اور آپ کی تنظیم کو دینا چاہتا ہے۔ آپ کچھ کارکنوں کو میرے ساتھ لاہور بھیج دیں۔ کچھ ادائیگی بھی کرنا ہوگی کیونکہ سامان باہر سے آنا ہے اور یہ کام بہت جلدی کرنا ہے۔ میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ کام ہماری فلاحی تنظیم کے فائدے میں ہے، اپنی جیب سے ۲ ہزار روپے نکال اپنے کارکنوں کو تھما دیے اور ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ انھوں نے ٹیکسی کرائے پر لی جس میں وہ صاحب بھی ساتھ بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ چنیوٹ جا کر اس نے کہا کہ میری اپنی گاڑی یہاں موجود ہے، آؤ اس میں بیٹھ جاتے ہیں۔ میرے کارکنان اتنے سادہ لوح تھے اور ممنونیت کے احساس سے زیر بار تھے کہ انھوں نے اس کی بات مان لی۔ لاہور ہوئی اڈے پر اس نے کہا کہ مجھے رقم دے دیں، میں ادائیگی کر کے سامان حاصل کر لوں گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ خرچہ کتنا ہے۔ انھوں نے ساری رقم اسے تھما دی اور پھر وہ واپس نہیں لوٹا۔ اُسے ہر جگہ تلاش کیا گیا، ہوٹل کی انتظامیہ سے بھی رابطہ کیا، لیکن کچھ پتا نہیں چل سکا۔ یہ ڈراما اتنی خوبصورتی سے رچایا گیا کہ میں اور میرے ساتھی گمان بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ شخص فراڈیا ہو سکتا ہے۔

(ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد اقبال کی آپ بیتی ”پردہ سیمیں“ سے انتخاب)

معدنیات کا خزانہ

سمندری نمک

یہ قدرتی معدن کھانے کو لذیذ ہی نہیں
بناتا بلکہ کئی بیماریوں کا علاج بھی ہے

ڈاکٹر خورشید انور

حوالے سے کی جاتی ہے۔ یعنی اسے نمک حرام یا نمک حلال
کے القابات سے نوازا جاتا ہے۔ گویا کوڑیوں کے مول بکنے
والا نمک ہماری زندگی میں خاص اثر رکھتا ہے۔

ہماری زندگی میں نمکیات کی اہمیت اور استعمال اتنا زیادہ
ہے کہ موضوع کسی ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں، اس لیے
آج ہم آپ کو صرف سمندری نمک (Sea Salt) کے
بارے میں قدرے تفصیل سے بتائیں گے۔

سمندر کا پانی خشک کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔
سمندری نمک مختلف رنگوں میں دستیاب ہے۔ یہ رنگ سمندر

ہمارے دادا مرحوم خود کو نیم حکیم کہا کرتے، کیونکہ انھوں
نے باقاعدہ طب کی تعلیم نہیں پائی تھی مگر وہ جڑی بوٹیوں اور
نمکیات کے بارے میں گہرا علم رکھتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں
کو نسخہ جات بنا کر دیتے اور ہمیں ان کی افادیت کے بارے
میں بتایا کرتے۔ بچپن میں تو ہم نے ان کی باتوں کو درخور اعتنا
نہیں سمجھا مگر بڑے ہو کر طب کی دنیا میں قدم رکھا، تو نمکیات
کی اہمیت واضح ہوئی۔

ہم جانتے ہیں کہ کھانے میں نمک نہ ہو تو کھایا نہیں
جاتا۔ نمک کی زیادتی بھی برداشت نہیں ہوئی۔ ہمارے اجسام
سے نکلنے والی تمام رطوبات مثلاً پسینا، آنسو، بول و براز وغیرہ
نمکیات سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ہماری رگوں میں دوڑنے
والا خون بھی نمکین ہی ہوتا ہے۔ اور تو اور دوست احباب اور
اپنے ملازمین کی وفاداری کی جانچ پڑتال بھی نمک ہی کے

سے خارج کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پوٹاشیم

ایک چمچ سمندری نمک میں پوٹاشیم کی مقدار ۱۰۰ فی صد تک ہوتی ہے۔ یہ نشاستے کو جزو بدن بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ امینو ایسڈ، پروٹین اور اعصاب (مسلز) بنانے میں مددگار بنتا ہے۔ دل کے برقی نظام بھی کنٹرول کرتا ہے۔ پوٹاشیم کی کمی سے پٹھوں کی کمزوری، درد اور دل کی بے قاعدہ دھڑکن کی شکایت ہو سکتی ہے۔

کلورائیڈ

یہ سمندری نمک میں سب سے زیادہ پایا جانے والا عنصر ہے۔ ایک چمچ سمندری نمک میں کلورائیڈ کی مقدار ۵۵،۵ فی صد ہوتی ہے۔ یہ معدن دوسرے عناصر سے مل کر ہماری جسمانی رطوبات بناتا اور معدے کی رطوبت کا اہم جزو ہے۔ اس کی کمی سے ہاضمے کے مسائل جنم لیتے اور جسمانی رطوبات میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

میگنیشیم

یہ انتہائی اہم عنصر ایک چمچ میں ۳۰ فی صد تک ملتا ہے۔ میگنیشیم ہمارے جسم کے کم و بیش تین سو کیمیائی عوامل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہمارے اعصابی نظام اور پٹھوں کی کارکردگی بہتر بناتا ہے۔ مدافعتی نظام طاقتور اور ہڈیاں مضبوط بناتا ہے۔ دل کی دھڑکن باقاعدہ بنانے میں بھی میگنیشیم اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اس کی کمی سے نیند کی کمی، چڑچڑاپن، پڑمردگی، سردرد، تھکاوٹ، بڑھی ہوئی حساسیت، بھوک کی کمی اور قبض جیسی شکایات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہاتھوں اور پاؤں کی ٹھنڈک بھی جنم لیتی ہے۔

کیلشیم

ایک چمچ میں کیلشیم کی مقدار ۲۰۰ فی صد تک ہوتی ہے۔ اس

میں موجود کائی (Algae) یا چٹانوں کے رنگوں سے وجود میں آتا ہے۔ عام طور پر سفید، نیلا، زردی مائل یا بھورے رنگوں میں ہوتا ہے۔ سمندری نمک عام خوردنی نمک (Table Salt) کی طرح تیاری کے مختلف مراحل (Processing) سے نہیں گزرتا بلکہ قدرتی حالت ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ سمندری نمک کھانوں کے علاوہ مختلف صنعتی اور کاسمیٹک اشیا کی تیاری میں کھپتا ہے۔ کچھ خانہ ماں حضرات اپنے پکوانوں میں سمندری نمک کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس کا ذائقہ قدرے مختلف ہوتا ہے۔

کیا سمندری نمک عام نمک سے بہتر ہے؟ اس کا جواب ہاں میں ہے۔ عام نمک محض سوڈیم کلورائیڈ کا مرکب ہے یا بعض دفعہ اس میں آئیوڈین ملا دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس سمندری نمک میں معدنیات کی معقول مقدار پائی جاتی ہے۔ بلکہ اگر اسے معدنیات کا خزانہ کہا جائے، تو غلط نہ ہوگا۔ چونکہ کیمیائی اور معدنی ترکیب میں ہمارے خون اور دیگر رطوبات کی سمندری پانی سے حد درجہ مماثلت ہے، اس لیے سمندری نمک کا استعمال عام نمک سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے اور اس میں موجود معدنیات کی بدولت ہمارے جسم میں پانی کی مقدار متوازن رہتی ہے۔ یوں مختلف اعضا میں خوراک اور آکسیجن کی ترسیل بہتر طریقے سے انجام پاتی ہے۔

اب ہم سمندری نمک میں پانی جانے والی معدنیات کا جائزہ لیتے ہیں:

سوڈیم

ایک چمچ سمندری نمک میں تقریباً ۳۰،۸ فی صد حصہ سوڈیم کا ہے۔ یہ مادہ ہمارے جسم میں پانی کی مقدار کنٹرول کرتا اور فشارخون معتدل رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر ہمارے جسم میں سوڈیم کی مقدار کم ہو، تو ہم سردرد، متلی جسمانی درد، تھکاوٹ اور چڑچڑے پن جیسی کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے گردے اور پسینے کے غدودزائد سوڈیم جسم

کی افادیت سے کون واقف نہیں۔ یہ ہمارے دانتوں اور ہڈیوں کی مضبوطی کے علاوہ خون کے انجماد اور فشارخون کو درست رکھتا ہے۔ خلیات کے باہمی رابطے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور دماغی صلاحیت کے صحیح استعمال میں بھی معاون بنتا ہے۔ کیشیم کی کمی سے پٹھوں کا کھچاؤ، یادداشت میں کمی، ہاتھوں اور پاؤں کا سن ہو جانا اور ذہنی پڑمردگی جیسی شکایات چمٹ سکتی ہیں۔ شدید کمی سے ہڈیوں کی کمزوری اور بھر بھرا پن پیدا ہوتا ہے۔

گندھک

یہ امینو ایسڈ اور پروٹین کا اہم جزو ہے۔ ایک خاص قسم کی پروٹین، کیراٹن (Keratin) بھی بناتا ہے جس سے بال اور ناخنوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ گندھک والے امینو ایسڈ ہمارے خلیات مضبوط بناتے اور بڑھاپا مؤخر کرتے ہیں۔ ایک چمچ سمندری نمک میں ۷۷ فی صد گندھک ہوتا ہے۔ اس کی کمی سے جلدی امراض، پٹھوں اور جوڑوں کی کمزوری اور قبل از وقت بڑھاپے جیسی شکایات پیدا ہوتی ہیں۔

کم مقدار میں پائے جانے والے عناصر

سمندری نمک میں کم و بیش دو فی صد کم مقدار میں پائے جانے والے عناصر (Trace Elements) بھی موجود ہوتے ہیں۔ ان میں فاسفورس، برومین، بوران، زنک، فولاد، تانبا، میگنیز اور سلی کون وغیرہ شامل ہیں۔ یہ دوسرے عناصر سے مل کر متعدد جسمانی افعال میں مفید کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمارے جسم میں ہر عنصر دوسرے عناصر سے مل کر ہی عمدہ کام انجام دیتا ہے۔ انسانی صحت اور جسمانی کارکردگی کا انحصار ان عناصر کی مخصوص تناسب میں موجودگی پر ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے جسم میں کیشیم اور فاسفورس کا تناسب ۲:۱ اور ایک کا ہے۔ کسی ایک عنصر کی کمی یا زیادتی سے دوسرے عناصر متاثر ہوتے ہیں۔ تب جسمانی نظام میں بگاڑ پیدا ہوتا اور مختلف امراض جنم لیتے ہیں۔ قبل از وقت

بڑھاپا اور قوت مدافعت میں کمی جیسے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ قدرتی نمکیات اور غذاؤں میں یہ عناصر صحیح مقدار میں پائے جاتے ہیں جبکہ مصنوعی غذاؤں (Procossed Food) میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی لیے جو لوگ متواتر مصنوعی غذائیں استعمال کرتے رہیں، وہ اپنی جسمانی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

اگر سمندری نمک کو پانی میں حل کیا جائے، تو یہ مرکب سمندری پانی جیسا ہی بن جاتا ہے۔ اس کا نفوذی دباؤ (Osmotic Pressure) ہمارے خون اور دیگر جسمانی رطوبات کے برابر ہے۔ اس لیے سمندری نمک استعمال کرنے والے خواتین و حضرات کے اجسام میں پانی کی مقدار متناسب (Balance) ہوتی ہے۔ نیز مختلف اعضا اور خلیات میں خوراک اور آکسیجن کی ترسیل رواں دواں رہتی ہے جبکہ عام نمک میں سوڈیم کی زیادتی کے باعث پانی خلیات سے باہر نکل جاتا ہے۔

سمندری نمک اور پانی سے بیماریوں کا علاج

جی ہاں! سمندری نمک اور پانی کے استعمال سے متعدد جسمانی بیماریوں کا علاج کرنا ممکن ہے اور بے شمار ذہنی اور جسمانی عوارض سے بچاؤ بھی ہو سکتا ہے۔ اس طریقہ علاج کی دریافت مشہور امریکی ڈاکٹر فیریڈون بٹ مینگ (Fereydoon Batmanghelidj) کے سر ہے جو ڈاکٹر بی (Doctor B) کے نام سے مشہور تھے۔ ڈاکٹر بی نے لندن کی مشہور سینٹ میری اسپتال میڈیکل اسکول سے ایم ڈی (MD) کی ڈگری لی۔ وہاں وہ معروف سائنسدان، ایگلز اینڈ رفلیمنگ کے شاگرد رہے جو پنسلین کے موجد تھے اور نوبل انعام بھی پایا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ڈاکٹر بی ایران میں تعینات ہوئے۔ انقلاب ایران کے بعد انھیں قید کر دیا گیا۔ جیل میں علاج معالجے کی مناسب سہولیات دستیاب نہیں تھیں۔

چھپا چھپا کر سب کے سمندر میں ملے اور پانی کے سہاگے اتر آئے۔
 پر تجربات شروع کر دیے۔ ڈھائی سالہ قید کے دوران انھوں
 نے تین ہزار قیدیوں کا سمندری نمک اور پانی سے علاج کیا۔
 ڈاکٹر بی نے یہ طریقہ علاج ایسے قیدیوں پر بھی آزمایا جو تشدد
 ذہن رکھتے تھے اور شور شرابہ اور ہنگامہ آرائی کے مرتکب ہوا
 کرتے۔ علاج کے بعد ایسے قیدی پرسکون ہو گئے۔ قید سے
 رہائی کے بعد ڈاکٹر بی امریکا چلے گئے اور اپنی تحقیق اور تجربات
 کا سلسلہ جاری رکھا۔

مریضوں کے علاوہ ڈاکٹر بی نے یہ طریقہ علاج ایسے
 بچوں پر بھی آزمایا جو امتحان میں بہتر گریڈ نہیں لے رہے تھے۔
 علاج کے بعد ایسے بچوں کی تعلیمی کارکردگی بہت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر
 بی کے بقول یہ بچے کند ذہن نہیں بلکہ ”پیا سے“ تھے۔ ڈاکٹر بی
 کے تحقیقی مقالات ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۲ء کے عشرے کے دوران
 معروف جرائد نیویارک ٹائمز، واشنگٹن ٹائمز اور ڈیلی میل لندن
 میں شائع ہوئے۔ انھوں نے متعدد کتابیں بھی تحریر کیں۔

ڈاکٹر بی کے نظریے کے مطابق ہمارے جسمانی نظام
 میں بگاڑ و خرابی پانی کی کمی اور معدنیات اور برق پائیدگی
 (Electrolytes) کے فقدان سے وجود میں آتی ہے۔ اس
 باعث جسمانی خلیات اور اعضا میں کچر امربات (Waste
 Products) جنم لیتے ہیں اور اعضا کی شکست و ریخت
 (Degeneration) بڑھ جاتی ہے۔ ایسے اعضا بعد ازاں
 آسانی سے جراثیم کی آماج گاہ بن جاتے ہیں۔ یہ زہریلے
 مواد یا جراثیم خارج کرنے اور جسمانی صفائی کے لیے پرانے
 اطباء اور وید دست آور ادویہ دیا کرتے تھے یا پھر کڑوی کیلی
 ”مصطفیٰ خون“ ادویہ سے علاج کیا کرتے۔ جبکہ یوگی صبح نہار
 منہ بہت زیادہ مقدار میں پانی پیتے ہیں تاکہ معدے اور
 آنتوں کی صفائی ہو جائے۔

مگر یہ سب طریقے بہت تکلیف دہ ہیں۔ اول الذکر
 طریقے میں تو جسم میں پانی کی شدید کمی (Dehydration)

ہوئے گا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر سمندری نمک
 اور پانی سے علاج کیا جائے، تو بہت دور رس اور مفید نتائج
 حاصل ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ علاج ہمارے جسمانی نظام
 کے طریقہ کار کے عین مطابق بھی ہے۔

جسم سے زہریلا مواد، بیماریاں نکالنے اور خلیات و اعضا
 کو طاقت ور بنانے کے لیے ہمیں سمندری نمک اور پانی خاص
 ترتیب سے پینا چاہیے۔ طریق عمل درج ذیل ہے:

اس طریقہ علاج میں پانی کی مقدار ہر آدمی کے وزن
 کے حساب سے متعین ہوتی ہے۔ پاؤنڈ میں وزن کر کے اس
 کے نصف برابر اونس پانی چوبیس گھنٹوں میں پینا ہوتا ہے۔
 مثال کے طور پر دو سو پاؤنڈ وزنی انسان کے لیے سو اونس پانی
 درکار ہوگا۔ یہ اسے چھ برابر خوراکیوں میں پینا ہے اور پانی کی
 ہر خوراک سے پہلے چٹکی بھر سمندری نمک بھی لینا ہوگا۔ پانی
 اور سمندری نمک کی خوراک ہر کھانے سے ۳۵ تا ۴۵ منٹ قبل
 اور ہر کھانے کے دو گھنٹے بعد لینا ہوگی۔ مثلاً صبح ناشتے سے ۳۵
 سے ۴۵ منٹ قبل اور ناشتے کے ۲ گھنٹے بعد دوپہر اور رات کے
 کھانے پر بھی یہی طریق کار اپنائے۔

نمک کی مقدار اس طرح سے متعین کی جاتی ہے کہ ہر ۱۶
 اونس پانی کے لیے ۱/۸ حصہ چمچی برابر نمک درکار ہوگا۔ نمک کی
 یہ مقدار بھی چھ برابر حصوں میں تقسیم کر کے استعمال کی
 جائے۔ مثال کے طور پر ۱۰۰ اونس پانی پینے والے کو چمچی کا
 چوتھائی حصہ سمندری نمک درکار ہوگا۔ البتہ نمک کی مقدار
 ضرورت کے مطابق کم و بیش بھی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح
 گرم علاقوں کے رہائشی یا سخت محنت مشقت کرنے والے
 اضافی پانی بھی بقدر ضرورت پی سکتے ہیں۔ البتہ اضافی پانی
 پیتے وقت نمک کی اضافی خوراک لینا ضروری نہیں۔ کھانے
 سے قبل پانی پینے سے ہمارے نظام انہضام کی صفائی ہو جاتی
 ہے اور معدہ خوراک ہضم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جبکہ
 کھانے کے دو گھنٹے بعد پانی پینے سے وہ ہضم شدہ خوراک

۳۔ جگر خراب ہونے کی صورت جبکہ مریض کے پیٹ میں پانی جمع ہو جاتا ہو۔

۴۔ ایسے امراض قلب جن میں دل خون کو صحیح طریقے سے پمپ نہیں کر پاتا۔ ایسی صورت میں عام طور پر تمام جسم خصوصاً نچلے حصے میں سوجن ہو جاتی ہے۔

۵۔ شدید بیمار مریض جن کے ایک سے زیادہ اعضا متاثر ہو چکے ہوں۔

۶۔ حاملہ خواتین بھی یہ طریقہ علاج اختیار نہ کریں۔
۷۔ وہ مریض جو پہلے سے ادویہ استعمال کر رہے ہوں، اپنے معالج کے مشورے سے سمندری نمک اور پانی سے علاج کر سکتے ہیں۔
حرف آخر

راقم الحروف نے اس طریقہ علاج پر عمل پیرا ہو کر اپنی متعدد پرانی تکالیف سے نجات پائی۔ یہ طریقہ علاج کم خرچ ہونے کے علاوہ بے ضرر اور حتمی نقصانات (Side Effects) سے قطعی پاک ہے۔ ہمارے پیارے وطن کے سادہ لوح اور غریب عوام جو معالجے کی ناکافی سہولیات اور اسپتالوں کی حالت زار سے پریشان ہیں، ان کے لیے یہ علاج نعت سے کم نہیں۔

آخر میں ڈاکٹر لی کا مشہور و معروف مقولہ پیش ہے:

“You are not sick, you are thirsty
don't treat your thirst with medication”

ترجمہ: آپ بیمار نہیں پیاسے ہیں اور اپنی پیاس دواؤں سے مت بجھائیں۔

میرے مشاہدے کے مطابق تازہ پانی سے بہتر کوئی مشروب نہیں اور سمندری نمک سے بہتر کوئی دوا نہیں۔

(مضمون نگار صغریٰ شفیع میڈیکل کمپلیکس، مرید کے روڈ، نارووال سے بحیثیت میڈیکل افسر وابستہ ہیں۔) ◆◆◆

سمندری نمک کی شمولیت سے جذب شدہ پانی کا نفوذی دباؤ ہمارے جسم کی رطوبات کے برابر ہو جاتا ہے۔ یوں نمکیات کی تمام خلیات تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔ اس سے خلیات کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے، ان سے زہریلے مواد کا اخراج بڑھتا اور بیماری کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

نتیجتاً مریض صحت یاب ہونے لگتا ہے، وزن میں کمی آتی ہے۔ نیند بہتر ہوتی ہے۔ خون کا دباؤ (Blood Pressure) کم ہوتا ہے۔ پتھوں کے درد اور گنٹھیا سے نجات ملتی ہے۔ سر درد، ذیابیطس اور دیگر الاعتداد بیماریوں سے چھٹکارا ملتا ہے۔ سمندری نمک اور پانی سے علاج کے دوران مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

۱۔ کھانے کے دوران کم سے کم پانی پیجیے تاکہ معدے کی رطوبات غذا اچھی طرح ہضم کر سکیں۔ زیادہ پانی پینے سے معدے کی رطوبات (Digestive Enzymes) رقیق ہو جاتیں اور باضمے کا عمل سست پڑ جاتا ہے۔

۲۔ دوران علاج اگر مریض کو پیاس محسوس ہو، تو وہ بقدر ضرورت سادہ پانی پی سکتا ہے۔ تاہم نمک ساتھ ملائے کی ضرورت نہیں۔

۳۔ چھ مریض علاج کے شروع میں مرض کی علامات میں زیادتی محسوس کرتے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو جاتی ہیں۔ تب مریض مکمل طور پر صحت یاب ہو جاتا ہے۔

سمندری نمک اور پانی سے علاج کی ممانعت مندرجہ ذیل امراض میں مبتلا لوگوں کو سمندری نمک اور پانی کے علاج سے اجتناب کرنا چاہیے:

۱۔ وہ مریض جن کے گردے خراب ہوں اور وہ گردوں کی صفائی (Dialysis) کے مراحل سے گزر رہے ہوں۔

۲۔ جن مریضوں کو پیشاب کے اخراج میں رکاوٹ ہو مثلاً پیشاب کی نالی کی بندش یا غدہ قدامیہ (Prostate) کا

ترقی کا کوئی ”شارٹ کٹ“ نہیں

عظیم ترین موجد کی زندگی پاکستانی
نوجوانوں کو بہترین راہ عمل دکھاتی ہے

محمد عرفان ندیم

اضافی مل جائیں گے۔“

وہ ہمیشہ اس بات کی شکایت کرتا تھا کہ اسے کام کے لیے
بہت کم وقت ملتا ہے۔ اس کے چوبیس میں سے بائیس گھنٹے تجربہ
گاہ میں گزرتے، مگر وہ شکوہ کرتا تھا کہ اسے کام کے لیے مزید
وقت چاہیے۔ وہ ایک چیز ایجاد کرنے کی کوشش میں بیسیوں نئی
چیزیں ایجاد کر لیتا۔ اکثر وہ اپنی تجربہ گاہ میں کسی چیز پر تحقیق کر رہا
ہوتا کہ ایک ذہناک دھماکے کی آواز سن کر بھاگ جاتا۔ واپس آ
کر دیکھتا، تو ایک نئی چیز وجود میں آچکی ہوتی۔

اس کا بچپن بڑا عجیب تھا۔ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا
ہوا۔ اسکول سے اسے بڑی چڑھتی تھی۔ اس کی ماں اسے اسکول چھوڑ
کے آتی، تو وہ والدہ سے پہلے گھر واپس پہنچ جاتا۔ اسے کتابوں
سے نفرت تھی۔ ماں اسے ہر ہفتے نیا اسکول بیگ بنا کر دیتی، مگر وہ
کبھی کسی امتحان میں شریک نہ ہوا۔ ایک بار سہ ماہی امتحان کے
موقع پر ہیڈ ماسٹر نے اس کی والدہ کو صاف صاف کہہ دیا ”اس
گندے انداز پر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“



اس سے پوچھا گیا ”اگر آپ کو اپنی جائے پیدائش کے
انتخاب کا موقع دیا جائے، تو آپ کس جگہ کا انتخاب
کریں گے۔“

اس نے فوراً جواب دیا ”سیارہ مریخ!“
سوال کرنے والے نے بڑی حیرانی سے اسے دیکھا
اور پوچھا ”آپ اس کی وجہ بتانا چاہیں گے؟“
اس نے پہلو بدلا، ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائی اور گہری سوچ
میں ڈوب کر بولا ”کیونکہ مریخ کا دن ہمارے ہاں سے چالیس
منٹ بڑا ہوتا ہے۔ یوں مجھے اپنے کام کے لیے چالیس منٹ

استاد کا یہ جملہ سن کر اس کی والدہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ والدہ پھر اسے گھر پہ خود ہی پڑھانے لگی۔ مگر وہ وہاں بھی نہ پڑھ سکا۔ والدین اس کی آوارہ مزاجی سے بہت تنگ تھے۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا تھا جب گھر اس کی شکایت نہ آتی۔ اس کے والدین معاشی مسائل کا شکار تھے۔ لیکن اسے ان کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ایک دن جب محکمہ ریلوے کے ملازمین پورٹ ہیوران سے ڈیٹرائٹ تک ریل کی نئی پٹری بچھا رہے تھے اس کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ اس نے والدہ کو اپنے خیال سے آگاہ کیا۔ ”ماں! ہمارے علاقے میں ریل کی پٹری بچھ گئی ہے۔ کیوں نہ میں ریل میں ”پھیری“ لگانا شروع کر دوں؟“

والدین کا خیال تھا کہ یہ ابھی بچہ ہے، ۱۲ سال کی عمر میں کون اسے ”پھیری“ لگانے دے گا۔ لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہ آیا۔ والد نے اسے کہا ”مجھے انکار نہیں لیکن ریلوے والے تم جیسے بچے کو ملازم رکھ کر اپنی حماقت کا ثبوت دیں گے۔“

مگر بچے نے ہمت کی اور ریلوے میں درخواست دے دی۔ اس کی درخواست پہ نوٹ لکھا گیا ”تم ابھی بچے ہو، تمہیں ملازمت نہیں دی جاسکتی۔“ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری کیوں کہ وہ جانتا تھا ناکامی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔ خزاں کی آمد موسم بہار کا پتا دیتی ہے اور نفرت محبت کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔

اس نے دوسری درخواست دی جس میں لکھا ”میں صرف ریل میں پھیری لگانے کی اجازت چاہتا ہوں۔“ اس کی یہ درخواست بھی رد کر دی گئی۔ اس کی انا کو دھچکا لگا۔ اس نے تیسری مرتبہ پھر درخواست دے دی اور لکھا ”میں صرف ریل میں اخبار، پھل پھول اور کھٹی میٹھی گولیاں بیچنے کی اجازت چاہتا ہوں۔“ اس بار درخواست منظور کر لی گئی۔ یوں وہ بارہ برس کی عمر میں ریل میں پھیری لگانے لگا۔

وہ ہر روز کئی گھنٹے ریل میں پھیری لگاتا اور جب تک کام ختم نہ ہوتا، گھر نہیں جاتا۔ ریل میں پھیری لگانے کے تجربے نے اسے سنجیدہ بنا دیا۔ وہ اکیلا بیس بیس گھنٹے کام کرتا۔ جب کام چل

پڑا، تو اس نے دوسرے لڑکوں کو اپنے ساتھ ملازم رکھ لیا۔ وہ ہمیشہ اسی سوچ میں رہتا کہ کوئی بڑا کام کیا جائے۔ کچھ ہی عرصے بعد وہ ”ویکلی ہیرالڈ“ کے نام سے ایک اخبار شائع کرنے لگا۔ وہ تاریخ صحافت میں سب سے کم عمر ایڈیٹر تھا، صرف پندرہ سال کی عمر میں اس نے اخبار نکال کے کمال کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ سائنس میں بھی دلچسپی لینے لگا۔

اس نے ریل کے ڈبے میں ایک تجربہ گاہ بنائی اور اس میں تجربات کرنے لگا۔ ایک دن وہ تجربہ گاہ میں بیٹھا کیمیائی مرکب پر تجربہ کر رہا تھا۔ فاسفورس کی ایک ڈلی اس کے ہاتھ سے گری اور فرش پر گر گئی، ہی شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ اس نے بجھانے کی کوشش کی مگر آگ بہت تیز تھی اور سارا ڈبہ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ کند کڑ تیزی سے بھاگا اور بڑی مشکل سے آگ بجھائی۔

یہ تجربہ اس کے لیے مہنگا ثابت ہوا۔ اگلے ہی اسٹیشن پر اسے چھابڑی، چھاپہ خانے اور تجربہ گاہ کے ساز و سامان سمیت ریل سے اتار دیا گیا۔ مگر اس کی ہمت ماند نہ پڑی۔ اس نے پھر اپنی زندگی میں ہزاروں چیزیں ایجاد کیں اور اسے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا موجد کہا گیا۔ دشمنوں نے اسے ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن وہ ہر بار کامیاب ہوتا رہا۔ صرف بسب کی ایجاد کے حقوق اپنے نام محفوظ کرانے کے لیے اسے چودہ سال تک مقدمہ لڑنا پڑا۔ پورے دس سال تک امریکی میڈیا اس کی ناکامی کی خبریں چھاپتا رہا، مگر وہ مستقل مزاجی سے اپنے کام میں لگن رہا۔ پھر ایک وقت آیا، محنت لگن اور کام کرنے کے شوق نے اسے وہاٹ ہاؤس پہنچا دیا۔ وہاٹ ہاؤس کی طرف سے خصوصی دعوت نامے ارسال کیے گئے اور اسے امریکی تاریخ میں سب سے زیادہ اعزازات سے نوازا گیا۔ وہ بنی نوع انسان کا محسن قرار پایا۔ اٹلی، جرمنی اور فرانس نے بھی اسے خصوصی اعزازات سے نوازا۔ آج بھی جب طلبہ کے سامنے ”تھامس ایلو ایڈیسن“ کا نام لیا جائے، تو ان کے سر ادب سے جھک جاتے ہیں۔

☆☆

آج کے پاکستانی نوجوان کا معاملہ یہ ہے کہ جب وہ ڈگری لے کر میدان عمل میں آئے، تو اس کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہوتا ہے ”اب وہ کرے کیا؟“ بیروزگاری نئی نسل کا بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارا نوجوان بیروزگاری کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ لیکن اسے مسئلہ بنانے میں نئی نسل کا اپنا ہاتھ بھی ہے۔ دراصل آج کا نوجوان چاہتا ہے جب وہ کالج، یونیورسٹی اور مدرسے سے فارغ ہو کر نکلے، تو اگلے ہی روز اسے ”پچاس پلس“ کی نوکری مل جائے۔ وہ دفتر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے اور عیش کرے۔ ہماری بدقسمتی اور کوتاہ بینی ہے کہ ہم کامیاب لوگوں کی ”انتہا“ کو تو دیکھتے ہیں، مگر یہ بھول جاتے ہیں ان کی ”ابتدا“ بہت مشکل اور کٹھن تھی۔

ہم ایڈیسن کی وہائٹ ہاؤس آمد تو دیکھتے، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک وقت اس نے پھیری بھی لگائی تھی۔ ہم مادام کیوری کے نوبل انعامات بڑی حسرت سے دیکھتے اور یہ بھول جاتے ہیں ایک وقت وہ جماعت میں بھوک کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ ہم مولانا انور شاہ کشمیری اور

مفتی تقی عثمانی کی تصانیف کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک وقت انھوں نے بھوکے رہے اور لائبریریوں کے اندر قید ہو کر علم حاصل کیا تھا۔ شاید سماج نہیں بلکہ نوجوان خود ظالم ہے۔ ہم زمانہ طالب علمی میں محنت نہیں کرتے اور بعد میں سر پر ہاتھ رکھ روئے لگتے ہیں۔ آپ کسی بھی نامور کالج، یونیورسٹی یا مدرسے کا دورہ کریں اور طلبہ کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں، آپ کو نظر آئے گا کہ پچانوے فیصد طلبہ مستقبل کی منصوبہ بندی کے بغیر پڑھ رہے ہیں۔ نوے فیصد طلب علموں نے اپنے مستقبل کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ اسی فیصد طلبہ ہنس کر کہتے ہیں ”جب فارغ ہوں گے، تو دیکھا جائے گا۔“

جب وہ فارغ ہوتے ہیں، تو دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ یاد رکھیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی ڈگری بعد میں مکمل ہو اور آپ کو ”سلیکشن لیٹر“ پہلے موصول ہو جائے، تو اس کے لیے آپ چوبیس میں سے بائیس گھنٹے پڑھیے۔ سب سے بڑھ کر زمانہ طالب علمی میں اپنے عملی راستے کا انتخاب کر لیجیے۔

سلام کرنے میں پہل سے شخصی انقلاب

آج سے تقریباً دس ماہ پیشتر ایک مسجد میں حدیث مبارکہ لکھی دیکھی: ”سلام میں سلامتی ہے۔“ کہیں اور بھی پڑھا تھا، سلام کہیے اور دلوں کو جیت لیجیے۔ میں نے دل میں عہد کر لیا کہ میں ضرور اس حدیث مبارکہ پر عمل کروں گا۔ اب جو بھی سامنے آتا یا گزرتا، میں اسے السلام علیکم کہتا۔ کوئی جواب دیتا کوئی نہ دیتا، یہ سلسلہ جاری رہا۔ شروع شروع میں چھوٹوں اور اجنبی افراد کو سلام کہنے میں جھجک رہی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی ختم ہو گئی۔ اب مجھے کسی کو سلام کہنے میں کوئی عار نہیں۔ میرے محلے میں اس کا اثر بڑا اچھا پڑا۔ جن کو میں سلام کہتا تھا، اب وہ مجھے سلام کہنے میں پہل کرتے ہیں۔

السلام علیکم کہنے کو شعار بنانے سے میرے اندر درج ذیل حیرت انگیز تبدیلیاں آئی ہیں:

- (۱) شرم، بڑائی، غرور اور انا کا خاتمہ ہو گیا۔ (۲) برے خیالات جو دل و دماغ پر مسلط تھے، ان سے نجات مل گئی۔ (۳) عاجزی اور انکسار کا جذبہ پیدا ہوا۔ (۴) بغض اور کینہ جو ہمیشہ دل میں قبضہ جمائے ہوئے تھے، ان کی چھٹی ہو گئی اور ان کی جگہ اخلاص اور محبت نے لے لی۔ (۵) میں نماز کا پابند ہو گیا۔ (۶) بھلائی کے کام کرنے کو دل چاہتا ہے اور ان سے بڑی روحانی خوشی ملتی ہے۔

(الف، د، کراچی)

عرصہ ہوا معروف ادیب و دانشور اور درویش منش صحافی جناب محمود احمد برکاتی کا ایک خط موصول ہوا جس کا آغاز انھوں نے اس دعائیہ جملہ سے کیا تھا: ”اللہ تعالیٰ ہمیں دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔“

میں دیر تک اس دعائیہ جملے کی سادگی اور پُر تاثیر ہونے پر غور کرتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے فون پر برکاتی صاحب سے اس کا ذکر کیا، تو انھوں نے بتایا کہ معروف ادیب اشفاق احمد یہ دعا خود کرتے تھے اور دوسروں کو بھی کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

یا اللہ! ہمیں دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی توفیق دے

یہ دعا کرنے والی قوم کبھی اپنے کاموں پر بھی غور کرے

سید تاثیر مصطفیٰ

آج مجھے یہ واقعہ یاد آیا اور میں نے پھر اس پر غور کیا، تو اندازہ ہوا کہ یہ دعا بڑی پُر اثر ہے۔ ہم میں سے کئی لوگ آج بھی یہ دعا مانگتے ہیں۔ لیکن کیا عملی زندگی میں ہم دوسروں کے لیے سہولتیں اور آسانیاں پیدا کر رہے ہیں یا محض دعا مانگ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا، باقی کام دوسرے لوگ کریں گے۔

آج اگر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیں اور بطور قوم اپنے رویوں کا جائزہ لیں، تو شاید ہمیں سخت شرمندگی ہوگی۔ وجہ یہ کہ ہم دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی توفیق مانگتے ہیں، لیکن انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم دوسروں کے لیے آسانیاں نہیں، مشکلات پیدا کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارا نارواریہ گھر، محلے، بازار، دفاتر، پبلک مقامات، تعلیمی اداروں بلکہ ہر جگہ اور ہر سطح پر نظر آتا ہے۔ ہم یہ کام کسی بھی وقت کر لیتے ہیں اور پھر اس پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض اوقات ایسے کاموں پر جن سے دوسروں کے لیے مشکلات پیدا ہوتی ہوں، فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہماری خواتین گھروں کی صفائی



کرتے وقت انھیں شیشے کی طرح چمکتی ہیں، لیکن سارا کوڑا سڑک پر پھینک دیتی ہیں۔ اگر وہ کوڑے کا شاپرے بچے کو دیں کہ وہ کوڑے دان میں ڈال آئے، تو بچہ لوگوں کی نظر بچا کر کچرے سے بھرا شاپرے کسی کے گھر کی دیوار کے ساتھ رکھ دیتا ہے۔ خادمہ ملازمہ پورا گھر دھو کر پانی سڑک پر اکٹھا ہونے دیتی ہے۔ پھر وہاں سے گزرنے والوں کی پریشانی سے لطف اٹھاتی ہے۔

ہم سڑک پر ہوں اور ٹریفک کی سرخ لائن روشن ہو جائے، تو اپنی گاڑیاں زیرِ آکر اسنگ پر لا کر روک دیتے ہیں۔ جس سے سڑک پار کرنے والے راگیروں کو سخت دقت ہوتی ہے۔ خود راگیروں کا یہ حال ہے کہ وہ خالی فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک پر خراماں خراماں چلتے ہیں۔ ہمارے نوجوان موٹر سائیکلیں چلاتے ہوئے اس طرح کی خوف ناک آوازیں نکالتے ہیں جنہیں سن کر بوڑھے اور کمزور دل افراد پریشان ہوتے ہیں۔

کوئی بوڑھا، بچہ، خاتون یا بیمار شخص سڑک عبور کرنے کی کوشش کر رہا ہو، تو ہم چند سیکنڈ کے لیے رکنے یا اپنی رفتار کم کرنے کی بجائے رفتار مزید بڑھا کر اس کے آگے پیچھے سے گزرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی باعث ان لوگوں کے لیے سڑک عبور کرنا عذاب بن جاتا ہے۔

اب تو ہمارا حال یہ ہو گیا ہے کہ ایسبولینس اور ریسکیو کی گاڑیاں ہارن بجاتی رہتی ہیں اور ہم اپنی گاڑی ایک طرف کر کے انھیں راستہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ دوسری جانب جب ایسبولینس یا ریسکیو گاڑی معمول کے مطابق کہیں جا رہی ہو، تب بھی اس کے ڈرائیور ایمر جنسی ہارن اور سائرن بجا کر ٹریفک میں ہلچل مچا دیتے ہیں حالانکہ اس وقت وہ کسی ایمر جنسی ڈیوٹی پر نہیں ہوتے۔

ہم پبلک پارکوں میں پھل اور کھانے پینے کی دوسری اشیا لے کر جاتے ہیں، لیکن پھلوں کے چھلکے اور پچی ہوئی چیزیں قریبی کوڑا دان میں نہیں ڈالتے، یہی نہیں بلکہ انھیں کسی شاپرے میں باندھ کر کونے میں رکھ دینے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔ ہم یہ

اہتمام کرتے ہیں کہ پورے پارک میں ہمارے کھائے ہوئے کیلوں، گنڈیریوں اور مالٹوں کے چھلکے اور مرغی کی ہڈیاں بکھری نظر آئیں۔ اس سے شاید ہماری انا کی تسکین تو ہوتی ہو لیکن ہمارا یہ ناروا رویہ پارک میں آنے والے دوسرے لوگوں اور خصوصاً عملہ صفائی کے لیے تکلیف اور ذہنی اذیت کا باعث بنتا ہے۔

ہم اپنے گھروں میں بلا روک ٹوک پانی کی موٹریں چلاتے ہیں۔ صبح سے شام تک گیس کے چولھے جلتے چھوڑ دیتے ہیں۔ بہت سے بلب اور چمکے بلاوجہ گھنٹوں چلاتے ہیں مگر کبھی نہیں سوچتے کہ پانی، بجلی اور گیس کے اس ضیاع کے باعث کتنے ہی گھر ان نعمتوں سے محروم ہیں۔ ہم لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کی لاگت سے گھر تعمیر کرتے، سڑک توڑ کر گیس یا پانی کا کنکشن لگواتے ہیں، لیکن چند سو روپے خرچ کر کے سڑک کے اس حصے کی مرمت نہیں کراتے یا پہلے سے موجود گھرے میں ریت سیمنٹ کا مسالا نہیں ڈالتے حالانکہ وہ دوسرے راگیروں کے علاوہ خود ہمارے لیے بھی تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

ہم کروڑوں روپے کا کاروبار کرتے ہیں، لیکن اپنی دکان کے سامنے موجود فٹ پاتھ بلکہ سڑک تک اپنے استعمال میں لے آتے ہیں۔ یوں روزانہ سیکڑوں افراد کو آنے جانے میں دقت ہوتی ہے، لیکن ہم اپنے اس کارنامے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہم کبھی کسی بچے یا بوڑھے کو سڑک عبور نہیں کراتے بلکہ بعض گاڑیوں والے ان کی پریشانی اور خوف سے لطف اٹھاتے یا اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے مزید خوفزدہ کر دیتے ہیں۔

اسی طرح ہم شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں کھانا ضائع کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ پہلے ہوس کی وجہ سے پلیٹیں اٹاٹ بھر لیتے، پھر آدھے سے بھی زیادہ کھانا یونہی چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی نہیں سوچتے کہ ہمارا یہ عمل میزبان کے لیے مالی نقصان اور ذہنی تکلیف کا باعث ہے۔ اگر ہم تھوڑا سا احساس کر لیں، تو یہ

کھانا کسی ضرورت مند کے پیٹ میں جاسکتا ہے۔

ہماری لائبریریوں میں جانے والے طلبہ و طالبات اور بعض ”اہل علم“ مطالعے کے دوران کسی کتاب کے جس حصے کو اپنے لیے ضروری سمجھیں، اس کی فوٹو کاپی کرانے کے بجائے آنکھ بچا کتاب کے وہ صفحات ہی پھاڑ لیتے ہیں۔ پرانے اخبارات میں سے کوئی خبر، مضمون، کالم یا ادارہ درکار ہو، تو پورا اخبار یا وہ صفحہ ہی غائب کر لیتے ہیں اور کبھی یہ نہیں سوچتے کہ بعد میں آنے والے کسی محقق یا طالب علم کو یہ حصہ درکار ہوا، تو اس کا کس قدر نقصان ہوگا۔ اس محرومی کی وجہ سے اسے کس قدر ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہم اسپتالوں اور تعلیمی اداروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے کبھی یہ سوچ کر ہارن بجانے سے نہیں رکتے کہ ہمارے اس عمل سے مریضوں کو تکلیف پہنچے گی اور طلبہ کی پڑھائی میں حرج ہوگا۔ گاڑی پارک کرتے ہوئے، راگیروں اور دوسری گاڑیوں کا خیال نہیں کرتے جنہیں ہماری وجہ سے خاصی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔

ہم وقت لیے بغیر گھریا اور دفاتر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں غیر ضروری گپ شپ شروع کر دیتے ہیں جو گھنٹوں پر محیط ہوتی ہے۔ اس سے اہل خانہ تنگ اور دفاتر میں کام کرنے والے افسر اور اہلکار پریشان ہوتے ہیں۔ اس عمل کے دوران نجانے کتنے سائلین انتظار کا عذاب اٹھاتے یا تنگ اور مایوس ہو کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم بسا اوقات کسی سے وقت لے کر اسے گھنٹوں انتظار کراتے ہیں۔

ہمارے سیاسی راہنماؤں نے تو یہ معمول بنالیا ہے کہ وہ لوگوں سے ملتے ہی نہیں۔ سائلین ملاقات کے لیے چکر لگاتے رہتے اور بددعائیں دے کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ ہمارے دفاتر میں سرکاری افسر بیٹھے گپیں مارتے ہیں اور ملاقاتیوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ صاحب میٹنگ میں ہیں۔ حالانکہ صاحب دوستوں کے ساتھ گپیں مار رہے ہیں اور چائے اور

کافی کے دور چلتے ہیں۔ اس دوران انتظار کرنے والے سائلین کی تکلیف اور اذیت کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں۔

آج کل شہروں کے کمرشل علاقوں میں ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے جو شہریوں کے لیے عذاب جان بن چکا ہے۔ بڑی بڑی دکانوں اور پلازوں کے سامنے زنجیریں اور رسیاں باندھ کر جگہ روک لی جاتی ہے تاکہ وہاں کوئی شخص گاڑی، موٹر سائیکل یا سائیکل کھڑی نہ کر سکے۔ جبکہ دفاتر کے باہر بعض نازک مزاج مالکان گن مین بٹھا دیتے ہیں تاکہ وہاں کوئی شخص گاڑی وغیرہ کھڑی نہ کر سکے۔ وہاں آنے والے لوگوں کو جو تکلیف ہوتی ہے، اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

ہماری اذیت پسندی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کبھی ڈاک یا غلطی سے ہمارے گھر کسی دوسرے کی ڈاک ڈال جائے، تو ہم ہفتوں یا مہینوں اسے پڑا رہنے دیتے ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ خط ڈاک کے کو واپس کر دیے جائیں یا تھوڑی سی تکلیف کر کے اسے دوسرے تک پہنچا سکتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ یہ ڈاک کسی کے لیے بہت اہم ہو سکتی ہے۔ یہ کسی طالب علم کا رول نمبر، ڈیٹ شیٹ یا امتحانی شیڈول ہو سکتا ہے، کسی نوجوان کی کال ہو سکتی ہے یا کسی بے روزگار کی ملازمت کا تقرر نامہ! ہماری اس کوتاہی یا بیپرواہی سے متاثرہ شخص کو جو تکلیف ہوتی ہے، اس کے ذمہ دار بہر حال ہم ہی ہیں۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ عمل ہمارے ان سرکاری اہلکاروں کا ہے جو سالہا سال تک اپنے ساتھ کام کرنے والے ساتھیوں کے پنشن کے کاغذات میں غیر ضروری تاخیر کر کے انھیں اور ان کے اہل خانہ کو شدید تکلیف اور اذیت پہنچاتے ہیں۔

یہ ہیں ہمارے عمل اور ہم دعا کرتے ہیں کہ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی توفیق مل جائے..... ہماری دعا اور عمل کا یہ تضاد ہمیں انفرادی اور اجتماعی، دونوں سطحوں پر خود ہمارے لیے بھی آسانی نہیں تکلیف کا سبب بنتا ہے۔ کاش ہم کبھی اس پر غور کر سکیں۔



بوجھیں توجائیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)
ماہ ستمبر میں دیے گئے اسلامی کوئز کے صحیح جوابات

(ب) ۵

اسلامی کوئز ۱۔ (الف) ۹ ذی الحج کو

(ب) ۱۰ ذی الحج کو، سنت ابراہیمی

اسلامی کوئز ۲۔ (الف) حضرت ابراہیم

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ ابراہیم سجاد (لاہور) 2۔ فاطمہ سعد (ضلع راولپنڈی) 3۔ ناعمہ علی (حیدرآباد) 4۔ محمد احسن (کوئٹہ)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

عائشہ عباس بیگ (لاہور)، صاحبزادہ عبدالمغنی شکیل (ملتان)، کوثر پروین (راولپنڈی)، حسام شیخ (راولپنڈی)، فیضان اکرم (راولپنڈی)، احتشام ظفر (راولپنڈی)، محمد شکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، ابراہیم سجاد (لاہور)، حافظ سعد عبداللہ (ہری پور)، محمد منیب جاوید (بہاولپور)، محمد راشد نصیر (فیصل آباد)، محمد عرفان زیب (اسلام آباد)، اظفر وقاص (اسلام آباد)، طیب اسلم (فیصل آباد)، عبدالحجید (کراچی)، محمد اسحاق زہری (خیاری)، مدثر ظلیل (جہلم)، ناعمہ تحریم (کراچی)، حیان مرزا (حیدرآباد)، مرزا فرحال بیگ (حیدرآباد)، طاہرین (حیدرآباد)، ممتاز احمد مینگل (خیاری)، احسن کمال یوسفی (واہ کینٹ)، فاطمہ سعد (راولپنڈی)، محمد احسن (کوئٹہ)

اسلامی کوئز ۱

خباب بن ارت صحابی: آپ تمیم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور لوہار کا کام کرتے تھے۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں آپ کو غلام بنا کر مکہ میں فروخت کر دیا گیا۔ آپ اس وقت مسلمان ہوئے جب حضور اکرم ﷺ کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت تک صرف پانچ ہستیوں نے اسلام قبول کیا تھا (حضرت خدیجہ، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت علی، حضرت زید بن حارثہ اور حضرت ابو ذر غفاری) آپ ”سادات الاسلام“ (چھٹے مسلمان) کے عظیم لقب سے مشرف ہوئے۔ انھیں قریش مکہ نے طرح طرح کی افیتیں دیں۔ ایک مرتبہ آپ کو دہکتے ہوئے کوکلوں پر لٹا کر ایک کافر آپ کے سینے پر بیٹھ گیا جس سے آپ کی پیٹھ جل کر سفید ہو گئی۔

۲۔ آپ کس قبیلہ سے تھے؟

۱۔ آپ کا لقب کیا تھا؟

اسلامی کوئز ۲

ام المؤمنین، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زوجہ محترمہ۔ قریش کے ممتاز خاندان اسد بن عبد العزیٰ سے تھیں۔ اسد بن عبد العزیٰ قریش کے ان نوممتاز خاندانوں میں سے تھا جن میں دس قومی اور ملکی عزازات منقسم تھے جب قریش کو قومی اور ملکی مسائل درپیش ہوتے تو وہ صلاح مشورے کے لیے اس قبیلے کے پاس آتے تھے۔ آبائی سلسلہ نسب کے لحاظ سے حضرت خدیجہ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی تھیں۔

حضرت خدیجہ عام الفیل سے پندرہ سال قبل پیدا ہوئیں۔ آپ کا پہلا نکاح ابو ہالہ تمیمی سے ہوا۔ بنو تمیم قریش کے ہم جد تھے۔ اس شوہر سے آپ کی تین اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے ہند اور حارث اور ایک لڑکی زینب۔ پہلے شوہر کی وفات کے بعد آپ کا دوسرا نکاح عقیق بن عائد سے ہوا۔

۱۔ نکاح کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر کتنی تھی؟ ۲۔ آپ کے ساتھ شادی سے قبل حضرت خدیجہ کے کتنے نکاح ہو چکے تھے؟

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی وی ایل نمبر دینا لازم ہے ورنہ TCS پہنچ نہیں پاتا۔
(مدیر اردو ڈائجسٹ لاہور)

انعامات کے لیے تعاون
اسلامک پبلی کیشنز
منصورہ ملتان روڈ لاہور

TENDER NOTICE

Sealed tenders based on item rates / percentage above or below on approved estimated (DNIT) amount are hereby invited, for the works mentioned below from the contractors / firms enlisted / renewed with C&W Department for the current financial year 2015-16 in the field of Buildings works. Tenders documents can be obtained from the date of publication of invitation to bids in the newspaper from any of the below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of enlistment/upto date renewal letter, PEC license, Identity Card of Contractor / Managing Partner / Director of the firm alongwith registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of CDR / Bank Draft / Cashier's Cheque of any scheduled bank:-

- 1) Chief Engineer, (South Zone), Punjab Buildings Department, Lahore.
- 2) Commissioner, Multan Division, Multan.
- 3) Superintending Engineer, Provincial Buildings Circle, Multan.
- 4) District Coordination Officer, Multan.
- 5) Executive Engineer, Provincial Buildings Division, Multan.

Tendered rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. No rebate on tendered rates will be acceptable.

Tenders will be received in the offices of Chief Engineer, (South Zone), Punjab Buildings Department, Lahore and Commissioner Multan Division, Multan at 01:30 P.M and will be opened at 02:00 P.M on fixed date and time by the respective Tenders Opening Committee at the above venues in the presence of intending contractors or their representatives, & who opt to be present. Conditional tenders and tenders not accompanied without earnest money @ 2 % of the bid cost in shape of CDR / Bank Draft / Cashier's Cheque of any scheduled Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

The Superintending Engineer may reject all tenders / bids at any time prior to the acceptance of a bid / tender. However, Superintending Engineer shall upon request communicate to the bidder / tenderer who submit a bid / tender, the grounds for its rejection.

Sr. No.	Name of Work	Bid Cost Earnest Money	Tender Fee	Last date for submission of applications to purchase tender	Last date & time for receipt / opening of Tenders
			Time Limit		
Deposit Work:-					
1.	Restoration Rehabilitatoin of demolished components of Government Islamia High School Aam Khas Bag Multan.	Rs. 9.595(M) Rs.191900 -	Rs.10,000 - 06-Months	13.10.2015	14.10.2015 At 01:30 P.M. 02:00 P.M.
2.	Restoration Rehabilitatoin of demolished components of Public Library Reading Room Aam Khas Bag, Multan.	Rs. 4.241(M) Rs.84820 -	Rs.10,000 - 06-Months.	---do---	---do---
3.	Restoration Rehabilitatoin of demolished components of Technical Training Institute Doulat Gate, Multan.	Rs. 9.966(M) Rs.199320 -	Rs.10,000 - 06-Months.	---do---	---do---
4.	Restoration Rehabilitatoin of demolished components of Government Middle School for (Boys) Manzeralvi, Multan.	Rs.12.333(M) Rs.246660 -	Rs.10,000 - 09-Months.	---do---	---do---
Deposit Work:-					
1.	Dismantling of Kitchen and O.H.R. Children Hospital Complex at Multan.	Rs. 126,700 - Rs.2474 -	Rs.60 - 02-Months	---do---	---do---
2.	M.R of Children Hospital Complex at Multan.	Rs. 231,500 - Rs.4630 -	Rs.110 - 02-Months	---do---	---do---
3.	M.R of Children Hospital Complex at Multan.	Rs. 27,100 - Rs.544 -	Rs.36 - 02-Months.	---do---	---do---
4.	M.R of Internal San Gas Pipeline in Public Health Nursing School, Nishtar Hospital, Multan.	Rs. 80,000 - Rs.16000 -	Rs.40 - 03-Months.	---do---	---do---

(Asif Iqbal Salhoor)
Superintending Engineer,
Principal Buildings Office,
Multan

(Asif Iqbal Salhoor)
Superintending Engineer,
Principal Buildings Office,
Multan

SOIL AND WATER TESTING LABORATORY FOR RESEARCH,

AYUB AGRICULTURAL RESEARCH INSTITUTE, FAISALABAD.

Phone & Fax: 92-041-9201805

E. Mail: swtl_fsd@yahoo.com

TENDER NOTICE

Sealed quotations are invited from well-established/reputed/registered firms/suppliers for the purchase of following store items under research project titled "Intelligent Extension Service in Punjab"

Item's Type #	Name of Tender Items	Tender fee (Rs)
1	Chemicals	500
2	Glass Apparatus	500
3	Analytical Standards Certified Reference Materials (CRMs)	300

Only cash payment of tender fee for acquiring tender document be paid for each tender separately as mentioned against each item's type which is non refundable.

Terms and Conditions

1. Tender document can be viewed and downloaded from web site www.sfr Punjab.gov.pk and www.ppra Punjab.gov.pk. The procurement shall be completed in accordance with the Punjab Procurement Rules 2014, on Single Stage-Two Envelops Bidding Procedure.
2. Tender document along with detailed specifications of the items to be procured can be obtained from the office of the undersigned during office hours (8.00 A.M. to 4.00 P.M.) from Monday to Friday.
3. Earnest money @ 2% of total value against each item's type of the bid (refundable) must be attached in the form of CDR bank draft in favour of the undersigned.
4. Bids which are incomplete, un-sealed, not signed, unstamped, late or submitted by other than specified mode will not be considered.
5. Tender complete in all respect should reach the office of the undersigned on or before 13.10.2015 up to 10 A.M. The tenders will be opened by the Purchase Committee on the same day on 13.10.2015 at 4:45 P.M. in the presence of the contractors or their authorized representatives.
6. The undersigned reserves the right to reject ~~any one or~~ the entire offers without assigning any reason as per PPRA rule-35 (2011).

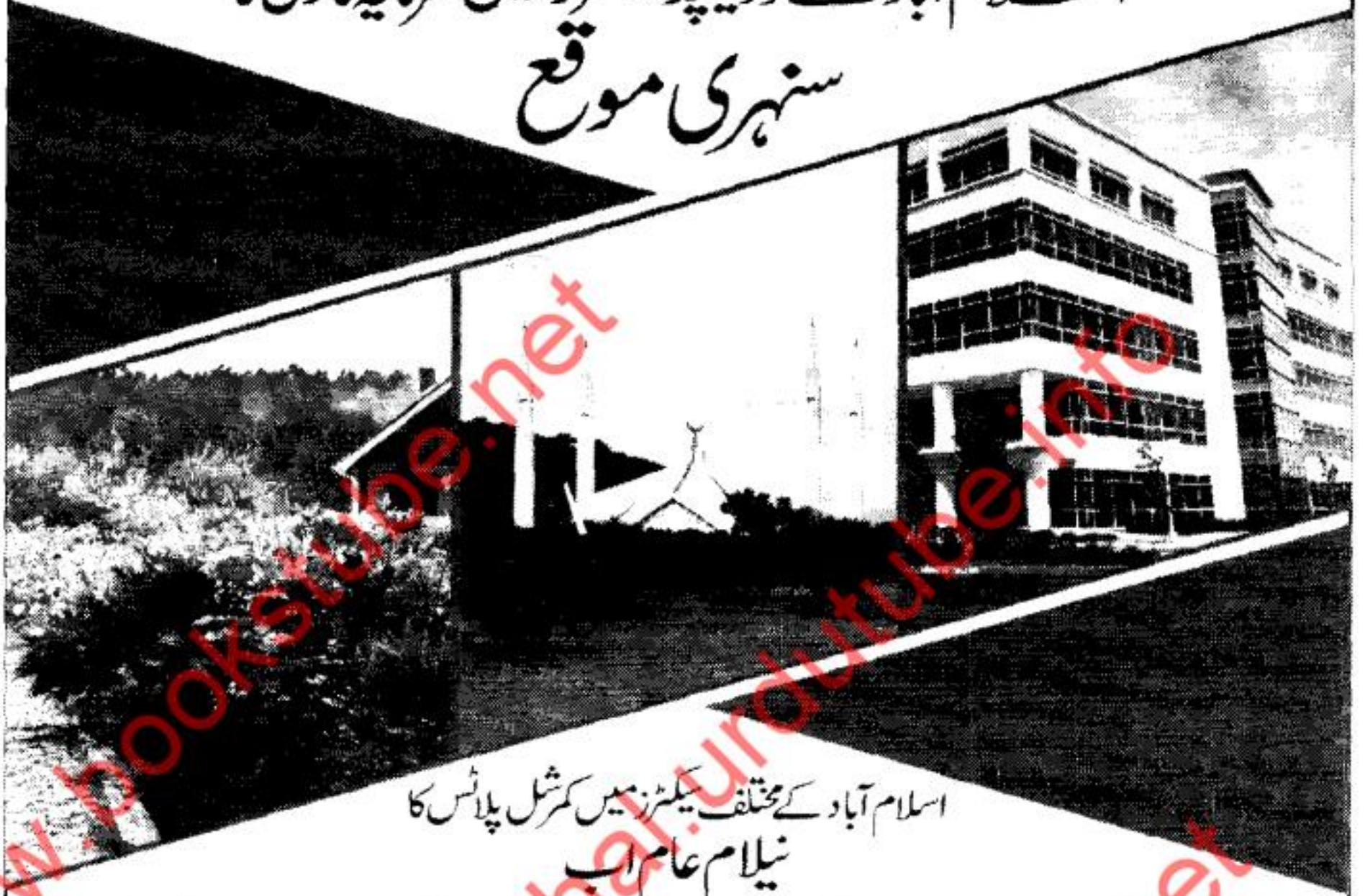
**GHULAM ABBAS, Agricultural Chemist (SF), Soil & Water Testing Laboratory for Research,
Ayub Agricultural Research Institute, Jhang Road, Faisalabad Phone No. 041-9201805, Cell #
0321-7810181, E. Mail: swtl_fsd@yahoo.com.**

تاریخ میں توسیع نیلام عام

کمرشل پلاٹس

اسلام آباد کے ڈویلپڈ سیکٹرز میں سرمایہ کاری کا

سنہری موقع



اسلام آباد کے مختلف سیکٹرز میں کمرشل پلاٹس کا
نیلام عام اب

13 اور 14 اکتوبر 2015 کو ہوگا

وقت: صبح 9:00 بجے | مقام: جناح کنونشن سنٹر، اسلام آباد

بلیو ایریا، F-8، F-11، F-11/1، G-9، G-11، I-8، D-12، I-12، مرکز، E-11، ناردرن سٹریٹ،
G-11/3 بازار نمبر 10، I-9/2، I-10/3، اور I-11/4 کے کمرشل پلاٹس
تمام شہری سہولتوں سے آراستہ اور ہر قسم کی قانونی پیچیدگی سے پاک
کیٹیگری: لکڑی فلیٹس، انڈسٹریل پلاٹس، فروٹ مارکیٹ، آرچرڈ سکیم، پٹرول پمپ، مراکز اور بازار



ISLAMABAD
The Green City

کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی

ڈائریکٹر اعلیٰ منجمنٹ-II، سی ڈی اے
ٹیلیفون نمبر: 051-9252481



PID(I) 1545/15

For further information please visit: www.cda.gov.pk

اردو ڈائجسٹ 234 اکتوبر 2015ء

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اکتا اور زندگی کو با مقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کرگزرنے کا جذبہ اس کی ۳ بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بغور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے ۲ سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں سمجھادیتے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور وہ خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے ۶ شماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ منسورات کی ۳ خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتا : **مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ۲۲۵۔ جی تھری جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہ ستمبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔ (الف) ۱۹۰۹-۱۰-۱۹-۱۹۶۳-۰۷-۱۵ (ب) ۱۹۵۳-۰۴-۱۷

قصہ کوئز ۲۔ (الف) ۱۷۷۵-۱۰-۱۸۶۲-۲۳-۰۷ (ب) ۱۸۵۷

قصہ کوئز ۳۔ (الف) ۱۹۰۵-۰۲-۰۳-۱۹۳۴-۰۶-۲۵ (ب) قائد ملت

درست جوابات دینے والوں کے نام

نور عباس مرزا (لاہور)، عائشہ عباس بیگ (لاہور)، منور سعید خانزادہ (سکرٹ)، کوثر پروین (راولپنڈی)، حسام شیخ (راولپنڈی)، فیضان اکرم (ظفر قبال)، فیصل ممتاز (راولپنڈی)، فیصل امتیاز (راولپنڈی)، احتشام ظفر (راولپنڈی)، محمود منور خان (سرگودھا)، محمد ثکلیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، غلام حسین (حیدر آباد)، طیب اسلم (فیصل آباد)، محمد راشد نظیر (فیصل آباد)، شمیم اختر (فیصل آباد)، محمد فرقان زیب (اسلام آباد)، عبدالحمید (کراچی)، ظفر اسماعیل (راولپنڈی)، ذاکر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، معین الدین احمد (رحیم یار خان)، عدیل الیاس (ٹیاری)، میجر (ر) نسیم اختر (جہلم)، ممتاز احمد مینگل (ٹیاری)، منظر عالم (کراچی)، محمد احمد (کراچی)، کاشف مرزا (حیدر آباد)، مرزا بادی بیگ (حیدر آباد)، محمد یونس راندروی (حیدر آباد)، محمد افضل (گجرات)، میاں محمد اویس مظہر (لاہور)، مسز نانکد کوکب (لاہور)، زبیدہ خاتون (لاہور)، حامد محمود (فیصل آباد)، مہر محمد اقبال (فیصل آباد)

دلچسپی، معلومات اور کچھ کرگزرنے کا جذبہ، یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد



انچارج کوئز:
غلام سجاد

**یہی ہے
قصہ کوئز**

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

آپ کو ۱ ماہ تک اردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

• قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام
• طیب اسلم (فیصل آباد)
• ممتاز احمد مینگل (ٹیاری)

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام و پتا اور موبائل یا پی ٹی سی ایل نمبر لکھنا برگز نہ بھولیں۔ اس کے بغیر کوریئر سروس کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچ پاتا۔ (ایڈیٹر)

اردو ڈائجسٹ 235 اکتوبر 2015ء

قصہ کوئز ۱

شمر قند کا ایک بادشاہ شہر یار اپنی بیوی کے رویے سے ایسا نالاں ہوا کہ اس نے عورت ذات سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جس عورت سے بھی شادی کرتا، اگلے روز ہی قتل کر دیتا۔ بے گناہ عورتوں کے قتل کا سلسلہ طول پکڑتا گیا تو اس کے ایک دانا وزیر کی بیٹی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنی طرح کی لڑکیوں کو اس عذاب سے نجات دلائے۔ اس نے بمشکل اپنے باپ کو راضی کیا اور خود بادشاہ سے شادی کر لی۔ شادی کی رات اس نے بادشاہ کو ایک کہانی سنانا شروع کی۔ کہانی اتنی دلچسپ تھی کہ رات ختم ہو گئی مگر نہ تو کہانی ختم ہوئی اور نہ کہانی کی دلچسپی۔

بادشاہ نے کہانی کا اگلا حصہ سننے کے لیے اس کے قتل کا ارادہ ملتوی کر دیا مگر کہانی تو اگلی رات بھی ختم نہ ہوئی بلکہ اس میں پہلے سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ پھر اس نے ہر رات ایک کہانی سنا کر اس طرح ختم کی کہ اس سے زیادہ دلچسپ ایک اور کہانی کا آغاز اسی رات کر دیا اور اسے پھر ادھورا چھوڑ دیا۔ اس طرح ایک ہزار راتوں تک وہ کہانی سناتی رہی۔ اس عرصے میں وہ خود ۲۰ بیچوں کی ماں بن گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی بدظنی بھی جاتی رہی اور اس کا رویہ بھی درست ہو گیا۔

(الف) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہم اور آپ ان کہانیوں کو کس نام سے جانتے ہیں؟

(ب) یہ کہانیاں کس خطے میں تخلیق ہوئیں؟

قصہ کوئز ۲

۱۷ برس کی عمر میں وہ مصر کی ملکہ بنی اور اس کا بھائی مصر کا بادشاہ، مگر دونوں کی حکومت زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ انھیں دنوں روم کا ایک جنرل اپنی فوجوں کے ساتھ مصر کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس جنرل کو جب یہ خبر ہوئی کہ ملکہ اور بادشاہ کے باہمی تعلقات اچھے نہیں تو اس نے ملکہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اسے ایک خفیہ پیغام

بھجوایا۔ ملکہ خود بھی رومی جنرل سے ملنا چاہتی تھی مگر اس ملاقات کا راز میں رہنا ضروری تھا۔ لہذا اس نے اپنے با اعتماد غلام پولوڈورس کے ساتھ ایک پروگرام بنایا۔ وہ خود ایک قالین پر لیٹ گئی اور غلام نے اس کے گرد قالین لپیٹ کر اسے اس طرح اٹھالیا کہ کسی کو گمان تک نہ ہوا۔ غلام قالین میں لپٹی ہوئی ملکہ کو ایک کشتی کے ذریعے لے کر سکندریہ پہنچ گیا۔ رومی جنرل کے محافظوں کو یہی بتایا گیا کہ وہ پڑوس کی سلطنت کے بادشاہ کا تحفہ لے کر آیا ہے۔ رومی جنرل کے سامنے قالین کھولا گیا تو ملکہ ظاہر ہوئی۔ رومی جنرل اس ملکہ کا محافظ اعلیٰ بن گیا اور اس نے مصر کا تاج و تخت واپس ملکہ کو دلوا دیا۔

(الف) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مصر کی اس مشہور ملکہ اور اس کا محافظ قرار پانے والے کا نام کیا تھا؟

(ب) خود اس ملکہ کی موت کیسے واقع ہوئی؟

قصہ کوئز ۳

۱۶ جولائی ۱۹۶۹ء کو کپ کینڈی (امریکا) سے ایک خلائی جہاز آسمانوں کی طرف روانہ ہوا۔ اس میں ۳ افراد سوار تھے۔ انسانی تاریخ میں پہلی بار انسان کو یہ اعزاز حاصل ہونے والا تھا کہ چاند اس کے قدموں تلے آجائے گا۔ زمین کے مدار سے نکل کر اسٹار لینک نے جہاز کو علیحدہ کر دیا۔ اب جہاز ۴ ہزار ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چاند کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ حیرت انگیز منظر دنیا کے لاکھوں لوگ اپنے ٹیلی ویژن پر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پوری دنیا کے لوگ اس ایک واقعے کو بیک وقت دیکھ رہے تھے۔ اس موقع پر دنیا پہلی مرتبہ "گلوبل ویج" کہلائی۔ ۱۹ جولائی کو یہ خلائی جہاز چاند کے مدار میں داخل ہوا تو ایک قمری گاڑی کے ذریعے خلا باز چاند پر اتر گئے۔ نیل آرم سٹرانگ کا قدم چاند پر لگتے ہی انسان نے کامیابی کا ایک غیر معمولی سفر طے کر لیا۔ نیل آرم سٹرانگ نے چاند پر ایک آواز سنی۔ جسے اس نے بعد میں مصر کے دورے کے دوران پہچان لیا۔

(الف) یہ بتائیے کہ نیل آرم سٹرانگ نے کیا آواز سنی؟

(ب) خلائی جہاز کی رفتار کیا تھی؟

خوبصورت اور معیاری کتب، کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ، ملتان روڈ لاہور 042-35252211
042-35252210

منشورات

انعامات کے لیے تعاون

چمنِ خیال



قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سب کا عالم

شمارہ ستمبر پر ایک نظر

ستمبر کا سرورق نشان حیدر حاصل کرنے والے بہادر
پاکستانی جوانوں سے مزین تھا۔ یوم دفاع کے حوالے سے
خوبصورت منظر کشی کی گئی ہے۔ طیب اعجاز قریشی نے ترکی کے
سفر نامے میں اپنے جو مشاہدات و تاثرات تحریر کیے، وہ بھرپور
معلومات لیے ہوئے تھے۔ ہم عموماً سوئزر لینڈ، امریکا اور
مغربی ممالک کی سیاحت ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ حالانکہ
ہمارے اسلامی ممالک کے خوبصورت مقامات قدرت کا صحیح
معنوں میں شاہکار ہیں۔ پھر ہمارے اسلاف کے زیر استعمال
چیزیں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

عید الاضحیٰ کی مناسبت سے تحریریں بھی زبردست تھیں۔

سید عاصم محمود نے پاکستان کی مقبول ترین شخصیت جنرل
راحیل شریف کی قائدانہ صلاحیتوں کے حوالے سے دلچسپ
تحریر لکھی۔ کہ یہ تو ویسے بھی شہیدوں کا خاندان ہے۔ شاید
شہیدوں کے خاندان کا یہی وہ اعزاز ہے کہ جس نے جنرل
راحیل شریف کو اپنے مقصد سے ادھر ادھر نہیں ہونے دیا۔
ورنہ تو ہماری تاریخ یہی بتاتی ہے کہ جنرل تو موقع کی تلاش میں
ہوتے تھے کہ کب وہ اقتدار سنبھال سکیں۔

جنگ ستمبر کے حوالے سے شامل تحریریں بھی دلچسپ اور
حقائق پر مبنی تھیں۔ جنرل حمید گل کی یادوں کے حوالے سے
فاروق عادل کی تحریر زبردست رہی۔ جہاد جنرل صاحب کے
لہو میں شامل تھا۔ وہ چہرے بدلنے کے بجائے نظام بدلنے
کے حامی تھے۔ جنرل حمید گل انقلابی سوچ کے حامل تھے۔

برصغیر میں ہونے والے جہاد میں ان کے بزرگوں نے حصہ لیا اور وہ خود بھی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ساری زندگی کوشاں رہے۔ جنرل صاحب حقیقی معنوں میں محبت وطن تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ غلام حسین میمن معلوماتی تحریروں کے حوالے سے ایک معروف نام ہے۔ انھوں نے جدوجہد سے بھرپور زندگی گزارنے والوں پر زبردست مضمون تحریر کیا۔ چمن خیال میں صبور احمد خاں نے آن لائن کمپنیوں کے دھوکوں کے حوالے سے لکھا۔ اس بارے میں مضمون ضرور دیں تاکہ بہت سے سادہ لوح لوگ کمپنیوں کے دھوکوں سے محفوظ رہ سکیں۔

طبی ادویہ (طب اسلامی) کی چند ادویہ کا ذکر موجود ہے۔ لیکن وہ غیر مضر ہوتی ہیں، لہذا الکھدینا درست تھا۔

نوٹ:

(رانا محمد شاہد، پورے والا)

طَب و صحت نمبر

پاکستان اسٹیل مل ۲۰۰۷ء تک منافع میں چل رہی تھی۔
مزدوروں کو ہر سال ایک تا دو ماہ کی تنخواہ بونس میں ملتی۔
مزدوروں اور ان کے خاندان کو مفت علاج کی سہولت
حاصل تھی۔ ۲۰۰۸ء میں پی پی پی حکومت نے چارج لے
لیا۔ جلد ہی مل کا زوال شروع ہو گیا۔ اربوں روپے کا لوہا
آدھے داموں فروخت کر دیا گیا۔ چنانچہ مل اربوں
روپے کی قرضہ دار ہو گئی۔ مزدوروں کی تمام سہولتیں بند ہو
گئیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مزدوروں کو چھ ماہ سے
تنخواہ نہیں ملی۔ بچارے قرض لے کر کھا رہے ہیں۔ گھر کا
سامان، عورتوں کے زیور اور گاڑی سب بک گئے۔ فاقوں
کی نوبت آ گئی ہے۔ امید نہیں کہ ۲۰۱۵ء میں مزدوروں کو
تنخواہ ملے۔ مل اونے پونے فروخت ہو رہی ہے۔ یوں
۱۵ ہزار مزدور بے روزگار ہو جائیں گے۔

قاصد بھی ملا لکنت زباں ٹکڑے ٹکڑے کر دیے پیغام کے
اسی طرح راقم کو جو آزادی نمبر ملا، اسی میں صفحات نمبر ۱۸،
۱۹، ۲۲، ۲۳، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۱ (۸ عدد) بالکل کورے کاغذ تھے۔

کیا ایسا صرف میرے پرچے میں ہوا، یا سب کا یہی حال تھا۔
جولائی ۲۰۱۵ء کا شمارہ بہت پسند آیا۔ صحت مند
تصویرات۔ بے حد آگاہی کا حامل تھا۔ کیا ہم زہر کھا رہے
ہیں۔ اس تحریر میں سید عاصم محمود نے ایسی سنسنی خیز معلومات
پہنچائیں کہ ایک درمیانی تعلیم رکھنے والا قاری بھی اس سے
مستفید ہوا۔

اس کی تنخواہ ہے۔ چھ ماہ سے تنخواہ بند ہے۔ میں اس کے گھر کا خرچہ پورا کر رہا ہوں۔ مگر کب تک چلا سکوں گا؟ بہت برے حالات ہیں۔ مل کو سب چور لوٹ کر کھا گئے۔ مل اربوں کی قرضہ دار ہے گیارہ ارب کا لوہا پڑا ہے، کوئی خریدار نہیں۔ یہ بھی آدمی قیمت میں بک جائے گا۔ اللہ رحم کرے۔

صدر ممنون حسین کے بارے میں پڑھا۔ میری عمر اس وقت ۹۷ سال ہے۔ میں جب ۷ سال کا تھا، تو میں نے سنا تھا کہ شہر آگرہ میں شیخ قریشی برادری کے استاد ظفر بنوٹ کے ماہر ہیں۔ بنوٹ لٹھی چلانے کا ایک فن ہے۔ ایک بنوٹی ۲۰ آدمیوں پر بھاری پڑتا ہے۔ استاد ظفر ممنون حسین کے دادا تھے۔ میں جب اسکول پڑھتا تھا، وہ چھ فٹ کا لٹھ لے کر مسجد نماز پڑھنے آیا کرتے۔ ڈاڑھی صاف، مونچھیں چھوٹی، ترکی ٹوپی اور شیردانی ان کا لباس تھا۔ ظفر حسین کے نام سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ استاد اس لیے کہتے کہ آگرہ میں ان کے بہت شاگرد تھے۔ وہ ان سے جوتا بنائی کا فن سیکھتے۔ ہماری ان سے رشتہ داری بھی تھی۔ ان کے بھائی اسلام پہلوان میرے رشتے دار کے خسر تھے۔ میری ان سے ڈھاکہ میں دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔ میں کراچی میں بھی ان سے ملنے جاتا رہتا تھا۔ ان پڑھ مگر نمازی پر ہیزگار آدمی تھے۔ ممنون کے والد حاجی کلو کے نام سے مشہور تھے۔ اطہر حسین کے نام سے انھیں کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ بھی نیک آدمی تھے۔ ممنون حسین کا ایک بھائی، مجو میرا بڑا اچھا دوست تھا۔ وہ جوتوں کا اچھا کاریگر تھا، بہت خوش اخلاق آدمی تھا۔ ممنون حسین صدر ہو گئے، تو آگرہ میں قریشی برادری والوں نے بڑی خوشیاں منائیں۔ آگرہ میں ان کا بہت بڑا خاندان ہے۔ کچھ لوگ گوشت کا کام بھی کرتے ہیں۔ یہ خاندان نیک حلال روزی کماتا تھا۔ ان میں کوئی عیب نہیں تھا۔ آرام باغ کراچی میں ان کا چھوٹا سا گھر تھا۔ میرا اکثر وہاں جانا ہوتا۔ سب بڑی محبت اور اخلاق سے ملتے۔ جوتوں

کا کام ختم ہو گیا، تو کپڑے کی طرف چلے گئے۔ پورے خاندان میں ممنون پڑھ لکھ گئے۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود سب نمازی پر ہیزگار اور حلال رزق کھانے والے تھے۔ بہت ملنسار، خوش اخلاق لوگ ہیں۔

(عبدالصمد قریشی، عبد اللہ آبادی)

☆☆

نجی تعلیمی اداروں کی لوٹ مار

میں اردو ڈائجسٹ کی وساطت سے ارباب اختیار کی توجہ ایک اہم معاشرتی مسئلے کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ ہمارے ملک میں ہر سطح پر معیار تعلیم کا جو حشر ہو چکا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ مہنگے ترین نجی اداروں نے پڑھائی اور تعلیم کو کاروبار کی شکل دے رکھی ہے جسکے باعث بچوں کے ساتھ ساتھ ان کے والدین کو بھی شدید مشکلات اور ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ طرح طرح کے ترقیاتی منصوبوں کی تشہیر کرنے والی اپنی حکومت سے درخواست ہے کہ اس جانب بھی توجہ دی جائے اور اس صورت حال کی بہتری کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں۔ بڑے بڑے نجی اسکولوں میں اچانک بغیر اطلاع فیس بڑھادی جاتی ہے۔ جبکہ والدین کو کتابوں اور یونیفارم کی خریداری بھی مہنگے داموں وہیں سے کرنی پڑتی ہے۔ ان کی اپنی ہی چلائی ہوئی کینٹینوں میں کھانے کی چیزیں انتہائی مہنگی اور ناقص ہوتی ہیں۔ سفید پوش والدین جو اپنے بچوں کو نامور نجی اسکولوں سے تعلیم دلوانے کی خواہش رکھتے ہیں، وہ بے چارے بادل ناخواستہ اسکول والوں کے یہ ناجائز ہتھکنڈے سہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ میری حکومت سے درخواست ہے کہ وہ سرکاری اسکولوں کی طرح نجی اسکولوں کا بھی از سر نو جائزہ لیں اور وہاں بھی کوئی اصول و ضوابط اور قانون نافذ کیے جائیں۔

◆◆◆ (جہانزیب علی، واپڈا ٹاؤن، لاہور)

